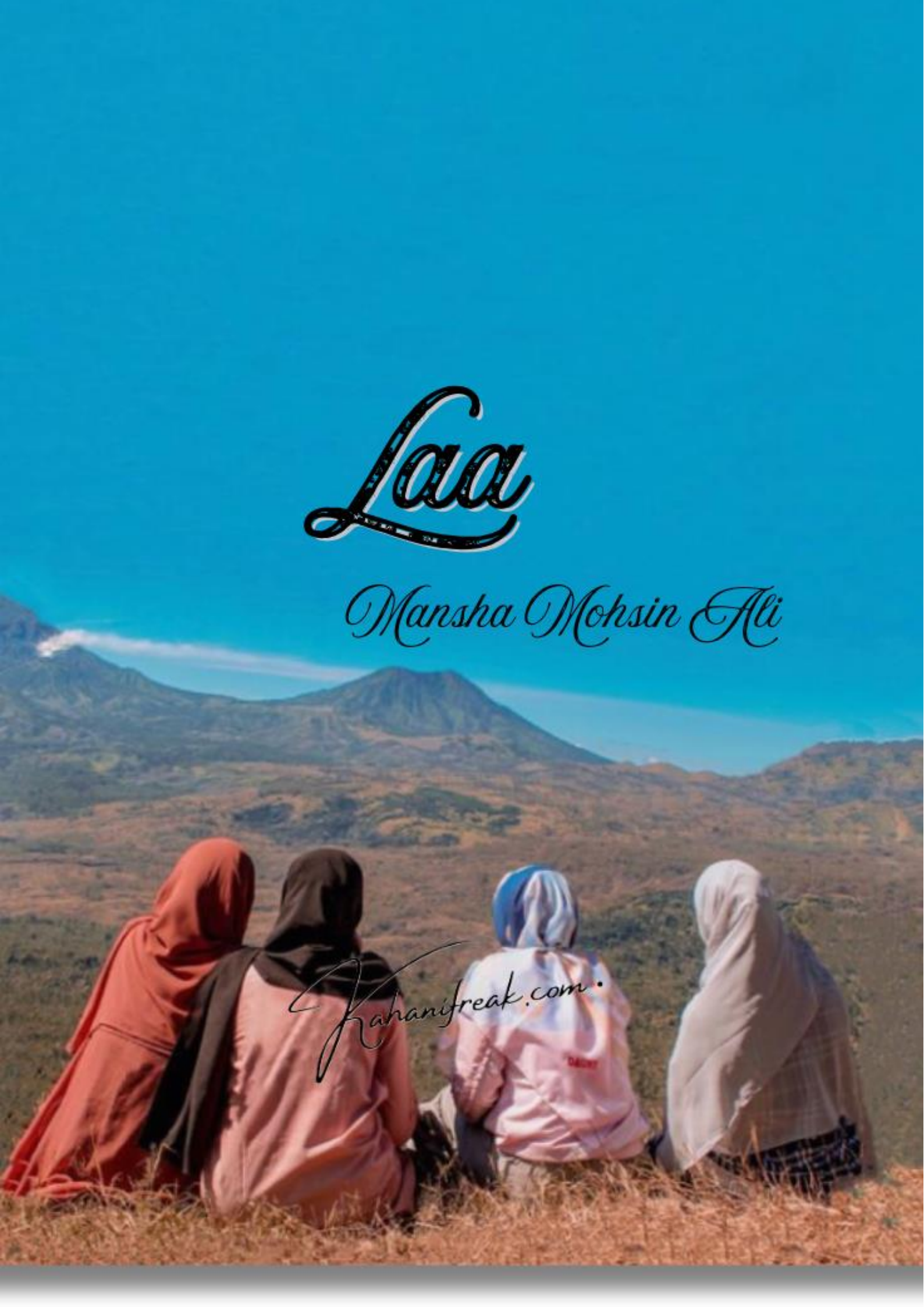
Laa

Mansha Mohsin Ali



یہ ناول منشاء محسن علی کی اجازت سے پبلش کیا جا رہا ہے۔

پبلشر نوٹ:

ہم کوئی بھی ایسا ناول جس میں کسی ایسے فنکار، پراڈکٹ یا کوئی بھی ایسی چیز جو فلسطین کے ساتھ اظہار یک جہتی کے تحت بائیکاٹ پر ہو اس کا ذکر ہو، وہ پبلش نہیں کرتے۔

باب اول

شہر خیال

شہر خیال کی کھڑکیوں سے سر کو آدھا باہر نکال کر کچھ حقیقتیں باہر کی کھوج کے لیے سرگرداں سی نظر آتی ہیں مگر پھر پنجاب یونیورسٹی کے زرعی رقبے میں اگی دھان کی فصل کو آدھی رات سے پورے چاند کی روشنی نے جلا کر خاکستر کر کے رکھ دیا تھا.....!

پریتم ایسی پریت نہ کریو
جیسی کرے کھجور
دھوپ لگے سایہ نہ ہی
بھوک لگے پھل دور
پریت کبیر! ایسی کریو
جیسی کرے کپاس
جیو تو تن کو ڈھانکے
مرو تو، نہ چھوڑے ساتھ
پریت نہ کریو پنچھی جیسی
جل سوکھے اڑ جائے
پریت تو کریو مچھلی جیسی
جل سوکھے مر جائے

http://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.com

پچھلی راتوں کو جب تھل کی ریت سردیوں میں ٹھنڈی ہو کر سو جاتی ہے وہ ننگے پاؤں ٹیلے کی چوٹیوں پر کھڑی ہو کر دور دور تک دیکھتی رہتی ہے کہ وہ اس حالت سے باہر نکلے کہ زندگی ابھی بھی پوری ہے۔

بہت کچھ مکمل ہونے والا رہتا ہے کہ اس کی کہیں نہ کہیں ضرورت سی باقی ہے۔ وہ دم سادھے سارے منظر نامے کو دیکھتی رہی تھی۔ بغیر پلک جھپکے، جیسے کسی مورت میں ڈھل گئی ہو۔

اماں اور بختاور کو رہ رہ کر ہول اٹھ رہے تھے کہ ان چند دنوں میں وہ کیسی پرائی ہو کر آئی تھی جیسے کوئی خانہ بدوش قبیلے کی البیلی نار ہو۔ جس کی آنکھوں میں تھل کے چٹیل میدانوں جیسا خالی پن اور سراب ہوتا تھا کہ آنکھیں پوہ کے موسم میں بھی ساون بھادوں ہو جایا کرتی تھیں جیسے کنیز فاطمہ ہو گئی تھی۔ جو کنیز فاطمہ ہونے کے علاوہ سب کچھ لگ رہی تھی، خانہ بدوش قبیلے کی نار، ڈار سے بچھڑی کونج۔

پوہ کی سرد ترین رات میں جب چاند بادلوں کی اوٹ سے لک چھپ کھیلتا ہوا ریت کے ٹیلوں پر ٹہلتا ہوا نظر آتا تھا تو وہ لک چھپ کر اسے دیکھا کرتا تھا۔

کنیز فاطمہ کو؛ جس کی ذہانت اور وقار کے پورے تھل میں چرچے تھے کہ وہ پہلی لڑکی تھی جو اتنے بڑے شہر سے پڑھ لکھ کر آئی تھی، جس کی موجودگی میں تھل کے سارے تہوار اور خوشی غمی ہوتی تھی کہ وہ ہو گی تو رونق بڑھے گی۔ وہ مہمان خصوصی کی حیثیت رکھنے لگی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ پر وہ بیچوں بیچ بیٹھی رونق محفل ہوا کرتی تھی۔ چائے کی پہلی پیالی اسی کو پیش کی جاتی تھی، بتاشے بھی، کھجوریں بھی۔ بختاور اس کی بلائیں لیتے ہوئے نہیں تھکتی تھی۔

"دیکھا کنیز! تم کتنی ضروری اور لازمی ہو سب کے لیے....."

وہ زہر خند سی ہنسی ہنستی تھی جو بختاور کو ہولا کر رکھ دیتی تھی کہ یہ زہر، یہ جلن، یہ انداز کہاں سے آیا تھا؟

کیونکر؟

کیسے؟

بختاور نے اسے کتراتے دیکھا جیسے وہ تھل واسیوں سے تھک سی گئی ہو، گھن کھاتی ہو کہ وہ اس کے معیار کے برابر نہیں آتے ہوں۔

شمو، فضا اور زرقا بختاور سے کرید کرید کر پوچھتی تھیں۔

''کنیز فاطمہ پرائی ہوئی پھرتی ہے، کیا ہم اس سے نہ ملا کریں؟ ہمیں یوں دیکھتی ہے جیسے ہم کوئی اچھوت ہوں، شہر کی ہوا اتنی ظالم ہوتی ہے۔ بختاور کہ سب ختم کر دے، بچپن کا ساتھ، سہیلی۔ اللہ کرے شہر کو جانے والے سارے گھوڑوں کے سم ٹوٹ جائیں۔''

گھوڑوں کے سم سلامت رہے۔ بس کنیز فاطمہ ٹوٹ گئی تھی۔ سب سمجھتے تھے کہ وہ جڑ کر آئی ہے مگر یہ راز اس کو پتا تھا کہ سب پیوند ہیں جو ذات اور روح کو لگے ہیں۔ کوئی آنکھ رکھتا ہو تو دیکھے کہ اس کی ذات کا ریشم تو کب کا ادھڑ چکا ہے جواب رفو ہونے جوگا بھی نہیں رہا۔

پوہ کی ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی۔ دور بھیڑوں کے باڑے سے ٹیلوں کی آوازیں گونجتی تھیں۔ کھگل درویش درختوں پر کوئی رات کے پکھی کبھی کبھی بول پڑتے تھے اور وہ چونک پڑتی تھی کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے کہ سوز بھی ہے اور ساز بھی، مگر تار سلامت نہیں ہیں۔

کیلکولیٹر کھولے وہ ہندسوں کے حساب کتاب میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ حساب کتاب میں کبھی بھی کچی نہیں رہی تھی مگر اب کی بار دل میں چور آ رہا تھا، کھوٹ رستہ دیکھ رہا تھا کہ گھس کر بیٹھ جائے۔ وہ جھٹک رہی تھی بار بار.....

''چار لاکھ سینتیس.....'' کیلکولیٹر پر ابھرتے ہندسوں نے اس کے وجود کے ٹکڑوں کی شکل اختیار کر لی تھی، وہ رقم بہت زیادہ تھی۔ وہ صرف رقم نہیں تھی۔ موسم کی سردی گرمی، پوہ، ہاڑ کے جگراتے، پسینے میں محبت کی بو، کئی خوابوں کی کرچیاں..... رقم چکا سکتے ہیں۔

ہیرے جیسے بغیر کسی کھوٹ کے جذبوں کو کیسے چکایا جائے؟

ہر فارمولا، کلیہ فیل ہو رہا تھا۔ وہ شبے کا شکار تھی کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی ہونہار اپنے استاد کی لاڈلی طالبہ رہی ہے، یہ کوئی نائٹروجن کا فارمولا نہیں تھا کہ وہ سیدھا سیدھا حل کر کے رکھ دے۔ اور اماں، ابا، بختاور کے سامنے رکھ دے کہ.....

''یہ دیکھیں اماں، ابا، بختاور.....! میں نے آپ سب لوگوں کا سارا قرض برابر کر دیا ہے۔ یہ ایک سال کے پیسے..... یہ دو سالوں کے پیسے، یہ چار سالوں کے اور یہ یہ.....''

رقم پوری ہو جاتی۔ فارمولا صحیح ہو جاتا، مگر جو جواب آنا تھا اسے دنیا کی ہر عدالت رد کر کے رکھ

دیتی، وہ کنیز فاطمہ کے دل کا چور تھا، کھوٹ تھا ورنہ ساری دنیا اندھی، بہری، گونگی ہرگز نہیں تھی۔ یہیں آ کر مات ہو جاتی تھی، تبھی وہ پچھلے بیس دنوں سے کیلکولیٹر لے کر بیٹھ جاتی تھی مگر حساب ہر بار بگڑ جاتا تھا، ہندسے برابر درست ہوتے تھے۔

ہاڑ کی چلچلاتی ہوئی ماس کو ساڑتی ہوئی دھوپ آ جاتی۔

آس پاس پوہ کی کہر آلود ٹھٹھرتی ہوئی راتیں سر پر آن ٹھہرتیں۔ کبھی بختاور کی پیوند لگی اوڑھنیاں، اماں کی لیلن کی کٹی پھٹی چپلیں۔ ابا کی چار سالوں میں کبھی نہ بدلنے والی وہ پگڑی جس کا سفید رنگ اب خاکی رنگ میں بدل چکا تھا۔ بھیڑوں کا وہ ریوڑ اب طاق کی تعداد میں آ چکا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی اس رات کو وہ تھل کے اونچے ریت کے ٹیلے پر ننگے پاؤں ٹہل رہی تھی، دور کہیں سے مستنصر حسین تارڑ کا ٹلہ جوگیاں زندہ ہو جایا کرتا تھا۔ پھر کنیز فاطمہ کسی جوگی کا روپ ڈھال لیتی تھی کہ وہ بس مسافرہ ہے، سفر کرتی رہے گی مگر پھر وہی حساب کا پھیر، وہ دنیادار تھی اور دنیادار کہاں مسافر ہوتے ہیں کہ جوگ لیں اور جوگی کہلوائے جائیں۔ دور دور تک چاند کی روشنی میں ٹھنڈی ریت پھیلی ہوئی تھی اور کھگل درویش درخت اس کے سامنے چلتے ہوئے آ رہے ہیں جیسے ابھی دبوچ لیں گے۔ وہ اگلا سانس لینا بھول جائے گی مگر.....

اماں کی آواز دور کہیں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"کنیز.....! رات ڈھل چکی ہے، کب تک ٹہلتی رہے گی، جانے شہر والوں نے بھی تمہیں کیسی کیسی لت لگا دی ہے، اندر آ جا میری دھی۔"

وہ اندر آگ والے کوٹھے میں آ گئی تھی اور نظر چولہے میں پڑی کیتلی پر پڑی تھی جس میں دودھ ابل رہا تھا اور کیتلی کا ڈھکن بھاپ کے زور سے بختاور کے پیروں پر جا لگا تھا اور وہ درد سے بے حال پیچھے مڑی تھی۔ اماں صدقے پڑھتی چھالے پر مرہم لگانے لگی تھیں اور کنیز فاطمہ بس دیکھے گئی۔ بختاور کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ کنیز کا دل چاہا آگے بڑھ کر اس کے پیروں کو گود میں رکھ لے۔

خود پھونک مار مار کر جلن کم کرنے کی کوشش کرے اور بعد میں مرہم لیپ دے مگر کچھ تھا جو

درمیان میں آ گیا تھا۔ آنسو اندر کہیں جمع ہونے لگے تھے۔

''بختاور! تم ٹھیک ہو ناں؟''

سی سی کرتی بختاور نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ہلکی سی کوشش کی تھی۔

کنیز فاطمہ کا ظرف رائی کے دانے جتنا بھی نہیں رہا تھا۔ وہ چار سالوں والی تھل واسی نہیں رہی تھی، وہ بدل گئی تھی بہت..... یہ بات سب سے پہلے بختاور کے علم میں آئی تھی۔

''کنیز! تم ٹھیک ہو ناں؟''

''ہاں!''

''اتنی چپ چپ کیوں ہو؟''

''بس وہ آگے کی فکر ہے مجھے۔'' وہ جانے کسے مطمئن کرنے کے جتن کر رہی تھی کہ اعتبار آ جائے۔

''اے لو! ابا نے کون سا تم سے نوکری کروانی ہے بھلا۔ آگے سکندر بھائی بھی ماشاء اللہ اتنے سوکھے گھر کے ہیں، بیوی کو عیش میں رکھیں گے۔'' آخر میں بختاور نے ہنس کر اسے چھیڑنے کی کوشش کی تھی اور اگلی کی آنکھیں سپاٹ سی ہو گئی تھیں۔

''پتا ہے، اس بار سکندر بھائی نے مکئی کی فصل بوئی ہے۔''

کاش بختاور کو پتا ہوتا کہ وہ مکئی کی فصل ہی تو کنیز فاطمہ کے دل کا کھوٹ تھا جو ترازو میں ہمیشہ اسے ہلکا کر کے رکھ دیتا تھا۔

''کیا مطلب.....؟ مکئی کی فصل..... مگر کیوں؟''

بختاور نے کنیز کے چہرے کے ہزاروں رنگ دیکھے۔

''تم تو یوں حیران ہو رہی ہو جیسے کہ انہوں نے کوئی بہت بڑا گناہ کر دیا ہو۔'' بختاور کو ہنسی کا دورہ پڑا تھا اور وہ قل قل کرتی ہنسی گئی۔ یہ پڑھے لکھے لوگ بھی آدھے بے وقوف اور آدھے پاگل ضرور ہوتے ہیں۔ بھلا مکئی کی فصل سے کیا ہوتا ہے؟

''گناہ میں نے کیا ہے بختاور..... یہی وہ پوہ کا موسم تھا جب ساون برس برس جاتا تھا اور

سارے بندلا حاصل..... بے فائدہ۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"تم نہیں سمجھو گی بختاور..... اسے کہو مکئی کی فصل پر ہل چلا کر کچھ اور اگا لے، اسے مکئی کی فصل کبھی راس نہیں آئے گی۔"

کنیز فاطمہ کے آس پاس مکئی کے سٹے پھٹنے لگے تھے۔ تھل واسیوں کے ریت کے ٹیلوں نے لاہور کے شیشوں میں بند امپوریم مال کے ایک پاپ کورن کاؤنٹر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مکئی کے دانے ہلکی اور تیز آواز میں اردگرد پھٹنے لگے۔ نمکین، میٹھے اور چاکلیٹ کی اشتہا انگیز خوشبو جس نے کنیز فاطمہ کو پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس خوبرو نیلی آنکھوں والے شخص سے خود کو لڑتا جھگڑتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

"اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے تم، اتنے مہنگے مکئی کے دانے کون بیچتا ہے؟"

"میں بیچتا ہوں۔" کندھے اچکا دیے گئے تھے۔

"بہت مہنگے ہیں۔"

"تو تم مت کھاؤ۔"

"ہمارے گاؤں میں اپنے مکئی کے کھیت ہیں سمجھے۔" وہ اسے لتاڑ رہی تھی۔

"تو تم بھی مکئی کے پاپ کورن بیچا کرو، یہاں کیا کر رہی ہو؟"

کنیز فاطمہ نے اس جیسا بدتمیز انسان زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ دونوں بحث میں الجھے رہے۔ ایک منٹ، پانچ منٹ، دس منٹ اور تیرویں منٹ میں وہ میٹھے پاپ کورن کی کون تھامے شیشوں میں بند اس عمارت میں گھوم رہی تھی مگر وہ نیلی آنکھیں کنیز فاطمہ کا پیچھا کرتی رہی تھیں۔

وہ دونوں اس بات سے بخوبی واقف تھے۔

اور تیسری شخصیت تھی تمکین جمال..... جس نے لمحوں کی واردات کا شکار ہونے والی تھل واسی کنیز فاطمہ اور پاپ کورن بیچتے نیلی آنکھوں والے شخص کا راز پا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

تمکین جمال کو کمروں میں موجود کھڑکیوں کے ہونے سے وحشت ہوئی تھی۔ بس ایک ہی خطا ہوئی تھی کہ اس نے کھڑکی کھول لی تھی۔ سوچا تھا تازہ ہوا سے سب معطر ہو جائے گا مگر دم گھٹنے لگ گیا تھا۔

وہ سامنے کا منظر، وہ گودام کے سامنے ٹرالیوں میں بھری بوریوں کے پھٹے ہوئے کونوں سے گرتے بادیان کے پھول، لونگ کی تلخ خوشبو، الائچی کی مہک نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔

زندگی میں تمکین جمال کو اگر کسی چیز سے نفرت اور وحشت تھی تو وہ یہی چیزیں تھیں۔ بادیان کے پھول، الائچی، لونگ اور جائفل!

یہی زندگی کی ریت ہے وہیں لا کر پٹخ جاتی ہے جہاں سے انسان نے کنارہ کرنا ہوتا ہے۔ کھڑکی کھلنے کے بعد سامنے کا منظر ہنس رہا تھا۔ گھر کے عقبی طرف ہی تو گودام تھا جہاں سامان اترتا تھا اور ارسلان مکرم وہ سامان اپنی نگرانی میں اندر گودام میں رکھوا رہا تھا۔ وہ دلنشیں مرد اس کا شوہر تھا کہ وہ اس کی شریک حیات تھی۔ مگر وہ یہیں آ کر مات کھا گئی تھی کہ وہ اس کاروبار سے وابستہ تھا جس سے وہ.....

اسے اپنی تین دن پہلے کی کیفیت یاد آئی تھی کہ جب اس نے اس گول برآمدوں والے قدیم گھر میں قدم رکھا تھا کہ کہیں یہاں بھی وہ بو اس کا پیچھا کرتے ہوئے نہ چلی آئے۔ وہ دلہن بنی وسوسوں میں گھری ہوئی تھی کہ عطر کی ساری بوتل اس نے خود پر الٹ لی تھی کہ کہیں سارے منظر نامے میں لونگ اور بادیان کی مہک نہ پھیل جائے۔ وہ صدر دروازہ پار کر کے جب گول برآمدے میں کرسی پر بٹھا دی گئی تھی تو عورتیں، بچے، بزرگ سب نئی نویلی دلہن کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

''ارے! دلہن تو چاند کا ٹکڑا نہیں پورا چاند ہی ہے۔'' بلائیں لی جانے لگی تھیں۔

''چشم بد دور، نسیم بہت خوش قسمت ہے کہ اتنی اچھی اور چاند جیسی بہو ملی ہے، سنا ہے بے چاری کو ماں کے بعد باپ نے پالا ہے اور سولہ جماعتیں بھی پاس کروائی ہیں۔ لاہور سے پڑھ کر آئی ہے۔''

وہ چپ چاپ بیٹھی اپنی لمبی ہیل کی نوک کو دیکھتی رہی تھی۔ ہیل کی نوک نے سارا بوجھ اٹھایا تھا پیروں میں بھاری پن اترنے لگا تھا۔

چیچہ وطنی کی فضا میں جیسے تازگی بھر آئی تھی کہ وہ گھر سے دور آ گئی تھی جہاں اس نے زندگی کے

http://kitaabghar.com

پچیس سال گزارے تھے۔ یہ گول برآمدوں، طویل راہداریوں اور اونچی نیچی چھتوں والا قدیم گھر ہی اب اس کی ملکیت تھا جہاں باقی کی زندگی گزارنی تھی۔ وہیں کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھے رکھے وہ اپنے ہونے کو سوچتی رہی۔

''ہم لڑکیوں کی زندگی بھی خالق نے کیسی عجیب رکھی ہے کہ ہمارا بیج کسی اور گھر کی مٹی میں اگتا ہے اور ہماری اٹھان، تنا، شاخیں کسی اور گھر کی زمین میں پرورش پاتی ہیں۔''

برآمدے میں لوگوں کا رش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نندنگہت نے اپنی اتنی خوب صورت اور پڑھی لکھی بھابھی کی وجہ سے فخر سے اپنی گردن اونچی کی ہوئی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اس کے کانوں میں کھسر پھسر کرتی اور کبھی اس کی بندیا یا ٹیکا ٹھیک کرنے لگ جاتی تھی۔

''بھابھی! گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی؟''

''پلیز! ذرا رش کم کروادو۔''

''ارے ہٹو..... ہٹو۔ رستہ صاف کرو، ذرا کوئی تازہ ہوا ہی آنے دو۔ ہماری دلہن بے ہوش کر کے رہو گے تم سب۔''

وہ ہولے سے ہنس دی تھی۔ چوری سے، جیسے محظوظ ہو رہی ہو۔ اور تبھی کوئی بڑی بوڑھی پاس آ کر دلہن کو پیار دینے لگی تھی۔

''ارے! اتنی تیز خوشبو کہاں سے آ رہی ہے کہ سر میں درد ہونے لگا ہے۔''

تمکین کا دل دھڑکا اور رنگ سفید ہوا تھا۔ وہی تو عطر کی شیشی ساری کی ساری خود پر الٹ کر آئی تھی کہ بھید نہ کھلے، سب چھپا رہے مگر.....!

نگہت نے گہری گہری سانسیں لی تھیں۔

''ارے! نانی سچ کہتی ہیں، لگتا ہے کسی بچے نے خوشبو کی شیشی پھوڑ دی ہے۔'' گول برآمدوں میں عطر مہکتا رہا۔ لوگ سر درد کی شکایت کرتے رہے۔

تمکین جمال کرسی کے ہتھے پر ہاتھ جمائے بیٹھی رہی کہ عطر کی شیشیاں کام کر گئی ہیں۔ اب کوئی

بھی وہ راز، بھید نہ پکڑ پائے گا۔

وہ جو پچھلے پچیس سالوں سے اک اذیت میں رہی تھی کہ اس گھر کی زمین میں جو اس کا بیج لگا ہوا ہے اسے کچھ مدت درکار ہے پھر اس کے بعد کسی اور گھر کی مٹی میں شاخیں اور پھل نکالے گی۔

ہر الہڑ دوشیزہ یہی خواب آنکھوں میں بھر کر مدتیں گزار دیتی ہے کہ چلو اب نہیں تو پھر آگے سہی۔ اگلے گھر سہی!

جب گول برآمدوں والے گھر کی منڈیروں سے شام جھانکنا شروع ہوئی تو اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا جو گلاب، موتیے اور گیندے کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ اندر تک کھل کر رہ گئی تھی کہ یہاں کوئی اور مہک اس کا پیچھا نہیں کرے گی۔ سب کچھ تو پیچھے چھوٹ گیا ہے۔

نگہت نے دودھ اور کھانا کمرے میں رکھ دیا تھا۔

''بھیا ابھی آنے والے ہیں۔ آپ دونوں مل کر کھانا کھا لیجیے گا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔''

ہدایات نامے کے بعد وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

تمکین نے سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ بہت کھلا وسیع کمرہ تھا جو سادگی سے آراستہ تھا۔ کمرے کی دیواریں کریم کلر سے رنگی گئی تھیں۔ کچھ کانچ کے گل دان اور چند پینٹنگز بھی آویزاں تھیں جو کہ کمرے کے حسن کو مزید کشش دے رہی تھیں۔ وہ ہولے سے اٹھ کر سنگھار میز تک آ گئی تھی۔ وہ شیشے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

سرخ رنگ کے آتشیں لہنگے میں ملبوس وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کی لمبی مڑی ہوئی پلکوں کی جادوگری آج مکمل عروج پر تھی۔ وہ چند ثانیے اپنے روپ سروپ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی پھر بے ساختہ ہنس دی تھی۔ چوری سے.....

اجنبی جگہ تھی، الگ گھر کی مٹی تھی، کچھ یاد آ گیا تھا۔

''تمکین جمال! ہم لوگ اپنے چہروں پر چاہے کتنا ہی میک اپ پوت لیں، تمہارا مقابلہ کبھی بھی نہیں کر سکتی ہیں کیونکہ صرف تمہاری مڑی ہوئی گھنی پلکوں کا کاجل ہی ہماری ساری تیاری کو زیرو کر دیتا ہے۔''

http://kitaabghar.com

وہ کنیز فاطمہ کی کہی گئی بات تھی جو اسے اپنی شادی کے دن یاد آئی تھی۔ وہ ایسے ہی تو تمکین جمال فرام چیچہ وطنی کی دیوانی نہیں ہوئی پھرتی تھی۔ دوست بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں ناں، زندگی کی ہر ساعت ہر لمحے میں سے چوری سے، اس کی مسکراہٹ کی طرح حصہ نکال ہی لیتے ہیں.....!

باہر کھٹکا ہوا تھا تو وہ دوبارہ بیڈ پر سنجیدگی اور گھونگٹ دونوں اوڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قریب آ گیا تھا۔ تمکین کا دل لرز لرز جاتا تھا۔ گھونگٹ کے پار وہ سامنے تھا۔ کشادہ پیشانی پر بکھرے بال، ستواں ناک اور سفید رنگ.....مونچھوں کا کٹاؤ۔

عجیب سحر انگیز لمحہ تھا جس نے اپنا جوبن طاری کر کے دونوں میاں بیوی کو بے بس کر دیا تھا۔

ارسلان مکرم نے ان لرزتی ہوئی پلکوں اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کو حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ انتہائی حسین تھی دیکھ کر دل ہاتھ سے جاتا ہوا نظر آتا تھا۔

''تم بہت خوب صورت ہو تمکین ارسلان!''

گھر کی مٹی میں تمکین کے وجود کا درخت لگ گیا تھا۔

''میں نے تصویریں دیکھی تھیں مجھے یقین نہیں آیا تھا مگر تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تصویریں جھوٹ کہتی ہیں۔''

آنکھ کے چھپر سوالیہ نظروں کے ساتھ اٹھے۔

''تم اپنی تصویروں سے بڑھ کر دلنشین ہو۔''

وہ شرمائی لجائی ہوئی سی بیٹھی رہی تھی۔ دل کی رفتار اور آواز ریل کو بھی مات دے رہی تھی۔ سامنے بیٹھا شخص بھی تو تصویروں سے بڑھ کر متاثر کن تھا۔ دل کے سارے وسوسے اور خوف کہیں اندھے کنویں میں جا گرے۔

''مجھے بہت خوشی ہے کہ تم میری زندگی میں شامل ہوئی ہو۔ ہمارا خاندان کافی بڑا ہے اسی حساب سے ضرورتیں بھی ہیں، ذمہ داریاں بھی ہیں جو تمہیں نبھانی ہوں گی بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ ذمہ داری اور خود میں اگر کبھی چننا پڑے تو خود کو مت چننا۔ تمہیں میں نے چن لیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ

http://kitaabghar.com

میری بیوی بھی میری طرح ذمہ دار ہو۔ مجھے تم پر مکمل یقین ہے۔ تمہاری سمجھ بوجھ کی ویسے بھی مثالیں دی جاتی ہیں۔ سولہ جماعتیں پاس ہو۔ عقل و شعور میں بھی آگے ہوگی۔ میں تو آنے والے دنوں میں خود کو تم سے مشورے لیتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔"

وہ پھر سے ہنسی تھی۔ اختیار کے ساتھ۔

وہ کھانا کھانے لگے اور ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں بھی جاری رہیں اسی عرصے میں تمکین جمال کو لگا جیسے وہ اس گھر، دریچوں سے صدیوں سے واقف ہو۔ نکاح کے رشتے یونہی انسان کے دل اور وسوسوں کو سکون عطا کرتے ہیں۔

"تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں تمہیں کیسا لگا؟" دودھ کا گلاس تھامے ارسلان کو اچانک سوال سوجھا تھا۔

وہ نوالہ تھامے جواب سوچتی رہی کہ کیا کہے؟

"میں نے جیسا سوچا تھا ویسے نہیں لگے، مگر آپ بہت اچھے ہیں۔"

وہ دودھ کا خالی گلاس لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔ دل کیا پوچھ لے کہ اس نے کیا سوچا تھا؟ کیا تصویر بنائی ہوگی؟ مگر وہ رک گیا تھا۔

کچھ لوگوں کی فطرت میں کرید اور تجسس کا عنصر نہیں ہوتا، ارسلان مکرم میں بھی نہیں تھا۔

رات قدیم راہداریوں میں ٹہلنے آن نکلی تھی تو وہیں تمکین کا خوف وجود بھی اس گھر کی مٹی میں اگ آیا تھا۔ دور پار سے یوں لگا یہیں آس پاس کہیں بادیان کے پھول اگ آئے ہوں۔ جائفل اور جاوتری نے شاخیں نکال لی ہوں اور اس کی سانسیں الائچی سے بھری ہوئی ہوں۔ وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ ارسلان باہر کچھ لینے گیا تھا، وہ تھرا گئی تھی۔

"آج نہیں، اے کاش! اب نہیں۔" اسے لگا وہ انواع واقسام کے مسالوں کی خوشبو میں لتھڑ گئی ہو۔

وہ واپس آیا تھا تو وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی، کپکپاتے ہوئے.....

"تم ٹھیک تو ہو ناں؟" فکرمندی سے گرم پیشانی پر ٹھنڈے ہاتھ کا لمس آ ٹھہرا تھا۔

''سر درد کر رہا ہے میرا۔'' روشن دان کی اوٹ سے چاند اور تارے دیکھتے رہے، ارسلان مکرم نے اپنی دلہن کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر ہولے ہولے دبایا تھا اور پھر سب پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ پر سکون، پر لطف.....

زندگی کی خوب صورتی کا جیسے ہی یقین آنے لگتا ہے کہیں سے، کسی درز سے کوئی بدصورتی جھانکنے لگ جاتی ہے کہ آپ کا سکون اجاڑ کر رکھ دے۔

اگلے دن ابا اسے گھر لے آئے تھے۔ وہ بھاگ بھاگ کر ابا کو بازار سے چیزوں کا ڈھیر لے کر آتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

''ابا! بس کر دیں اور کتنا کھلائیں گے؟''

''ارے، تمہیں کیا پتا، پہلے کی بات اور تھی اب کی بات اور ہے۔ تمہاری ماں ہوتی تو ساری چیزوں کا خیال رکھتی، مگر جتنا میں کر سکتا ہوں، اتنا تو مجھے کرنے دو بیٹا!''

پھل، ٹکیاں، مٹھائیاں، خلیفہ کی نان خطائیوں کے ڈبے..... جو جو چیز اسے ان پچیس سالوں میں پسند رہی تھی اور ابا کو یاد بھی رہی تھی تو وہ ساری چیزیں اس کے سامنے تھیں۔

''تمہارے جانے کے بعد دل بہت اداس رہا۔ میں نے تمہیں بہت یاد کیا کہ ہم دونوں باپ بیٹی ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ مگر پھر یہ سوچ کر دل خوش ہوا کہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوا ہوں۔ تمہاری پرورش سے لے کر تمہاری شادی کے فرض تک میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی میری بچی مگر پھر بھی اگر کوئی بات ہو تو مجھے معاف کر دینا میری بچی۔''

ابا بار بار ہاتھ جوڑ لیتے تھے جو وہ چوم کر آنکھوں سے لگا لیتی تھی۔

''سنو..... سچ سچ بتانا.....'' وہ انگور توڑ توڑ کر کھا رہی تھی جب ابا نے اچانک اسے مخاطب کیا تھا۔ ''تمہارا شوہر تمہارے ساتھ ٹھیک تو ہے ناں؟''

وہ لرزتا ہوا لہجہ، وہ ارتعاش بھری سانس۔

وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں راز پا گئی تھی۔

اماں نہیں تھیں مگر ابا نے سارے فرض پورے کرنے تھے۔ وہ فرائض میں کبھی بھی کوتاہی نہیں کیا

http://kitaabghar.com

کرتے تھے۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کے ہاتھوں کو تھامے تسلی کے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی جو کہ مطمئن کر سکیں، جو مرہم ہوں کہ اس بوڑھے شخص کو اعتبار آجائے جو اپنی ساری زندگی کی جمع پونجی کسی کے حوالے کر چکا ہوا ہے۔

''ابا! میں بہت خوش ہوں اور مطمئن بھی کہ آپ نے جو گھر اور جو آدمی میرے لیے چنا ہے وہ میرے دل کے لیے خوشی کا باعث ہیں آپ کو فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، میں خوش ہوں۔ وہ گول برآمدوں والا طویل گھر مجھے اپنا اپنا لگتا ہے۔ یہاں مجھے اکیلے رہنے کی عادت تھی مگر وہاں کافی لوگ رہتے ہیں تو مجھے شکایت نہیں، انسان رشتوں کے ساتھ ہی ہنستا بستا اچھا لگتا ہے۔''

جمال دین کے دل کو قرار آ گیا تھا اور باقی وسوسے ارسلان مکرم نے ختم کر دیے تھے۔

کھلے باورچی خانے میں وہ اپنے شوہر اور ابا کے لیے چائے پکاتے ہوئے اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ سب کچھ کتنا تیز رفتار ہے۔ سب کچھ پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔ یہی تین کمروں کا چھوٹا سا گھر جس کے آنگن میں وہ بینگن اور گاجروں کی کیاریاں بنایا کرتی تھی اور لکڑی کی سیڑھی پر بیٹھ کر ریڈیو پاکستان سنتے ہوئے، رسالے پڑھتے ہوئے وقت گزارا کرتی تھی۔ تب زندگی کا الگ رنگ تھا اور اب سب کچھ جیسے کسی جادو کی چھڑی سے بدل کر رہ گیا تھا۔

وہ سات سال کی تھی جب اماں کینسر کے موذی مرض میں چل بسیں اور گھر میں پھپھی لوگوں کی عدالتیں لگنا شروع ہوئی تھیں۔

''جمال دین! لڑکی ذات کے سہارے کیسے زندگی گزر سکے گی۔ اب دوسری شادی کر لو۔''

اور ابا کا ان پچیس سالوں میں جواب کبھی بھی مثبت نہیں آیا تھا۔

''نہیں آپا.....! تمکین ہی تو میرا سہارا ہے۔''

پھپھی سختی بھری آنکھوں سے اسے دیکھا کرتی تھیں اور وہ سہم جایا کرتی تھی۔

''عمر میں بے شک ہم سے بڑے ہو جمال دین! مگر یوں ہٹ اور ضد کی روش چھوڑو، آگے اتنی عمر پڑی ہے آخر کب تک اور کہاں تک گزارو گے بھلا۔ لڑکی ذات پلے میں ہے جو اگلے گھر کی ہو جائے

گی پھر سے یہ ویہڑا سنسان اور اکیلا لے کر بیٹھ جاؤ گے، انسان کے ساتھ سو قسم کی بیماریاں اور ضرورتیں ہوتی ہیں۔"

ابا جمال ان پچیس سالوں میں ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔ پھپھی لوگ جھک مار مار کر اپنے کرائے بھر بھر کر سفر کر کے آتیں اور بے مراد لوٹ جاتی تھیں کہ ان کے بھائی کا دماغ چل چلا گیا ہے کیونکہ جیسے ان کے منہ بس ایک ہی جملہ چڑھ گیا تھا۔

"بس آپا! کیا کروں، دل نہیں مانتا۔"

آخری بار تو نجمہ پھپھی اکلوتے بڑے بھائی کے اس جملے سے سخت کبیدہ خاطر ہوئیں کہ جس موڑھے پر بیٹھی تھیں، اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

"دل کی ایسی کی تیسی۔"

کہا تھا ناں وقت کو چابی لگی ہے، رفتار پکڑ لیا کرتا ہے، بھاگ جاتا ہے اور انسانوں کو لمحوں کے اشراپ دے جاتا ہے۔ تمکین جمال نے زندگی میں اگر کسی شخص سے محبت کی تھی تو ابا جمال دین سے کی تھی۔

وہ مسالوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اس تین کمروں کے گھر سے کبھی بھی لونگ، بادیان، الائچی اور جاوتری کی خوشبو نہ گئی تھی۔ وہ دونوں باپ بیٹی مل کر مسالے صاف کرتے رہتے اور سل بٹے پر پسائی کرتے رہتے تھے۔ تمکین کا بچپن، لڑکپن انہی مسالوں کو پیستے ہوئے گزرا تھا۔

سہیلیاں بنانے کا فن اتنا آسان نہیں تھا کہ وہ ماہر ہو جاتی اور ڈھیروں سہیلیاں بنا کر کلی، شٹاپو کھیلتی۔ اسے بس ایک ہی کام آتا تھا دروازے میں کھڑے ہو کر باہر آتے جاتے ہوئے کو ٹکٹکی باندھ کر تکے جانا اور بس..... یہی زندگی تھی۔

پھپھی نجمہ موڑھا توڑنے کے بعد کئی ماہ بعد آئیں تو جمال کی منت لجاجت کے بعد تمکین کو قریبی اسکول میں داخل کروا گئی تھیں۔ وہ ابا کے ساتھ اسکول جانے لگی تھی۔ دن کو اسکول سے واپسی کے بعد مسالے پیسنے کے بعد وہ رات کو پہاڑے پڑھتی تھی، فر فر انگریزی کی نظموں کو دہرایا کرتی تھی اور جمال دین اسے دیکھے جاتا۔

''تمکو! تم ایسے فرفر انگریزی کیسے پڑھ لیتی ہو بھلا؟''

''ابا! اتنی تو آسان ہے۔''

''لوگ تو کہتے ہیں بہت مشکل ہوتی ہے۔''

''لوگ سارے سچ تھوڑی بولتے ہیں بھلا۔ آپ ہر بات کا یقین مت کیا کریں۔''

پنسل تراش سے پنسل گھڑتی وہ جمال دین کو بہت سنجیدہ سی لگا کرتی تھی۔ اسکول جانے کے بعد اس میں ایک واضح تبدیلی جو آئی تھی وہ یہ تھی کہ جو کام صرف مائیں سکھا سکتی ہیں وہ اپنے اردگرد کی لڑکیوں استانیوں سے دیکھ دیکھ کر سیکھ جاتی تھی۔ جمال دین ایک مرد تھا، کہاں تک سمجھ سکتا تھا۔

وہ ننگے سر نہیں رہتی تھی۔ سر ڈھانپے رہتی تھی۔ صفائی کا خاص خیال رکھتی تھی۔ جھاڑو اٹھا کر گرد کے طوفان ختم کرتی۔ پھر ایک دن تمکین جمال نے ہوم اکنامکس پڑھنے کے بعد تجرباتی کام شروع کر دیے تھے۔

چھٹی کلاس میں پہلا کام اس نے انڈا ابالنے اور چائے بنانے کا سیکھا تھا۔

وہ برستی ہوئی بارش کا دن تھا جب جمال دین مسالوں کی کھیپ پہنچا کر واپس آیا تھا اور وہ ماں کے جہیز کے چینی والے برتنوں میں ایک کپ چائے، دو انڈوں، چٹکی بھر کالی مرچ کے ساتھ اس کی منتظر تھی۔

تاریخ گواہ ہے وہ جمال دین کی زندگی کی سب سے بہترین چائے اور اچھا ابلا ہوا انڈا تھا۔

''ابا! کیسا لگا؟'' وہ کب سے دل میں اٹھتے ہوئے سوال کو دبا کر بیٹھی کہ وہ چائے پی لیں تو وہ سوال کرے۔ چہرے پر تجسس، مڑی ہوئی پلکوں والی گھور آنکھوں میں جواب کی بے چینی۔

وہ وہیں دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے بیٹھے بیٹھے رونے لگے۔

''ابا! کیا ہوا؟'' وہ بوکھلا گئی تھی۔

باہر بارش تھی اور اندر آنسو۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے اس کا ماتھا بار بار چومتے رہے۔

''میں نے ہزار بار نجمہ سے کہا ہے کہ میرا دل نہیں مانتا، میرا دل سچ میں نہیں مانتا تھا جب میرے پاس میری تمکو ہے تو مجھے کاہے کسی اور کی ضرورت رہے گی بھلا۔''

وہ فخر سے سر اٹھا کر بیٹھی تھی کہ وہ چائے کا کپ اور دو انڈوں کی خوشی نہیں تھی، وہ ابا کے سرخرو ہونے کی خوشی تھی۔

''چلو، اب بتاؤ تمہیں کیا چاہیے؟''

وہ سوچتی رہی کہ کیا مانگے؟ کس چیز کی فرمائش کرے؟

''دو دن بعد بتاؤں گی ابا۔''

دو دن بعد وہ شام کو سیڑھی پر چڑھی بیٹھی تھی اور ابا مسالے پیس رہے تھے تو اس نے اعلان کیا تھا۔

''آپ مجھے سولہ جماعتیں پاس کروا دینا بس۔''

سل بٹے پر پستا سوکھا دھنیا وہیں پڑا رہ گیا۔ انہیں توقع تھی کوئی کیچر، چوڑی، گڑیا، بستے کی فرمائش آئے گی مگر وہ لڑکی تو پڑھائی کی دیوانی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں سولہ جماعتیں پڑھاؤں گا۔''

وہ معاہدہ ہو گیا تھا۔ وہ دونوں کو یاد بھی تھا۔ پانچویں، چھٹی، مڈل کے بعد میٹرک میں بھی وہ پوزیشن لے کر آگے بڑھتی گئی تھی۔

میٹرک میں جب تمکین جمال نے گورنمنٹ ماڈل ہائی اسکول میں قدم رکھا تھا تو اسے یہ ادراک ہوا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی سہیلیاں نہ بنا سکے گی شاید۔

''تمکین! تم لوگوں کی کیا گرم مسالوں کی فیکٹری ہے؟''

''کیوں؟''

''تم سے ہمیشہ مسالوں کی بو آتی ہے۔ کیا تم مسالے پیستی رہتی ہو؟''

وہ سب سے پیچھے بیٹھنے لگی۔ سب سے پیچھے جہاں بادیان کے پھول خاموش رہیں، جہاں جائفل کو چپ لگی رہے اور لونگ بھی سوئے رہیں مگر کب تک۔

مس شمیم نے اسے دھر لیا تھا۔

''تمکین جمال! آپ کلاس کی ذہین ترین لڑکی ہیں، میں آپ کو آج کے بعد فرنٹ ڈیسک پر ہی بیٹھا ہوا دیکھوں۔''

http://kitaabghar.com

وہ کئی کئی دن چپ رہی۔ ریڈیو پاکستان چلتا رہتا، بینگن کے پھول گرتے رہے۔ جمال دین کو اس کی چپ سے خوف آیا تھا۔

''تمکو! تم ٹھیک تو ہوناں؟''

''ابا! آپ کوئی اور کام نہیں کر سکتے کیا؟''

وہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

کئی پردے حائل ہو گئے تھے۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''کچھ نہیں، آپ نہیں سمجھیں گے۔''

دن گزرتے رہے۔ وہ روز موسموں کی پروا کیے بغیر نہا دھو کر خود کو مل مل کر اسکول جاتی رہی کہ سب خاموش رہیں مگر جمال دین کے کام میں کھوٹ نہیں تھا۔ چیچہ وطنی میں جمال دین کے مسالوں کی مثالیں دی جاتی تھیں تو وہ کیسے اب کھوٹ ہو جاتے۔

مس شمیم نے ایک دن ریاضی کے پیریڈ میں شاید لونگ کی بو پالی تھی۔

''یہ کلاس ہے یا کسی نائی کی دکان، سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے میرا۔ ویسے بھی خوشبو سے میرا جی الٹتا ہے۔''

ساری کلاس کی نظریں تمکین جمال کے وجود میں چھید کرنے لگیں۔ وہ سفید رنگ کے ساتھ بیٹھی رہی مگر کہا تھا ناں جیسے ہی زندگی کی خوب صورتی کا ادراک ہونے لگتا ہے اسی وقت بدصورتی کسی کونے، کسی درز سے جھانک لیتی ہے۔

تمکین جمال پھر سے پیچھے چلی گئی تھی جہاں اس کے باپ کے کاروبار کا شور تھم سکے۔ جہاں کوئی سوال نہ ہو۔

گھر والے برے نہیں ہوتے، زمانہ اور لوگ کبھی کبھی ہوتے ہیں اور تربیت صرف گھر نہیں کرتا، یہ زمانہ نامی اسکول بھی کرتا ہے پھر آپ ہمیشہ اچھے نہیں رہتے۔ آپ خیر برے بھی نہیں رہتے مگر.....!

http://kitaabghar.com

پچیس سالوں کی اذیت تمکین جمال کے سامنے پھر سے زندہ ہوگئی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں کی بحث کرتی رہتی تھی کنیز فاطمہ سے کہ وہ آئیڈیلزم کا شکار ہے، وہ اپنی زندگی میں کچھ نیا شامل کرے گی، جہاں کوئی شرمندگی نہ ہو۔ کچھ بھی.....

اسے یاد آیا تھا جب وہ اور کنیز فاطمہ ہاسٹل روڈ کے پاس پنجاب یونیورسٹی کی دھان کی فصل کے سٹے ہتھیلیوں سے مسلتے ہوئے آئیڈیلزم اور آگے کی زندگی پر بحث کر رہی تھیں تو اس نے کتنا ہنس کر کنیز فاطمہ سے ایک بات کہی تھی۔

''میں اب پہلے والی تمکین جمال نہیں رہی۔ میں اپنی آگے کی زندگی میں کوئی شہزادہ ہی ڈھونڈوں گی جو پھولوں اور خوشبوؤں کا کاروبار کرتا ہوگا۔ چاہے گلاب بیچتا ہو یا چاہے اس کے موتیے کے کھیت ہوں۔'' وہیں وقت نے یہ لمحہ ہنس کر دیکھا تھا۔

آج کھڑکی کھلی تھی تو تمکین جمال کو سب یاد آیا تھا۔

وہ پہلی والی تمکین جمال واقعی نہیں رہی تھی۔ وہ ارسلان مکرم نامی شہزادے کو ڈھونڈ چکی تھی مگر وہ گلاب نہیں بیچتا تھا۔

ہائے افسوس کہ وہ موتیے کے کھیتوں کا مالک بھی نہیں تھا۔

وہ تو بس بادیان کے پھول اور لونگ کا بیوپاری تھا۔

وہ شدت سے روتے ہوئے کنیز فاطمہ سے بات کر رہی تھی جو اپنے تھل کی ریت پر ننگے پاؤں ٹہل رہی تھی۔

''کنیز فاطمہ! ہم نے خواب بنے تھے مگر وہ دھاگے کچے تھے، سب کچھ ادھڑ گیا ہے۔ سینے کے ہنر میں ہم دونوں اناڑی ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ میرا سانس بند ہو رہا ہے۔ کاش ہم دونوں بھی سیرت امتیاز کی طرح سب چھوڑ چھاڑ کر دل کے مرض کا سہارا لے کر کسی اور طرف نکل جاتے۔''

کھڑکی کھلی ہے مگر ہوائیں بند ہو چکی ہیں۔

بس کبھی کبھی دور سے سیرت امتیاز کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ اور سیرت امتیاز بھی تو.....!

☆.....☆.....☆

سیرت امتیاز نے کسی شہزادی کی طرح راستوں میں کھجور کی گٹھلیاں نشانیوں کی صورت میں چھوڑی ہیں کہ شہزادے سراغ پائیں اور وہ دوڑے چلے آئیں۔ وہ اس کوشش میں بھی کامیاب رہی مگر.....

یہیں آ کر سب ختم ہو جایا کرتا ہے کہ جہاں انسان ضروری ہو اسی بازار اسی خریدار کے ہاتھوں بکے۔ ورنہ کچھ ہم ایسے خاص لوگ ٹکے کے بھاؤ بک جاتے ہیں۔ یہی تمام عمر کے افسوس ہیں جو کہ لاحاصل ہیں۔

پوپلی بوا نے اس بھورے بالوں والے لڑکے کو اچنبھے سے دیکھا تھا جو شاید انہی کی طرح کا کوئی خبطی تھا جو دسمبر کی خنک، ٹھٹھرتی ہوئی شام میں جو اداسی کے سارے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی، آ گیا تھا۔

''آئے ہائے.....! کس کا پتا پوچھتے ہو میاں؟''

اپنے کوٹ کی فر سے جیسے برف کے گالے جھٹکتا ہوا، سرخ ناک کی سوں سوں پر جھنجھلاتا ہوا وہ جیسے برف کا آدمی بن گیا تھا۔

''میں سرخاب خان ہوں۔''

پوپلی بوا کے اپنے دانت اتنی ٹھنڈ میں بج رہے تھے کہ وہ ہنسی کا موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتی تھیں۔

''اے لو انسان بھی نرالے ہیں آج کے میاں، پرندوں کے ناموں پر بھی قبضے کیے جاتے ہیں۔'' وہ ہاتھوں میں چکوترے لیے کھڑی تھیں اور راستے میں ہی ٹھنڈ میں وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

سرخاب خان کو وہ گلیاں بہت اپنی اپنی سی لگی تھیں جیسے ہر دریچے سے، ہر چلمن سے، ہر اوٹ سے کوئی اسے دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستا جاتا ہو کہ اس کی بات پوری ہو گئی تھی اور شرط آدھی رہ گئی تھی۔ وہ کھنکتا ہوا قہقہہ وہ چوڑیوں کی چھن چھن، وہ اٹھا ہوا سر۔

''تم جان لو کہ تم ڈھونڈتے ہوئے میری خبر لینے کے لیے ضرور اس گلی میں قدم رکھو گے مگر.....''

''مگر کیا.....؟'' وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ہمیشہ بات بھی کرتا تھا کہ وہ سانس تھی وہ لینے کو مجبور۔

''جس شام میری گلی میں قدم رکھو گے ناں، تمہارے سارے حوصلے ریت ہو جائیں گے، تمہیں لگے گا ہر کوئی تمہیں دیکھ رہا ہے، تمہیں پزل کر رہا ہے کہ سرخاب خان کو کوئی کیسے اپنی جگہ سے ہلا سکتا ہے۔ تو سنو! اگر سیرت امتیاز کو تم اپنی جگہ سے کھسکا سکتے ہو تو پھر اس اکیسویں صدی میں کچھ بھی ہو سکتا ہے..... کچھ بھی..... محبت بھی.....''

وہ بھوری آنکھوں والا پٹھان بے بس ہونے لگتا تھا۔

وہ لڑکی آکٹوپس تھی، ایسا جکڑتی تھی کہ سارے باندھے ہوئے بند بے کار ہوئے جاتے تھے۔

''کسی دن تم زندگی کے ہاتھوں بہت بڑا زک اٹھاؤ گی سیرت امتیاز۔'' پنجاب یونیورسٹی میں کیفے والے روڈ پر چہل قدمی کرتے ہوئے وہ اسے باور کرا رہا تھا۔

''زندگی کے ہاتھوں یا تمہارے ہاتھوں؟'' سرمئی سڑک بہت طویل تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کی سڑکیں کبھی ختم نہیں ہوتی تھیں بس کبھی کبھی گفتگو اور سوال جواب کا اختتام ہو جایا کرتا تھا۔

''جو سمجھ لو۔'' وہ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیدھا دیکھ رہا تھا۔

اور سیرت امتیاز اس بھورے بالوں والے شخص کے علاوہ اور کچھ بھلا دیکھ سکتی تھی؟

نہیں کبھی بھی نہیں جب تک اندھی نہ ہو جائے۔

''بزدل انسان! زندگی کو الزام مت دو۔ صاف صاف کہو کہ تم نے کوئی صدمہ دینا ہے مجھے۔''

وہ واپس پلٹ گئی تھی بغیر کچھ کہے اس جملے کے سوا۔ سرخاب خان نے اپنے قدم نہیں روکے، وہ بس چلتا رہا تھا۔ یونیورسٹی کی سڑکوں کے کردار جن کے درخت خزاں کی لپیٹ میں تھے۔ وہ بس مڑ مڑ کر دیکھتی رہی تھی کہ شاید وہ پلٹے گا مگر.....

آج وہ پلٹ آیا تھا ان تنگ گلیوں میں جو جدت اور قدامت کا حسین امتزاج تھیں کہ جہاں وہ بلند قہقہے لگانے والی لڑکی رہائش پذیر تھی۔ اس کے قہقہے اور ہنسی کی بے ساختہ کھنک پر لوگ مڑ مڑ کر، پلٹ پلٹ کر دیکھا کرتے تھے۔

آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں جہاں مٹی کے برتن، گھروندے بنانے کی ورکشاپ تھی، وہ وہاں

دوستوں کے گروپ کے ساتھ کھڑا تھا، جب یوں لگا تھا کوئی یونیورسٹی کے کوریڈور میں ونڈ چائمز لگا کر رفو چکر ہو گیا ہو اور وہ آوازیں انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی تگ و دو میں ہوں۔ سرخاب خان اچانک مڑا تھا اور ونڈ چائمز کے لیے ہوائیں گمشدہ ہو گئیں۔ وہ ہلکے سے اس لڑکی سے ٹکرایا تھا جس کی ہتھیلی پر مٹی کی ایک چھوٹی سی خوب صورت صراحی تھی جو شاید وہ ورک شاپ سے بنا کر خوش ہوتی ہوئی ابھی باہر آ رہی تھی، سرخاب کی ٹکر سے وہ کوریڈور کے فرش پر گر کر دوبارہ مٹی کے لوتھڑے کی شکل میں ڈھے گئی تھی۔

وہ ہنسی تھم گئی تھی، وقت بھی.....

اور سیرت امتیاز بھی وہیں لمحوں نے زنجیر میں باندھ لی تھی۔

سرخاب کو لگا وہ ابھی طیش میں آ جائے گی، چیخے گی چلائے گی جیسے لڑکیاں عموماً کرتی ہیں۔ وہ بس خاموش ہو گئی تھی، تھوڑا سا جھکی، مٹی کا وہ لوتھڑا اٹھایا اور پیچھے الٹے قدموں کے ساتھ ہٹتی چلی گئی تھی جیسے وہ وہاں تھی ہی نہیں..... یہیں آ کر ان کی پہلی ملاقات ختم ہوئی تھی۔

دوسری ملاقات ہاسٹل روڈ کی طرف ایس ٹی سی کوریڈور میں ہوئی تھی جہاں کچھ لڑکیاں چھوٹے چھوٹے کپ کیکس میں رنگ برنگی موم بتیاں جلائے سالگرہ کی وش گنگنا رہی تھیں۔ وہ سرد موسم تھا کوریڈور میں چاروں طرف سے دھند گر رہی تھی، دودھیا بلبوں کی روشنی میں وہ لڑکی بیچوں بیچ کھڑی تھی اور اس کی دوستیں کورس میں گا رہی تھیں۔ ایس ٹی سی دھند میں لپٹا ہوا، موسم کی خنکی، اور ہلکی سی رومانوی سی فضا.....

سرخاب وہیں سے گزر رہا تھا۔ اپنے دو دوستوں کے ہمراہ جب اس نے اپنے پیچھے آواز سنی تھی۔

''سنو!''

وہ تینوں پلٹے تھے۔

''کون؟''

''بھورے بالوں والے لڑکے! میں تم سے مخاطب ہوں۔''

سرخاب نے سٹپٹا کر اپنے دوستوں کے سر کے بالوں کی طرف دیکھا تھا اور پھر اسے لگا تھا وہ اسے ہی تو بلا رہی تھی۔

http://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.com

''کون میں؟'' سینے پر انگلی رکھے وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔

''ہاں! تم۔''

وہ تھوڑا سا آگے بڑھ آیا تھا۔ دھند گرنے لگی تھی، خنکی بڑھنے لگی۔

''یہ لو منہ میٹھا کرلو، آج میری سالگرہ تھی۔'' وہ ہتھیلی آج کپ کیک سے سجی ہوئی تھی، چھوٹا سا کپ کیک اور چھوٹی سی اس پر جلتی بجھتی اور پگھلتی ہوئی موم بتی۔

''میں آپ کو نہیں جانتا۔''

دھند میں سب گم ہونے لگا تھا حتی کہ وہ دونوں بھی، جب اس نے اپنے پیچھے آواز سنی تھی۔

''سنو..... تم لمحوں کی واردات پر یقین رکھتے ہو؟''

''نہیں، میں ایک زمینی اور حقیقی انسان ہوں محترمہ!''

چھوٹا سا کپ کیک اور ننھی سی موم بتی پیچھے کھینچ لی گئی تھی۔

کوریڈور میں ونڈ چائمز پھر سے کہر آلود شام میں بجنے لگے۔

''جلد تم زمینی نہیں رہو گے اور حقیقی بھی۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا جو لمحوں کے وارد ہونے سے منکر ہوتا ہے ناں تو لمحے اسے جا پکڑتے ہیں۔ اللہ تمہیں لمحوں کے عذاب سے محفوظ رکھے بھورے بالوں والے حسین شخص۔''

وہ دونوں اپنے اپنے راستے مڑ گئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی فضا میں راجا انور کے جھوٹے روپ کے درشن کے کرداروں میں محبت میں لمحوں کی واردات ابھی بھی تازہ تھی۔

آج وہ لمحوں کی واردات کا مکمل شکار ایک خیالی شخص ان تنگ گلیوں میں مجنوں ہوا پھرتا تھا۔

پوپلی بوا کو جلد از جلد وہ بحث ختم کرنی تھی۔ بڑے ابا کو اخبار کے بعد چکوترے کھانے تھے اب تک وہ اداریتی صفحہ بھی ہضم کر چکے ہوں گے اور ان کی تلاش میں کئی ہرکارے نکل رہے ہوں گے ساتھ ساتھ صلواتیں بھی ضروری تھیں۔

''کس کا پتا لینے آئے ہو؟''

وہ جھجکا کہ کیسے کہے کہ وہ کس کی خبر لینے آیا ہے؟

اگر انہوں نے پوچھ لیا کہ کیا رشتہ ہے کیونکر ایک کنواری کی خبر کو آئے ہو؟

یہی بات اس نے درنجف کے سامنے رکھی تھی تو وہ جو سوکھے گوشت کی یخنی تیار کر رہی تھی بڑے عجیب سے انداز میں ہنسی تھی۔

''جب تم مجھے قائل کر سکتے ہو تو پھر دنیا کے کسی بھی انسان کو قائل کر سکتے ہو۔''

''تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو، تبھی یقین کر لیتی ہو۔ دنیا کا مجھ سے کسی محبت وجبت کا رشتہ نہیں ہے۔''

گھاگھرے میں پڑی چنٹیں ٹھیک کرتی، لکڑیوں کو چولہے میں برابر کرتی وہ درنجف تھی جس کو معلوم تھا کہ لمحوں کی واردات کیا ہوتی ہے۔ تبھی اس نے سرخاب خان کے لیے رستہ صاف کر دیا تھا۔

''تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟''

خوبانیوں کے باغ میں گلی سڑی خوبانیوں کی باس سونگھنے کی حس کو ناگوار تھی۔

''میں دل نہیں بدل سکتی تمہارا۔ میرے ظرف کو اگر کبھی ماپنا ہو تو علاقے کے سارے پہاڑ ذہن میں رکھنا، شاید ان سے بھی زیادہ وسعت ہو میرے دل میں۔ سب کی چاہ الگ الگ ہوتی ہے مجھے صرف تمہارے نام کی چاہ ہے کہ فقط درنجف سرخاب کہلوائی جاؤں اور بس..... مورے کہتی ہیں کہ میں پاغل ہوں، جھلی ہوں جو اپنے بندے کو کسی دوسری کے حوالے کرنے کا سوچ رہی ہوں۔ مورے میری ماں ہیں مگر وہ بھی میرے ظرف کو نہیں جانتیں۔ تم اس کے سامنے جانا تو میرا نام لے کر کہنا کہ درنجف بھی سرخاب کے نکاح میں ہے اور صرف نام چاہتی ہے تو کیا وہ صرف نام کی حد تک مجھے قبول کر لے گی؟ اگر وہ ہاں کہہ دے تو مجھے بتا دینا میں اخروٹ کا حلوہ تقسیم کروں گی۔ اگر وہ انکار کرے تو تین طلاق کے پتھر بھجوا دینا، تمہارا نام نہ سہی، مگر پتھر ہی سہی، جو نصیب میں ہو، مل کر ہی رہتا ہے۔''

آسمان گیلا گیلا سا تھا، گلی میں شہتوت کے درختوں کی بہتات تھی جن سے شاید شام کی اوس ٹپکتی تھی۔

پوپلی بوا اس خیالی پلاؤ پکاتے انسان کو درفٹے منہ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ اب تو چکوتروں والا تھیلا بھی وزنی ہوتا جا رہا تھا۔

''سنیں! مجھے سیرت امتیاز سے ملنا ہے۔''

پوپلی بوا پتھر ہو گئیں۔ وہ جو جلدی جلدی کی ہڑبونگ تھی وہ بھی غائب ہو گئی تھی۔ دسمبر کی دانت کٹکٹاتی سردی نے ان دونوں وجود کو جیسے موسم کی سختی سے آزاد کر دیا تھا۔ بوڑھی آنکھوں نے درد کی شدت سے مغلوب ہو کر گالوں پر آنسوؤں کو بہہ جانے دیا تھا۔ یہاں بھی خزاں کے موسم میں ساون نے اپنی گھات لگائی تھی۔

''کل شام یہیں اسی جگہ ملنے آنا، میں تمہیں بتاؤں گی پتا سیرت کا۔''

نگری نگری پھرا مسافر جیسے کسی گلاب کی مانند کھل اٹھا تھا کہ اب تھکن وجود کو چاٹنے لگی تھی۔ مسلسل کئی ماہ کی تلاش کے بعد وہ سیرت امتیاز تک پہنچنے والا تھا۔

پوپلی بوا نے اپنی شال سے آنکھوں کا کھارا پانی جھاڑا تھا۔

''چکوترا کھاؤ گے؟''

''نہیں اماں! بہت شکریہ..... میں کل شام کو آپ کو یہیں ملوں گا۔''

''خیر سے جاؤ، اللہ کی امان میں۔''

وہ ان تنگ گلیوں میں اپنے موٹے فر کے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنے جوگرز سے شور پیدا کرتا ہوا سیدھا چلتا جا رہا تھا۔ پوپلی بوا نے تب تک دیکھا جب تک سرخاب نظر آتا رہا، پھر وہ دسمبر کی دھند میں کسی نقطے کی طرح گم ہو گیا۔ وہ سوچ کے دھاگوں میں الجھی گھر آئی تھیں۔ تین منزلہ عمارت کے پہلے فلور پر ان کی مطلوبہ جگہ تھی۔ وہ تھیلا تھامے خراماں خراماں اندر آئی تھیں۔ آیت اپنے لمبے بالوں کو جوڑے میں باندھتی ہوئی خفا خفا سی کچن سے باہر آئی تھی۔

''سو بار افضل کو کہا ہے کہ آپ کو باہر کے کام کے لیے نہ بھیجا کرے مگر مجال ہے جو یہ انسان کبھی اپنے مالکوں کا کہا مان لے۔ میں تو اس سے بہت تنگ ہوں بوا، کل سارے ان ڈور پلانٹس کے گملے باہر صحن میں رکھ دیے۔ وہ تو شکر ہے طاہر نے دیکھ لیا ورنہ سارے پودے ختم ہو جانے تھے۔''

ابا میاں بید کی کرسی میں پھنسے ہوئے کب سے چکوتروں کے منتظر بیٹھے تھے۔ ادارتی صفحے کو ختم

کر کے اب وہ پنجرے میں موجود آسٹریلین توتوں کی طرف متوجہ ہوئے نظر آتے تھے۔ یاد کی سلیٹ پر کوئی منظر سفید چاک کی طرح نقش ہونے لگا تھا۔

''سگی اولاد ہوں آپ کی، جو بھی فرمائش کروں، پوری کر دیا کریں۔ سگوں کو رشتوں کی زیادہ قدر ہوتی ہے، سوتیلے تو ہمیشہ حق ہی مارا کرتے ہیں۔ مگر آپ کو تو میں کبھی نظر ہی نہیں آئی۔ دو سال سے ایک یونیفارم پر گزارا کر رہی ہوں، میری تو خیر ہے۔ اگلے دو سال پرانے سویٹر کے ساتھ بھی گزارا کر لوں گی، مسئلہ تو پوپلی بوا کا ہے۔ عینک کا نمبر بڑھ گیا ہے اور بی پی اکثر لو ہی رہتا ہے۔ بس میں ہی ڈھیٹ ہوں کہ جورتی بھر بھی پروا نہیں کہ چابی کے گڈے کی طرح جیے جاتی ہوں..... جیے جاتی ہوں۔ بس کیا کروں اللہ نے ایسا ہی بنایا ہے مجھے۔ اتنا سا تو میرا دل ہے کہ سوتیلوں کو بھی خون سمجھ کر واری صدقے جاتی ہوں کہ ہیں تو باپ جائے..... دنیا میں رکھ تو بس ایک ماں جائی رہی ہے وہی کافی ہے باقی سب کیوں بھگتان بھریں۔ خیر ایک تو مہینوں بات نہیں ہوتی اور جب ہوتی ہے تو میری شکایتیں آپ کو بے سکون کر دیتی ہوں گی۔ خیر کہنا یہ تھا کہ طاہر بھائی کے اکاؤنٹ میں پیسے مت بھیجا کریں مجھے کم ہی ملتے ہیں۔ پھر جب شاپنگ پر جاتی ہوں تو ہر بار میرے موزوں کے لیے پیسے کم پڑ جاتے ہیں۔ باقی یہ کہ اب کی بار ذرا اگر ممکن ہو تو ذرا زیادہ پیسے بھیج دیجیے گا مجھے ضرورت ہے۔ کچھ توتے خریدنے ہیں۔ پنجرہ خرید رکھا ہے مگر خالی پڑا ہے کچھ دنوں کا شوق ہے پھر پرندے بھی آزاد کر دوں گی۔ ایک میں ہی پنجرے میں زندہ انسان کافی ہوں۔''

سلیٹ صاف ہو گئی اور سب غائب۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ آیت چکوترے اور کالا نمک لیے سامنے کھڑی تھی۔

''ابا! کھا لیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کریں جب سے قطر سے آئے ہیں کمزور ہی ہو گئے ہیں آپ تو.....''

وہ بس ہولے سے ہنستے چکوترے کی پھانکیں منہ میں رکھنے لگے تھے۔

''تمہاری ماں کدھر ہے آیت؟''

کچن سے ککر کی سیٹی کی آواز آنے لگی تو وہ ادھر دوڑ گئی تھی۔

''وہ جم خانے گئی ہیں۔ کچھ ورزشیں کرنی تھیں، کہہ رہی تھیں پٹھے کھنچے رہتے ہیں اور اکڑن ہو جاتی ہے جسم میں۔'' لان میں لگے پام کے درختوں پر سرد سا آسمان کھڑا تھا۔ سنجیدہ اور پرملال جیسے کسی نقصان، کسی زیاں کا بوجھ اٹھائے کھڑا ہو۔

ابا نے پوپلی بوا کو تسبیح کے دانے گراتے ہوئے جائے نماز پر بیٹھتے دیکھا، وہ ایسے ہی کہیں گم ہو جایا کرتی تھیں۔

''بوا.....؟'' وہ ٹھٹھرتی ہوئی سرگوشی پوپلی بوا کو حال میں کھینچ لائی تھی۔ ''وہ میرے بارے میں کیا کہتی رہی آپ سے؟''

بوا کا دل چاہا ہنس دیں کہ وہ شہزادی جو کھجور کی گٹھلیاں نشانیوں کی صورت پھینک گئی تھی کہ ڈھونڈنے والے اس کی خبر کو آئیں گے تو وہ کامیاب رہی تھی مگر..... سب کچھ ہونے کے باوجود سب ہوتے ہوئے بھی اگر..... کیوں؟

''کئی سال ناراض رہی کہ شکل نہیں دیکھے گی لیکن بڑا چھوٹا سا دل تھا اس کا جو سولہویں سن میں لگی تو ہر رات سونے سے پہلے تمہاری تصویر سرہانے لے کر سوتی تھی کہ بوا جو بھی ہے، جیسے بھی ہیں، اللہ نے میری زندگی میں باپ جیسا رشتہ رکھا ہے تو پھر مجھے اترانا چاہیے۔ میں کیوں ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر زندگی مشکل کروں۔ کہتی تھی، ابا اچھے ہیں، پیسے بھیجتے ہیں، ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اور پتا ہے امتیاز! کبھی تم اسے بازاروں میں پیسے خرچ کرتا ہوا تو دیکھتے۔ رقم کئی کئی بار گنا کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ بوا میرا حساب بڑا کمزور ہے۔ مگر مجھے پتا تھا کہ امتیاز حساب کے کچے ہمیشہ تم ہی رہے ہو، وہ بڑی پکی تھی۔''

توتوں نے دیوار سے بلی کو کودتے دیکھ لیا تھا۔ ٹیں ٹیں کی آوازوں سے امتیاز ولا گونج اٹھا تھا۔ چکوترے کا ذائقہ جیسے کونین ہو گیا اور پوپلی بوا بھی آنکھیں بند کیے کسی دور دیس کو روانہ ہو گئی تھیں۔ شام کی شال رات نے ہمیشہ کی طرح ادھار لے کر اوڑھ لی تھی۔ وقت نے ایک لمبی جست بھری اور دوسرے دن کی شام کو جا لیا۔

وہی شہتوت کے درختوں والی تنگ گلی تھی جہاں چند بلیاں اپنے بچوں کو لیے گھر گھر گھوم رہی تھیں کہ بچوں کو آنکھیں آنے والی تھیں۔ بھورے بالوں والا وہ شخص منہ سے دھوئیں اڑاتا پھر سے پوپلی بوا کے مقابل تھا۔ دور دور تک کوئی آدم زاد نہ تھا۔ وہیں بوا نے وہ کالی سیاہ رنگ کی بھاری ڈائری اسے تھما دی تھی۔ وہ جیسے سیرت امتیاز کا پتا تھا جو اس وقت کی سب سے قیمتی شے تھی جس کی سرخاب کو ضرورت تھی۔

''سنو! آج کے بعد اس گلی میں نہ آنا، جس کے ساتھ تمہارا واسطہ تھا، وہ تو.....'' بوا ادھوری بات اس کے حوالے کر کے خود پوری گلی پار کر کے نقطے کی صورت گم ہو گئی تھیں۔

وہ ادھر ادھر دیکھ کر بھاگتا دوڑتا ہوا ایک قریبی پارک کی طرف نکل آیا تھا جہاں املتاس اور گل مہر کے پیڑ تھے۔ خزاں نے ہر طرف اداسی کا پانچواں موسم طاری کر دیا تھا۔ وہ کالے رنگ کی ڈائری کھولتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی لرزش کو بغور محسوس کر رہا تھا جو اسے اپنے جسم کی نس نس میں محسوس ہو رہی تھی۔

''آداب دنیا جہان کے سب سے خوب صورت انسان! مجھے معلوم ہے کہ میں نے اربوں کھربوں کی دنیا کو چھوڑ کر فقط تمہیں خوب صورت کہا ہے تو پہلے بتا دوں کہ میری ہر بات کا یقین مت کرنا۔ بقول میرے دوستوں کے میں باتیں گھڑنے کی فیکٹری ہوں جہاں خام مال میں جذبات ڈال کر خاص پراڈکٹ میں صرف اور صرف باتیں ہی نکلتی ہیں۔ بھلا خوب صورت باتوں کے علاوہ بھی اس دنیا میں کچھ حسین اور دلکش ہو سکتا ہے؟ شاید نہیں یا پھر کبھی نہیں.....

میں نے زندگی سے صرف ایک چیز سیکھی تھی جیسے بھی حالات ہوں بس مسکرا دو، ویسے تو بہت کچھ سیکھا ہے، جو جائز تھا مجھے وہ سب میں نے سیکھا ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی چیز میں مہارت رکھتا ہی ہے تو میری مہارت میرا سکون ہی رہا ہے۔ اماں کی وفات کے بعد سوتیلی ماں کے عذاب کے بعد بہت کم اولادیں سکھی رہتی ہیں، مگر میں ان کم لوگوں میں سے ہوں، میں نے کچھ بھی کبھی بوجھل اور بھاری نہیں رکھا کہ بس اتنا بوجھ لادے گھومتے رہو۔ میں بھی کبھی نہیں گھومی مگر میں نے اپنا بار کبھی نہیں اٹھایا۔ بس لوگوں کے اٹھائے ہیں کہ وہ زندگی میں کس کس کسوٹی پر پرکھے گئے ہیں۔ سب کو لگتا ہے مجھے انسانوں اور جذبوں کی پرکھ ہے۔ اور میں اس بات پر اتراتی ہوں کہ ہاں مجھے پرکھنے کا ہنر آتا ہے۔ آرکیالوجی

ڈیپارٹمنٹ کی ورکشاپ میں تم نے میری مٹی کی صراحی توڑی تھی یاد تو ہوگا؟ انسان جس جس شے کو بھی کبھی توڑے تو اسے یاد رکھے، کبھی مرمت کا سے ہو تو جوڑ دے، یہی جوڑ توڑ ہی تو زندگی کا حصہ ہیں موسیو! موسیو خوب صورت لقب، خطاب یا جو بھی ہے مجھے بہت اچھا لگتا ہے سوچا تمہیں موسیو کہہ کر پکارا کروں؟

کیا میں پکار لیا کروں بہت سے احترام مانع ہوتے ہیں کہ تم میرے سینیئرز میں شمار ہوتے ہو مگر پھر بھی، زندگی کو آسان ہونا چاہیے..... ہے ناں موسیو؟ میں نے لمحوں کی بات کی ہے ہمیشہ کہ لمحے مقدس ہوتے ہیں، وارد ہوتے ہیں، اگر ہو جائیں تو احترام کر لیا جائے۔ میں کرتی ہوں، مگر تم نہیں کرتے سرخاب خان! تم نے وہ مٹی کی صراحی نہیں توڑی تم نے میرا دل پارہ پارہ کیا تھا۔ کتنا عجیب ہے کہ کچھ لوگ لمحوں کی چوٹ سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرا یہ روپ صرف تم جانتے ہو، ورنہ ابا ابھی بھی مجھے ناخلف، نافرمان اولادوں میں شمار کرتے ہیں۔

پوپلی بوا کے لیے میں ڈھیٹ ہوں اور سوتیلے رشتوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہوں۔ ہی ہی ہی..... کچھ بھی نہ ہونے کا بھی اپنا مزا ہے۔ تم نے دیکھا ہے کبھی کچھ نہ ہو کر؟ میں نے تمہاری فطرت تبھی پہچان لی تھی جب تم نے میرا کپ کیک واپس کر دیا تھا، تب میں نے سوچا تھا کہ وہ میرا خاص دن تھا، تمہارا بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟ بس یہی ہوا تھا۔ اس رات میں ہاسٹل کی چھت پر دسمبر کی سردی میں اکیلی چہل قدمی کرتی ہوئی صرف تمہیں سوچتی رہی تھی سرخاب خان کہ زندگی نے مجھے پھر کس اسٹیج پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور مجھے کون سا کردار ادا کرنا ہوگا۔ وہ رات عجیب رات تھی جب مجھے کوئی سامع ضروری تھا اور پھر میں نے سب کچھ عدن جبار سے کہہ دیا تھا کہ اس رات کنیز فاطمہ اور تمکین جمال اپنے گھروں کو روانہ ہو چکی تھیں۔ وہ رات مجھ پر بھاری تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ادھر دسمبر کی خنک صبح کا سورج مشرق سے ابھرا تھا اور میری عدن جبار سے بات مکمل ہوئی تھی جو اچھے دوستوں کی طرح مجھے سنتی رہی تھی، بغیر کسی سوال کے، کسی تفتیش کے، ایسے دوست کہاں ہوتے ہیں سرخاب خان؟"

گل مہر اور املتاس ہوا کی چھیڑ سے پت جھڑ موسم کی ریت نبھانے لگے۔ درختوں نے پرانے خشک پتوں کو وجود سے اتارنا شروع کر دیا تھا۔ سرخاب خان کالی ڈائری کا صفحہ موڑ کر نشانی رکھے وہاں

سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مڑے ہوئے صفحے کے کونے پر ایک دوست کا نام ابھرا ہوا ہے۔

عدن جبار.....

ایک ایسی دوست جس کے لیے شہزادیاں نشانیاں کبھی نہیں رکھتیں کہ دوستوں کو نشانیاں ضروری نہیں ہوتیں!

☆.....☆.....☆

عدن جبار کی زبان میں زہر اگ آیا تھا جس نے فردوس گوہر کو نیلا کر دیا تھا۔ دوست بھی اپنی زبان میں ڈنک رکھتے ہیں، ڈنک میں زہر ہوتا ہے اور اس زہر کا تریاق دنیا میں کہیں بھی میسر نہیں ہوتا۔ کہیں بھی نہیں۔

فردوس گوہر کو اپنی عزیز جان دوست نے ڈس لیا تھا۔

وہ آنسو بھری آنکھیں لیے ان تینوں کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ کنیز فاطمہ کو، تمکین جمال کو اور عدن جبار کو، اسے شدت سے سیرت امتیاز یاد آئی تھی کہ اگر وہ ہوتی تو کبھی اسے تنہا نہ چھوڑتی۔

شعبہ ابلاغیات کا گراؤنڈ تھا جہاں یہ سب چل رہا تھا۔ آس پاس لوگ اپنے اپنے فائنل پراجیکٹس کی تیاریوں میں مگن نظر آ رہے تھے۔ شوٹ ہو رہے تھے کاسٹیومز کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ کوئی اسکرپٹ تھامے اپنے ڈائیلاگز رٹنے میں مصروف تھا۔

''دوست زندگی ہوتے ہیں، قابل ستائش ہوتے ہیں۔'' عدن جبار نے بازو سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ ''تم سن رہی ہو ناں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ میں نے کبھی وہ چیز تک استعمال نہیں کی کہ جس کے بارے مجھے شبہ بھی ہو کہ وہ کسی اور نے استعمال کی ہو کبھی..... یہاں چیز ہوتی کوئی، کافی مگ، موبائل فون، آؤٹ فٹ، اسکارف.....تو میں چھوڑ دیتی کسی لمحے میں سوچے بغیر مگر فردوس گوہر یہاں معاملہ کسی چیز کا نہیں ہے ایک انسان کا ہے، جو میرے لیے کتنا ضروری ہے۔ یہ بات صرف میں جانتی ہوں، تم نے مجھ سے خلیل کو چھینا ہے۔''

عدن جبار کا گلا رندھ گیا تھا، آواز بیٹھ رہی تھی، وہ اسے مسلسل چھتیس منٹ سے لتاڑ رہی تھی۔

جواب میں وہ ہمیشہ کی طرح چپ رہی تھی کہ اسے بس یہی کرنا آتا تھا خاموشی اور بس.....

فردوس گوہر نے اپنی نم آنکھوں کو اٹھایا تھا۔

''میں ایسے کیسے کر سکتی ہوں عدن، میں تمہارے ساتھ کیسے کر سکتی ہوں؟'' وہ تائید چاہتی تھی مگر کنیز اور تمکین بھی عدن جبار کی طرف کھڑی تھیں۔اس لمحے فردوس گوہر پر تنہائی کا قرب وارد ہوا تھا جس نے اس کے قدم تک اکھاڑ پھینکے تھے۔

''تم کر چکی ہو ایسے..... میں نے تم دونوں کو گلوریا جینز میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

اپنی آنکھوں پر اعتبار کر رہی ہو عدن؟''

اسٹوڈنٹس نے متوجہ ہونا شروع کر دیا تھا۔

اسکرپٹ تھامے مکالمے پریکٹس کرتی شازمہ رک گئی تھی۔طلحہ جو کیمرہ تھامے لانگ شارٹ لے رہا تھا وہ بھی ٹھٹک گیا تھا۔

وہ بہترین دوستوں کی لڑائی تھی جو اس سے پہلے گزرے سالوں میں سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہی تھیں مگر آج کوئی الگ کہانی تھی۔

''میں نے خود تمہیں دیکھا ہے فردوس، تم رو رہی تھیں اور وہ تمہیں چپ کروا رہا تھا۔ میں نے اس وقت اسے کالز کیں مگر میری آنکھوں کے سامنے اس نے کالز کاٹ دیں، وہ تمہاری طرف متوجہ تھا۔''

آسمان کا نیلا رنگ ہلکے سرمئی رنگ میں بدلتا رہا۔لاہور کے موسم کا بھی اعتبار نہیں تھا۔پل میں اپنا چولا بدل لیتا تھا۔ہواؤں میں ٹھنڈک در آئی تھی۔

''اپنے دل کی سنو، وہ تمہیں کیا کہتا ہے؟ میں سب کچھ ہو سکتی ہوں عدن! مگر میں اللہ کی قسم سچ کہتی ہوں میں خائن نہیں ہوں۔'' وہ پریوں کے جیسی فردوس گوہر جسے شعبہ ابلاغیات میں اپسرا کہہ کر پکارا جاتا تھا سسک رہی تھی۔وہ اس وقت دنیا کے کسی بھی انسان کو کچھ بھی سمجھانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

کچھ سچ اتنے مہلک ہوتے ہیں کہ انسان کے جسم اور روح کو مردہ کر دیتے ہیں۔وہ بھی ایسا ہی سچ تھا سامنے آتا تو بہت کچھ مر جاتا۔

سب سے پہلے فردوس گوہر، پھر دوستی، پھر رشتے اور بس.....

بارش کی پہلی بوند فردوس گوہر کے لمبے سیاہ بالوں میں گم ہوئی۔ وہ اسٹیچو بنی کھڑی رہی۔

''کنیز فاطمہ! تم عدن کو سمجھاؤ، میں ایسی نہیں ہوں۔ میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ خلیل بے شک اچھا لڑکا ہے، اچھا دوست ہے مگر وہ صرف دوست ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ تمکین! تمہیں تو سب خبر ہے ناں، تم تو مجھے جانتی ہو ناں۔''

عدن نے زور سے اس کا بازو جھٹکا تھا۔ درد کی ٹیس بازو سے ہوتی ہوئی دل تک پہنچ گئی تھی۔

''تم مان لو کہ تم شروع سے ہی ایسی ہو فردوس! تم جیسی لڑکیاں صرف یونیورسٹی میں دوسروں کے منگیتر پھانسنے آتی ہیں جنہیں اپنی فیملی ویلیو نہیں دیتی تو وہ توجہ کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ کچھ بھی.....''

لفظ تیر تھے، نشانہ دل تھا۔ عدن جبار نشانے کی پکی تھی۔ فردوس گوہر شکار ہو گئی تھی۔ وہ ڈپارٹمنٹ سے لڑتی ہوئی باہر یونیورسٹی کے روڈ پر آ گئی تھیں جسے پنجاب یونیورسٹی کا جنت روڈ کہا جاتا تھا مگر آج وہ دوزخ ہو گیا تھا۔ آگ تھی، شعلے تھے، فردوس سڑ رہی تھی۔

''میرا یقین کرو عدن!''

وہ رکی تھی اور اس بار اس نے تھپڑ فردوس کے چہرے پر جڑ دیا تھا۔

آسمان گہرا سیاہ ہو گیا۔ بجلیوں کی کڑک شروع ہوئی تھی۔ کنیز فاطمہ اور تمکین جامد تھیں۔ فردوس بے تحاشا رو رہی تھی۔ آس پاس گزرتے اسٹوڈنٹس رکنے لگے تھے۔ موسم بدلا تھا تو ہاسٹل کے لڑکیاں لڑکے چھتریاں اٹھائے آ گئے تھے۔ انسان بدلا تھا تو کوئی مہربان چھتری نہیں تھی کہ انسان اوڑھ لے۔ زبان کے زہر نے نیلا کر دیا تھا۔

''پیرا سائٹ ہو تم، دوست کیسے ہو سکتی ہو۔ تم نے مجھ سے خلیل کو چھینا ہے۔ فردوس! اللہ کرے تم مر جاؤ۔''

عدن جبار غائب دماغ ہو رہی تھی۔ اسے سب رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں پر یقین کر رہی تھی۔

آنکھیں فریب دکھاتی ہیں، وہ دل کو کنارے کر چکی تھی۔

وہ تینوں آگے آگے تھیں اور فردوس گوہر پیچھے پیچھے۔ یہاں تک کہ وہ مین روڈ پر نکل آئی تھیں۔

"وہیں رک جاؤ فردوس! تم اور میرے پیچھے آئیں تو میں اسی ٹریفک کے آگے جان دے دوں گی۔ میں نفرت کرتی ہوں تم سے، سخت نفرت..... آخ تھو۔ تم نے مجھ سے کوئی چیز مانگ لی ہوتی مگر خلیل.....!" عدن جبار کانپ رہی تھی۔ وہ دونوں اسے سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

آسمان کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں اور بارش کی بوچھاڑ نے سب کچھ جل تھل کر کے رکھ دیا تھا۔ فردوس گوہر نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ وہ شکوہ کناں سی نظر بے وقعت ہارے ہوئے قافلوں کی مانند واپس پلٹی تھی۔ چھاجوں چھاج برستی بارش میں وہ یونیورسٹی کے روڈ ناپتی رہی۔ جامعہ مسجد کے سامنے روش پر ٹہلتی رہی۔ سکون گم ہو گیا تھا جیسے کسی بچے کا گردمیں سکہ گم ہو جایا کرتا ہے۔ ایک گھنٹہ وہ بوٹینیکل گارڈن میں ٹہلتی رہی جہاں کسی بھی طالب علم کا داخلہ ممنوع تھا۔

کسی نے اسے بتایا تھا اندھیرا چھاتے ہی بوٹینیکل گارڈن میں اونچے درختوں سے چمگادڑیں لٹکتی ہیں۔ وہ سر اٹھا کر دیکھتی رہی۔ شام ہو گئی تھی۔ بیگ میں رکھا موبائل ہلکی ہلکی آواز میں بج رہا تھا۔ وہ پتھروں کی روش پر اکڑوں بیٹھ گئی تھی۔

"پیراسائٹ۔" ایک پھیکی سی ہنسی، ارزانی کا گماں.....

ساری زندگی وہ اس وجہ سے خوش تھی کہ اس نے اپنے دوستوں کی صورت حاصل پا لیا ہے مگر سب سراب تھا۔ عدن جبار نے اس کے سر پر آسمان گرایا تھا۔ کاش کنیز فاطمہ اور تمکین اس کی مدد کو آ جاتیں۔

موبائل کی گھنٹیاں تیز ہوتی گئیں۔

وہ بیگ سے موبائل نکال رہی تھی۔

اسکرین پر ایک نام جگمگا رہا تھا۔

"خلیل کالنگ....."

بارش تھمنے کے بعد ہواؤں کا شور بڑھ گیا تھا۔ شور بڑھ جائے تو ساری آوازیں نگل جاتا ہے مگر

ایک آواز ہر شے پر حاوی تھی۔

''مجھے سخت نفرت ہے تم سے، خائن ہو تم۔''

وہ سسک رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ مالی نے اسے روتے دیکھا۔ وہاں کئی لڑکیاں آیا کرتی تھیں، کونے میں بیٹھ کر گھنٹوں روتی تھیں مگر وہ ان جیسی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ انتہائی حسین لڑکی تھی جیسے کوئی مکمل نظر آتا ہو، کامل ہو مگر اندر کا کھوٹ صرف اسے ہی پتا ہو کہ دنیا صرف ظاہر دیکھتی ہے۔

وہ کال ریسیو کر چکی تھی۔ آواز کی نمی نے سارے موسم کی نمی کو مات دے دی تھی۔

''خلیل! اس نے مجھے خائن کہا۔ پیرا سائٹ کہا کہ میں دوستوں کی امانتوں میں خیانت کرنے والوں میں سے ہوں۔ کیا میں ایسی ہوں؟''

خلیل کو دھکا لگا تھا۔ کل سے عدن جبار کی مسلسل کالز جنہیں وہ کسی وجہ سے سن نہیں سکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس معاملے میں کتنی پوزیسو تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں گوہر؟''

پوری دنیا میں ایک وہی ایسا شخص تھا جو اسے گوہر کہہ کر بلایا کرتا تھا اور وہ اس بات پر صدیوں خوش رہ سکتی تھی مگر لمحوں کی خطا نے ہمیشہ صدیوں کے درد دیے ہیں۔ ہائے!

''میں ٹھیک ہوں۔ بس میرا دم گھٹ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کسی نے دل کی جگہ پر پاؤں رکھ دیا ہے۔ خلیل! ایک وعدہ کرو کہ تم کبھی اسے سچ نہیں بتاؤ گے۔ میں نہیں چاہتی وہ اپنی بقیہ زندگی کسی گلٹ کے ساتھ گزارے۔ اور رہی بات میری تو ہم جیسے لوگوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ یہ تخلیق کا دکھ ہے، خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔''

وہ سنبھل گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ یونیورسٹی کے مین گیٹ کی طرف آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جا رہی تھی۔ سڑک سیدھی تھی اور کناروں کے ساتھ لگے ہار سنگھار کے درخت بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا گوہر! تم پریشان مت ہونا پلیز۔''

وہ ہنسی تھی۔ خلیل تھرا گیا تھا۔ وہ ہنسی کے پس پردہ حقائق سے آشنا تھا۔

''تم ایسے مت ہنسو۔''

''رونے سے منع کرتے ہو..... ہنسنے بھی نہیں دیتے ہو۔''

بیگ کندھے سے جھول رہا تھا۔ سڑکیں بارش میں دھل سی گئی تھیں۔ عجیب وقت کے پھیر میں اسے سیرت امتیاز یاد آئی تھی۔

''پنجاب یونیورسٹی میں تو ہر ہفتے بارشیں ضروری ہیں کہ یہاں کے درختوں کو دھلائی کی ضرورت رہتی ہے۔''

خلیل نے اسے غائب دماغی کی کیفیت میں پایا تھا۔

''تم کہاں ہو؟ میں لینے آجاؤں؟ گاڑی ہے کیا تمہارے پاس؟''

وہ تھکی تھی۔ گاڑی تو تھی اس کے پاس اور ڈیپارٹمنٹ کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ سامنے طویل سفر تھا جو کہ وہ طے کر کے آئی تھی، تھکن نے پیروں کے انگوٹھوں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ وہ خاموشی سے مڑ کر دوبارہ واپسی کے سفر کو چل دی تھی۔

گاڑی ڈپارٹمنٹ میں تھی تو پھر وہ کیوں پیدل پھر رہی تھی؟

ٹھنڈی سانس لے کر فردوس گوہر نے ایک سرگوشی خلیل کی سماعتوں کے گوش گزار کی تھی۔

''سنو! میں نے زندگی میں دو لوگوں سے شدید محبت کی ہے۔ خلیل سے، یعنی کہ تم سے اور عدن جبار سے یعنی کہ اس سے جس سے تم محبت کرتے ہو مگر.....''

''مگر کیا؟'' ادھر سانس ادھڑنے لگی تھی۔

''اس سب کے باوجود میں ایک پیراسائٹ ہوں جو ایک کیڑا ہوتا ہے جو دوسروں کی محبت پر زندہ رہتا ہے اور بس۔''

فردوس گوہر نے موبائل پنجاب یونیورسٹی کے زرعی رقبے کی طرف اچھال دیا تھا جہاں دھان کے کھیتوں میں سٹہ لگ چکا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے درودیوار نے شعبہ ابلاغیات کی اس اپسرا کو بالکل مطمئن چہرے کے ساتھ سڑکوں پر سکون سے راستوں پر سفر کرتے دیکھا تھا۔ جیسے سب ختم ہو جانے کے بعد کا اطمینان حاصل کر لیا گیا ہو.....

مگر اس راز سے واقف نتاشا ابراہیم تھی کہ سب دکھاوا ہے۔ دکھاوے کے بعد کی جو حقیقت ہے وہ برہنہ ہے۔ وہ اپسرا نہیں تھی۔ وہ کچھ اور ہی تھی۔ کہانی ابھی جا کر کہیں شروع ہونی تھی۔ جو کہ گوہر خاندان کے علاوہ نتاشا ابراہیم کو معلوم تھی۔

نتاشا ابراہیم جو کہ.....!

اک گھات میں بیٹھی ہوئی شام اجل
اور ازل کی چھاپ سے ہر فرد ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول **لا** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

باب دوئم

گھات

گھات کے لیے سب میسر تھا۔

شکار، وقت اور شکاری.....!

باجھ تیرے اودل دے ساتھی

دل دی حالت کی دساں

کدی کدی ایہہ تھکیا راہی

رستے وچ بہہ جاندا اے

نتاشا ابراہیم کو جیسے کسی نے اٹھا کر ٹھنڈے پانی کے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ ٹھنڈک اور کھارا پن جیسے سارے وجود کی جڑوں میں گھس آیا تھا۔ میک اپ روم کی کھڑکیوں کے باہر شام نے پنجے گاڑ لیے تھے۔

مگر اصل سیاہی تو کہیں دل کے اندر در آئی تھی۔

''تمہارا دل تمہارا قطب نما ہے نتاشا مگر.....''

مونا باجی کو شاید انسانوں کے چہرے پڑھنے آتے تھے۔

''مگر کیا باجی.....؟''

''دل قطب نما ہو تو اچھا ہوتا ہے، انسان بہت سارے فریب اور دھوکوں سے بچا رہتا ہے مگر کبھی اس پر چوٹ پڑ جائے تو سمت درست نہیں رہتی۔ تمہارے اس قطب نما کے ٹوٹنے کا خدشہ مجھے اکثر ہلکان کیے رکھتا ہے۔''

http://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.com

میک اپ روم کے شیشے پر جیسے دھند سی جمنے لگی تھی۔ وہ ابھی بھی ٹھنڈے پانیوں میں گردن تک ڈوبی ہوئی تھی، اسے سانس آ رہا تھا مگر فردوس گوہر کے سانس کی تار ٹوٹنے کو تھی۔

سوت کاتنے والیاں بڑے جوکھم سے سوت کاتتی ہیں۔ ارتکاز، محنت.....تب ہی سکون کی نیند سوتی ہیں اور جب خبر ہو کہ جو سوت کاتا ہے وہ تو کسی نے کتر دیا ہے یا کہیں فرق بیٹھ گیا ہے تو وہ پھر سب ادھیڑ کر دوبارہ سے سب کچھ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ چرغے سلامت رہتے ہیں۔

انتظار گاہ میں کھڑی فردوس گوہر نے اپنا عکس آئینے میں دیکھا تھا۔ کالے سیاہ رنگ کے لباس میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ سیاہ رنگ میں اس کی اجلی رنگت، رات کی سیاہی کو بھی مات دے رہی تھی۔ لانبی لانبی پلکیں، آنکھ کا حزن اور پیشانی کی بردباری، جسے اپسرا کہا جاتا تھا۔ جو سچ میں ایک اپسرا تھی۔ وہ جب لمبی نوکدار ہیل پر گھومی تھی تو کئی ماڈلز کے دل دھڑک گئے تھے۔ وجود پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ سیاہ بال جو پشت پر یوں لہراتے تھے جیسے کوئی دشت پر چھایا سلیٹی بادل ہو جس کے سائے تلے ہر ہر شے نکھر جاتی ہے۔ امل کئی بار آ کر اسے دیکھ چکی تھیں اور ان کا دل نہیں بھر رہا تھا۔

لوگ حسین ہوتے ہیں.....

لوگوں کی آنکھوں کی پتلیاں بھی گنگ کر دیتی ہیں۔

وہ ہنستے ہیں تو دل کھینچ لیتے ہیں۔

لوگ حسین ترین ہوتے ہیں۔

فردوس گوہر کوئی اور ہی چیز تھی جس کے وجود میں عجیب قسم کا رعب، بے نیازی، دلکشی اور وقار تھا جو آنکھ کو جکڑ لیتا تھا، دل کو پکڑ لیا کرتا تھا۔ وہ ہنستی تھی تو موتیوں جیسے ہموار دانت ٹھٹکا دیتے تھے۔

وہ امل کا ماسٹر پیس تھی جس نے ان کے ڈیزائن کیے ہوئے کپڑے پہن کر ان کے برانڈ کی شان بڑھا دی تھی۔ باقی ماڈلز اپنی باری پر ریمپ سے واک کر کے دوبارہ ویٹنگ روم میں اپنی جیولری ٹھیک کرنے میں لگ جاتی تھیں۔

وہ فردوس گوہر کے گرد جمع تھیں۔

''آپ اپنی حفاظت کے لیے کون سی پراڈکٹس استعمال کرتی ہیں؟''

موتی دانت ہنس پڑے۔

''میں نے پراڈکٹس کبھی استعمال نہیں کیے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

انہیں یقین نہیں آتا تھا۔

''میں جھوٹ نہیں بولتی علیزے.....!''

علیزے نام کی ماڈل بار بار اس کے گھنے بال، چمکتی ہوئی دودھیا رنگت کو رشک سے دیکھ رہی تھی۔ علیزے کے دل کو بڑے اطمینان سے یقین ہوگیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی ہوگی۔ لانبے مخروطی ہاتھ جن میں پتھر کی ننھے ننھے پتھروں سے بنی انگوٹھیاں تھیں وہ دراز کے ہینڈل پر رک گئے تھے۔

''نتاشا کدھر ہے؟''

وہ چونکی تھی۔ وہ ابھی تو میک اپ روم سے باہر آئی تھی اور نتاشا نے اس کے پیچھے پیچھے آنا تھا مگر جانے وہ کہاں رہ گئی تھی۔

وہ نتاشا ابراہیم پر اعتبار کرتی تھی۔

نتاشا ابراہیم فردوس گوہر کا ''قطب نما''

☆.....☆.....☆

''ابھی اس کے ریمپ پر جانے میں وقت ہے ناں بس کچھ دیر بعد تم دیکھ لوگی کہ وہ سیڑھی جس پر وہ قدم رکھ کر آسمان چھو لینے کی باتیں کرتی تھی، زمین سے آ لگے گی اور امل اسے دھکے دے دے کر باہر نکالیں گی۔ تم بھی بس اپنا سامان پیک کرلو ذرا۔'' موسیٰ کی خبیث ہنسی فون کے اس پار گونجتی رہی۔

لمحوں میں نتاشا ابراہیم کو کسی نے چاقو سے چیر دیا تھا۔ دل میں کہیں درد اٹھنا شروع ہوگیا تھا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ غرائی تھی۔

دل کا قطب نما ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بھٹک گئی تھی۔ راستے سارے آگے بند ہی تھے۔

''لمبی کہانی ہے یہ نتاشا جی..... پھر کبھی سناؤں گا اپنی میڈم کو کہنا میرا وعدہ پورا ہو گیا۔'' شیطانی لہجے نے شام کو رات کے بہروپ میں ڈھال دیا۔

وہ سسکیاں لیتی ہوئی میک اپ روم کی کرسی پر اوندھی گری ہوئی تھی۔ بس ایک دیوار گیر گھڑی تھی جو وقت کو پاس اور پاس کر رہی تھی۔ جیسے سب کچھ ختم ہونے والا تھا۔

ابھی تیرہ منٹ پہلے فردوس گوہر نے نتاشا ابراہیم کے ہاتھ تھام کر اور ماتھا چوم کر اسے دعا دی تھی۔

''پتا ہے مجھے زندگی میں بڑی فکر رہی کہ جانے آگے زندگی میں ان چاروں کو کھونے کے بعد کوئی مجھے دوست مل بھی سکے گا یا نہیں جو مجھے سمجھے گا، مجھے جاننے کے باوجود بھی مجھ سے محبت سے پیش آئے گا۔ دنیا اتنی اچھی نہیں ہوتی نتاشا مگر تم ہو، جانے اللہ نے تمہیں کس مٹی سے بنایا ہے کہ تم میری اتنی پروا کرتی ہو۔ اب زندگی کے اس نئے سفر میں مجھے تمہارا ساتھ بہت حوصلہ دے رہا ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ آج کے بعد مجھے ایک نئی شناخت مل جائے گی پھر اس سب مصروفیات میں شاید زندگی میرے لیے آسان ہو جائے۔ نتاشا! تم دعا کیا کرو کہ اللہ میرے لیے زندگی کو آسان ہی رکھے۔''

وہ لوگوں کو دعائیں دیا کرتی تھی اور اپنے لیے خیر مانگتی تھی۔

اس نے تو شاید کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ جن کے لیے وہ دعائیں کرتی ہے وہ اس کے لیے شر اکٹھا کرتے پھر رہے ہیں۔

شر پھر ہر کسی کو نقصان پہنچاتا ہے۔

دور سے آواز آ رہی تھی وہ ہر کسی سے پوچھتی پھر رہی تھی۔

''نتاشا کہاں ہے؟ اگر وہ اوکے کر دے گی تو پھر میں ریمپ پر جاؤں گی۔''

کہا تھا ناں نتاشا ابراہیم قطب نما تھی جو سمت دکھاتا ہے۔ جس پر بھروسے کیے جاتے ہیں۔

روشنیوں کے ہجوم میں اندھیرا چھپنے کو جگہ ڈھونڈتا ہوا نتاشا کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ آوازوں کا شور آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔

''تمہیں ابھی بھی شبہ ہے کہ کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے؟''

موتی دانت پھر سے چمکے تھے اور آنکھ کا حزن سارے وجود پر تصویر ہو گیا تھا۔

''میں صرف نتاشا کی بات کا یقین کرتی ہوں۔''

پتلی نازک نوک دار ہیل پر دوپٹا سنبھالتی ہوئی وہ سیاہ لباس میں ملبوس اپسرا سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی میک اپ روم کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں سامنے تھیں۔ نتاشا کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو گیا تھا۔ وہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھی تھی۔

''نتاشا! تم ٹھیک ہو؟ تمہارا چہرہ اتنا سفید کیوں پڑتا جا رہا ہے؟'' چہرہ تھپتھپاتی وہ پانی کی بوتل ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ بھول گئی تھی وہ ریمپ پر جانے والی ہے۔ وقت کی سوئی کو پر لگ چکے ہیں۔

وہ سب بھول جاتی مگر اسے دوسرے کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی تھی۔

''سب ختم ہو گیا گوہر جی۔''

''کیا ختم ہو گیا..... مونا باجی کا رشتہ یا نیلم نے پھر سے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی؟''

آنسو لڑیوں کی صورت بہنے لگے، کانپتے ہوئے سہارا لیا تو کاسمیٹکس کے سامان میں کئی کانچ کی شیشیاں فرش پر گر کر ٹوٹ گئیں۔

''کاش! مونا باجی کا رشتہ ٹوٹ جاتا، کچھ بھی ہو جاتا مگر جو ہوا ہے وہ کبھی نہ ہوتا۔''

باہر سے ہلکے ہلکے بیک گراؤنڈ میوزک کی دھنوں سے فرش لرز رہا تھا۔ فردوس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''اماں کی طبیعت خراب ہو گئی کیا؟''

''نہیں۔''

باتیں ادھوری رہ گئیں۔ باقی سب ہی کچھ پورا ہو گیا تھا۔

امل نے اپنی زندگی کی جمع پونجی اس شو پر خرچ کی تھی۔ وہ بہت پرامید تھیں کہ وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی کو ڈیزائننگ اور ایڈورٹائزنگ میں مات دیں گی مگر یہاں پھر بھی انہیں مات ہو گئی تھی۔

وہ دل پر ہاتھ رکھے اسکرین کو دیکھتی رہ گئی تھیں جہاں نیوز چینل کی پٹی پر وہ راز منکشف ہو رہا تھا جس

http://kitaabghar.com

نے وہ شہرت کی چھت ہی تباہ کر دی تھی جس کے نتیجے میں وہ اور گوہر شناخت کے لیے اکٹھی ہوئی تھیں۔

''آج کی سب سے بڑی خبر.....ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ.....''

بیک گراؤنڈ میوزک کہیں دم توڑ گیا تھا۔

سارے میں موسیٰ کی پروفیشنل رپورٹنگ کی آواز نے صور پھونک دیا تھا۔

''جی میں آپ کو بتاتا چلوں کہ سال کے سب سے بہترین فیشن شو مقابلے میں اہل جی برانڈ کی ماڈل کی حقیقت سامنے آ گئی ہے۔''

علیزے نے خوب صورتی و دلکشی کی اس حسین مورت کے چہرے پر کرب کی ایک لکیر کھینچتی ہوئی دیکھی تھی۔

وہ مات کھائی ہوئی اپسرا اپنی ہیل آہستہ سے اتار کر، جیولری بھی شیشے کے سامنے رکھ کر ننگے پاؤں چلتی ہوئی اہل جی کے پاس آئی تھی جو سیڑھیوں پر آنسو روکنے کی کوشش میں ہلکان بیٹھی تھیں۔

''آئی ایم سوری اہل جی! سب ختم ہو گیا۔'' وہ گرتے پڑتے علیزے کی طرف آئی تھی۔

''علیزے! مجھے گاڑی تک چھوڑ دو۔ مجھے نظر آنا بند ہو گیا ہے۔''

سب سفیدی تھی، سب اندھیرا تھا۔

☆.....☆.....☆

اندرون لاہور کی تنگ و تاریک گلیوں میں، آخری کنارے پر وہ گھر تھا جو چھ کھڑکیوں والا گھر تھا کہ جس کی تین کھڑکیاں ہمیشہ بند ہی رہتی تھیں مگر باقی تین کھڑکیوں سے وہ تینوں بہنیں نیچے گلی میں جھانکتی رہتی تھیں۔ مصروف سے لوگ، بھاگتے دوڑتے جیسے وقت کو مٹھی میں کر لیں گے۔

بوڑھی مائیاں گھروں کے دروازوں پر روٹی پر سالن رکھے اطمینان سے بیٹھ کر کھاتے ہوئے جانے کتنی ہی صدیوں کی پیڑھیاں کھنگال لیتی تھیں۔ عمر گزرنے کے بعد ان کے اثاثے میں فقط بیتا ہوا وقت ہی بچا تھا۔ انہیں دیکھ کر پرانے ادب کے بوڑھے کردار یاد آ جاتے تھے۔

لاہور کے لوگ کھانے پینے کے انتہائی شوقین ہیں۔ اسکول کو جاتے ہوئے بچے بھی اکثر مقررہ

وقت سے پہلے ٹفن کھا پی کر دوبارہ ماؤں کے سر ہو جاتے تھے۔ سبزی والوں کی بھانت بھانت کی آوازیں۔

''لو کی لے لو، چقندر تازہ۔''

بوڑھیاں تنک کر کہتی تھیں۔

''سب کچھ تازہ تو یہ موالے کر پھر رہا ہے ناں، ہم تو باسی لوگ ہیں ناں۔''

زندگی یونہی مہنگائی، صابن، سرف کے بڑھتے نرخوں میں گزر رہی تھی۔

نتاشا ابراہیم کا بچپن انہی حالات میں گزرا تھا یہی سب دیکھتے ہوئے۔ مونا باجی بس بی اے کر کے گھر بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ ان سے چھوٹی نیلم اتھرے مزاج کی تھی جیسے ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ایسا فرد ضرور ہوا کرتا ہے جو سب کو ناکوں چنے چبوا کر رکھتا ہے۔ جانے کیا وجہ تھی کہ نتاشا ابراہیم کا سب سے زیادہ وقت اپنی بہن مونا باجی کے ساتھ گزرا تھا اور اس نے اپنے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی محرومیاں اور احساس کمتری بھی سمیٹ لیے تھے۔ اور اس کے ذہن میں اتنے سوال جمع ہوا کرتے تھے کہ مونا باجی اکثر اس کے ان سوالوں سے تھک جایا کرتی تھیں۔

''نتاشا! مجھے ایک چیز کی سمجھ نہیں آتی آخر تم اتنے سوال کیسے اکٹھے کر لیتی ہو؟''

''بس ایسے ہی میرے ذہن میں آجاتے ہیں۔''

''کوشش کیا کرو کہ دماغ کو پرسکون رکھا کرو۔ سکون اس دنیا اور زندگی میں سب سے قیمتی، باقی سب کچھ اضافی چیزیں ہوتی ہیں۔''

''سکون بھی اضافی ہو جاتا ہے نا اکثر.....! کیسے اضافی ہو جاتا ہے؟''

''سکون جتنا زیادہ ہو، وہ پرسکون کر دیتا ہے انسان کو لیکن سکون نہ ہو تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔''

نتاشا کو عادت تھی ادھر ادھر سے سوال پکڑ کر مونا باجی تک لے کر آنے کی، اس کی زندگی بس اپر کلاس، مڈل کلاس، ایلیٹ کلاس کے گرد ہی گھوم رہی تھی۔

''انہوں نے اچھے کپڑے پہنے ہیں تو ہم نے کیوں نہیں؟''

''انہوں نے اگر ٹرائفل کھایا ہے تو ہم نے انڈا ٹکی کیوں کھائی ہے؟''

کتنے چھوٹے چھوٹے مقابلے تھے جو وہ اپنے ساتھ کیا کرتی تھی۔

احساس کمتری کا بیج انسان کے دل میں ایک بار اگ جائے تو پھر اسے درخت ہونے میں وقت نہیں لگتا اور مونا باجی کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ نتاشا ابراہیم کے وجود میں اگے اس احساس کمتری کے بیج کو اگنے ہی نہ دیں۔ تنا اور اس کی شاخیں ہونے ہی نہ دیں تاکہ وہ آنے والی اپنی زندگی پرسکون طریقے سے گزار دے۔

مگر ایسا بالکل بھی نہیں تھا۔ اندر ہی اندر کوئی ایسا جال بن گیا تھا جس نے آکٹوپس کی طرح نتاشا ابراہیم کو جکڑنا شروع کر دیا تھا۔

دوسری طرف نیلم ابراہیم تھی جس کی زندگی صرف اور صرف گلیمر کے گرد گھومتی تھی جو ہمیشہ ہر بار ٹی وی کے آگے ٹکٹکی باندھے ٹی وی دیکھتی رہتی تھی۔ اماں اسے کئی بار ڈانٹا کرتی تھیں۔

''نیلی! تو اندھی ہو جائے گی دور رہ ٹی وی سے.....''

''میں ہوں گی، میری آنکھیں ہیں۔ میں نے اندھا ہونا ہے ناں..... آپ لوگوں کو کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ ہمیشہ غصے سے جواب دیتی تھی۔

اس نے انڈین کوئی ڈرامہ نہیں چھوڑا تھا۔ بس اس کا ایک ہی کام تھا ٹی وی کے سامنے بیٹھ کے ٹی وی میں نظر آنے والی اداکاراؤں کے لباس دیکھنا، وہ اٹھتی بیٹھتی کیسے ہیں۔ وہ غضب کی یادداشت کی مالک تھی۔ ان کے پہنے ہوئے کپڑوں کے ڈیزائن تک نقل کر لیتی تھی۔ ان کے میک اپ کی ہر تفصیل اس کی انگلیوں پر ہوتی تھی۔

کنٹراسٹ، میک اپ ٹونز، نیل پینٹ تک.....

نیلم ابراہیم نے اپنی زندگی کے سارے سبق انہی اداکاراؤں کی زندگی سے ہی جیسے سیکھ لیے تھے اور اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کے آس پاس کیا سوچا جا رہا ہے؟

ابا واپڈا میں تھے تو ریٹائرمنٹ کے بعد بس گھر اور چارپائی کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ مصروف انسان جب فراغت میں آجائے تو چڑچڑا سا ہو جاتا ہے، وہ بھی ہو گئے تھے۔ ملازمت سے فراغت کے

بعد دو سال بس گھر بیٹھ کر روک ٹوک کرتے رہے اور جب بے بس ہو گئے تو مانو پیروں میں پہیے فٹ کر لیے۔ گھر میں ہی نہ ٹکتے تھے۔ محلے کے کبوتر بازوں سے دوستیاں گانٹھ لیں۔ کبھی بادشاہی مسجد کے چوباروں پر آنے والے سیاحوں کی خبر گیری کو چل دیتے تھے۔

اماں سارا دن تین جوان ہوتی بیٹیوں کو دیکھ کر ہولتی رہتی تھیں۔ زیادہ خوف انہیں نیلم کے بڑھتے قد اور لمبی ہوتی زبان سے آتا تھا۔

''نیلم! گدی سے زبان کھینچ لوں گی کسی روز۔''

''کھینچ ہی لیں کسی روز، ویسے بھی مجھے لگتا ہے میری زبان کچھ اضافی ہی ہے۔''

وہ تینوں کھڑکیوں میں بیٹھ کر مونگ پھلی پھانکتی تھیں۔

''ہم غریب ذات لوگوں کو تو بس یہی سستا میوہ ہی کافی ہے۔''

چھلکوں کے ڈھیر اکٹھے ہوتے جا رہے تھے ساتھ ساتھ کڑچ کڑچ کی آوازیں بھی۔ نتاشا کے لہجے میں وہی احساس کمتری کے تنے کی شاخیں باہر نکل رہی تھیں۔

سانولی رنگت، دبے ہوئے نقوش اور مناسب سی آنکھوں والی مونا باجی کو پھر سے خوف آیا تھا۔

''ناشکرا پن نہ دکھایا کرو۔ اللہ کو برا لگتا ہے۔ ناپسند ہے۔ چھت ہے، صحت ہے۔''

''کھانے کو مونگ پھلی ہے اور رہنے کو چھت کے نام پر کباڑ خانہ ہے۔''

کبوتر بازوں کی سیٹیاں فضا میں بلند ہوتی گئیں۔

ساتھ ہی ساتھ غٹرغوں بھی.....

نیلم نے مونگ پھلی کے چھلکے اٹھا کر پاس سے گزرتے کبوتروں کے غول کی طرف پھینکے تھے۔

''کبھی ریلوے اسٹیشن کا چکر لگا آنا، وہاں کئی بے گھر اور لاوارث لوگ پڑے ہوتے ہیں۔ مجھ سے جو تم اتنا بڑا سوالوں کا رجسٹر لے کر سوال کرنے آ جاتی ہو ناں، ان سے پوچھنا مونگ پھلی کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟ چھت کسے کہتے ہیں؟''

نیلم کہیں دور آنکھیں لگائے دیکھ رہی تھی، کچھ اور تھا جو توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔

''سب باتیں ہیں مونا بجو!''

مونا نے کمرے کے فرش کی طرف چھلانگ لگائی تھی، وہ اپنی کھڑکی چھوڑ چکی تھیں۔

''ہاں سب باتیں ہی تو ہیں۔''

نتاشا نے ہتھیلیاں سیدھی کر کے جوڑ لی تھیں۔

خواب اور خواہشوں نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ دل میں کسک اور درد نے ساتھ ساتھ سر اٹھایا تھا۔

نیلم نے قہقہہ لگا کر اسے متوجہ کیا تھا۔

''وہ ادھر دیکھو میری انگلی کی سیدھ میں، وہ سامنے والے چوبارے پر کھڑا لڑکا مجھے دیکھ کر سیٹیاں بجا رہا ہے۔''

نتاشا کو سخت برا لگا تھا۔

دور کچھ فاصلے پر واقعی وہ لڑکا ادھر ہی متوجہ تھا۔

''بند کرو کھڑکیاں اور اندر چلو۔''

دھڑا دھڑ کھڑکیاں بند ہوتی گئیں۔

مگر سیٹیوں کی آوازیں بتدریج بڑھتی گئیں۔

☆.....☆.....☆

بچپن میں جب ابھی وہ صرف کنیزاں تھی۔ کنیزاں فاطمہ، تب وہ ریت، کھنگل درویش اور اونٹوں کی قطاروں کی ٹلیوں کے عشق میں گرفتار تھی۔ بچپن سے ہی کنیز فاطمہ کی گھٹی میں تھل کا عشق سمایا ہوا تھا اور گھر کے ہر فرد اور پورے محلے کو یہ بات پتا تھی کہ وہ ریت کے ٹیلوں کے عشق میں مبتلا تھی۔ جب بھی ریت کبھی آندھیوں سے اڑتی ہوئی ادھر ہوتی تھی تو وہ ان بگولوں کو حیرت اور خوشی سے دیکھے جاتی تھی۔ شروع سے ہی اس کا نام کنیزاں رکھ دیا گیا تھا۔

دوسرا عشق کتابیں تھیں جن میں وہ گم رہتی تھی۔ جس میں وہ مگن رہتی تھی۔ کبھی بھی اسے بستے،

کتاب، قلم، دوات کے بغیر نہیں دیکھا گیا تھا۔ ریت کے اونچے ٹیلوں پر بیٹھ کر جانے حساب کے کون سے سوال حل کرتی رہتی تھی۔

ابا ہمیشہ اماں کو یہی کہتے تھے۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے ہماری کنیزاں بہت بڑا آدمی بنے گی۔''

''لڑکی ذات ہے، قدمیں ہی رہے تو اچھا ہے۔''

''تعلیم اور شعور انسان کو بڑا کرتا ہے۔''

تھل کی ریت کبھی ہوا کی چھیڑ سے دور دور تک پھیل جاتی تھی اور ریت کے ٹیلے ابھی یہاں ہیں تو کبھی وہاں۔ ریت کبھی بھی سلامت ایک جگہ پر نہیں رہتی تھی۔ ریت گھروندے جو ہوا کی شرارت سے دور تک بھی جاتے تھے۔ اونٹوں کے گلوں میں پہنی ہوئی ٹلیاں بجتی رہتی تھیں اور تیتر وہیں مٹر گشتیاں کرتے رہتے تھے۔ زندگی اسی طرح دھیمی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔

بختاور اور اماں نے کنیزاں کو ایک لاڈلی بچی کی طرح پالا تھا جس کی ہر خواہش اس گھر میں پوری کی گئی تھی۔ اماں اور بختاور کنیزاں پر جان دیتی تھیں، ابا کی تو ویسے ہی شہزادی تھی۔ وہ تین ایسے لوگ تھے اس گھر کے جو کنیزاں کی وجہ سے شاید زندہ تھے اور ان کی گھٹی میں کنیزاں فاطمہ کی محبت رکھ دی گئی تھی۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کنیزاں فاطمہ کو کبھی کوئی تکلیف نہ ہو۔

وہ کھگل کے درختوں پر اکثر لٹکتی پھرتی رہتی تھی اور کھگل کی دھونیاں دیتے ہوئے وہ اور بختاور ریت کے ٹیلوں پر اکثر دھوئیں سے لوٹ پوٹ ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار قطار گوٹی کھیلتے ہوئے، کوکلا چھپا کی کھیلتے ہوئے..... وہ ہر کھیل میں جیسے نمایاں رہتی تھی۔

زندگی نے اسے ہر جگہ نمایاں رکھا تھا اور یہ چیز اسے پسند بھی تھی۔ محلے میں، آس پاس میں، دوستوں میں، گھر میں ہر جگہ اسے ایک عجیب طرح سے اہمیت دی جاتی تھی جس کی کوئی وجہ نہیں تھی، جس کا کوئی سبب بھی نہیں تھا۔ بس یہ تھا کہ وہ کنیزاں فاطمہ تھی جس کے نام میں ہی ایک عجیب سا وقار اور تمکنت تھی۔

بچپن اس کا یونہی گزر گیا تھا۔ ایک لمبی قطار بنا کر ساری لڑکیاں اسکول جایا کرتی تھیں۔ مڈل تک اسکول تھا انہیں کافی سفر کرنا پڑ جاتا تھا۔ کبھی وہ اپنے اونٹوں پر بیٹھ کے جایا کرتیں جن کی ٹلیاں ہر وقت کھڑکتی رہتی تھیں اور اونٹوں کی قطاروں میں بیٹھی ہوئی وہ دنیا جہان کی باتیں کرلیا کرتی تھیں۔ انہیں ہر چیز کا پتا ہوا کرتا تھا۔

''پاس والے گاؤں میں ایک بھیڑ نے چار اکٹھے بچے دیے ہیں۔''

انہوں نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا بڑا ترتیب سے حساب رکھا ہوا تھا۔

یہی ان کی زندگی تھی اور یہی چھوٹی خوشیاں جن میں وہ مگن رہتی تھیں۔ شاید انہیں نہیں پتا تھا آنے والی زندگی میں وقت کون کون سی قیامت لیے ان کا منتظر تھا۔

''کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ اسکول سے واپسی پر وہ اپنے بستوں میں موجود لسی کی بوتلیں چھپائے ہوئے لسی گلاس میں لے کے بیٹھ جاتی تھیں۔

شرینہہ کے درختوں کے تلے بیٹھ کے وہ ٹھنڈی لسی پیا کرتی تھیں۔ چنوں کی دور تک پھیلی ہوئی فصلوں میں بھاگتے دوڑتے وہ کوکلا چھپا کی، شٹاپو، پکڑن پکڑائی بھی کھیل لیتی تھی۔ بھوک کی شدت ہو جاتی تو چنوں کا تریڑہ لگا کر کھاتی تھیں جو کچے پکے چنوں کو آگ لگا کر کھایا جاتا تھا۔ خربوزوں اور تربوز کی بیلیں بھی لگی ہوئی ہوتیں جن پر پکے ہوئے سبز اور پیلے رنگ کے خربوزے اور تربوز نظر آرہے ہوتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ زرقا اپنے ابا کا ریڈیو لے کر آجاتی تھی جو وہ مشغول ہو کر سنتی تھی۔

کبھی محمد رفیع کے گانے، کبھی نور جہاں کے گانے۔ اور کبھی حدیقہ کیانی کے.....انہوں نے بس یہی ریڈیو سے ہی سیکھ لیے تھے اور تھل واسیوں کی شادیوں میں رات کی محفلوں میں وہ سہیلیاں یہ سب کورس میں گاتی تھیں۔

بڑے بوڑھے ہمیشہ سے یہی کہتے آئے ہیں کہ ''ہر آندھی اچھی نہیں ہوتی۔ ٹھنڈک کے ساتھ وارد نہیں ہوتی اور نہ ہر ہوا اچھی ہوتی ہے۔ کچھ ہوائیں اور آندھیاں اپنے ساتھ شر کی فصل کو لے کر آتی ہیں۔ جب وہ فصل کہیں بھی، کسی بھی علاقے یا کسی انسان کے اندر اگتی ہے تو سب کچھ راکھ کر کے رکھ دیتی ہے۔''

http://kitaabghar.com

یہ تب ہی ہوا تھا جب کنیزاں کا بچپن لڑکپن میں تبدیل ہوا تھا اور یونہی اپنی سکھیوں کے ساتھ کھیلتے، اٹھتے بیٹھتے وہ اچانک ہی بڑی ہوگئی تھی۔

لڑکیاں تو ویسے بھی بانس کے جیسی ہوتی ہیں۔ان کے بڑے ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا۔کنیزاں فاطمہ کے بارے میں بھی کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنی ساتھی لڑکیوں کے ذہنوں سے کہیں آگے تھی۔ اس کے قد اور اس کے ذہن نے اچانک ہی بڑا پن اختیار کر لیا تھا جو کم از کم اس وقت کسی کو بھی نظر نہیں آیا تھا لیکن اگر وہ کسی کی آنکھوں میں آیا تھا تو وہ صرف اور صرف بختاور فاطمہ! جس نے اپنی بہن کے وجود میں پلنے والی وہ چیز دیکھ لی تھی۔

جیسے ہی مڈل کے امتحانوں اور میٹرک کے لیے اس نے شہر کا رخ کیا تھا۔کیونکہ بورڈ کے امتحانات کے لیے ہمیشہ شہر میں امتحانی مراکز بنائے جاتے تھے جہاں پر گاؤں کے طالب علم اپنے اپنے پرچے دینے کے لیے جاتے تھے اور امتحانی مراکز جو بھی بنتے تھے آس پاس کے گاؤں کے، وہ شہروں میں ہوتے تھے تو یہی وجہ تھی کہ کنیزاں اور اس کی ساتھی جو بھی طالبات تھیں، انہیں سفر کر کے ویگنوں پر لٹک کر شہر ہی آنا پڑتا تھا اور شہر آ کر جیسے کنیز فاطمہ کی ایک تیسری آنکھ کھل گئی تھی.....اور اسے اپنا دل جیسے تقسیم ہوتا محسوس ہوا تھا۔

وہ ابھی تک جیسے ریت، ہوا، اونٹ، تیتر، کھگل، قطار گوٹی میں مگن رہی تھی اور اسے پتا بھی نہیں چل سکا تھا کہ باہر کی دنیا کتنی بدل چکی ہے۔لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔اسے اونچی دور دور تک پھیلی پکی عمارتوں سے جیسے عشق ہونے لگا تھا۔وہ سرمئی سڑکوں کو بار بار محبت سے دیکھا کرتی تھی۔

اسے اپنے ریت کے ٹیلے برے لگنا شروع ہو گئے تھے۔وہ پکی عمارتیں، وہ شہر کا سفر، وہ شہر کے سوٹڈ بوٹڈ لوگ صاف ستھرے جن کی زندگی میں جانے کون کون سی انواع و اقسام کی مصروفیات تھیں۔ اسے اپنا تھل بری طرح سے عجیب اور پرانا پرانا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اسے قدیم زمانے سے چٹکی سے پکڑ کر کسی جدید زمانے میں لا کھڑا کر دیا تھا۔آس پاس کا سب کچھ پرایا لگ رہا ہو۔

وہاں کھانے پینے میں فروٹ چاٹ، برگر، پیٹیز، لوگوں کے لباس دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ پینٹ شرٹس، لانگ شرٹس، جینز، کرتے.....

پکی عمارتیں اور وہ کہیں ان کے بیچ گم..... کچی اینٹوں والے گھر کی کنیزاں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

سب کچھ جیسے بدل گیا تھا۔ جیسے شر کی آندھی نے اپنی لپیٹ اور بگولے میں لے لیا تھا کہ وہ کہیں کی نہیں رہی تھی۔ وہ جو شروع سے ہی پی ٹی وی کے زمانے کے دور میں بانو قدسیہ کے ڈراموں کی دلدادہ، حسینہ معین کی کرن کہانی اور رؤف خالد کے ڈراموں کی دیوانی تھی۔ یہاں آ کر ٹھٹک گئی تھی..... یہاں کی زندگی تو بہت مختلف تھی اس زندگی سے جو وہ گزارتی چلی آ رہی تھی۔ یہاں تو کچھ اور ہی تھا۔

شہر نے جیسے ان سب کے چہرے پر تریڑے جیسی کالک مل دی تھی۔ شہر کا وقت، روشنیاں.....! چائے کافی میں بدل گئی تھی۔ چٹنیاں کیچپ کہلائی جاتی تھیں..... اور وہ جوان کا بونگ پلاؤ تھا یہاں بریانی کہلایا جاتا تھا۔ اب پتا چل رہا تھا وقت اور زندگی نے کتنی تیزی سے سفر کیا تھا اور انسانوں کو پیچھے رکھ دیا تھا۔

کنیزاں کو لگا جیسے ریت ساری اس کے کان، ناک اور اس کے منہ میں گھسنا شروع ہو چکی ہے۔ اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کا پیچھا چھڑانے میں ناکام رہی ہے۔ اور پھر جب بورڈ نے میٹرک کے پوزیشن ہولڈرز کے نام کا اعلان کیا تھا۔ کنیز فاطمہ بنت الیاس کمبوہ اول نمبر پر تھی۔

ہر کوئی سکتے میں آ گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کنیزاں لائق فائق تھی، وہ یہ سب ڈیزرو کرتی تھی کسی بھی جگہ جا کر وہ اپنی اہمیت منوا لیتی تھی اس نے کبھی محنت سے جان نہیں چرائی تھی مگر وہ شاید اسے اتنا ذہین نہیں سمجھتے تھے۔

گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

کنیزاں نے پہلے خوش ہونے کی کوشش کی، پھر اس نے اداکاری کی اور اسے پتا چلا اسے اپنی ہنسی بہت پرائی لگ رہی ہے..... جب سے وہ میٹرک کے امتحان دے کر آئی تھی اس کا وجود آگ بگولوں میں آ گیا تھا۔

وہ اونچی نیچی پکی عمارتیں، وہ سوٹڈ بوٹڈ لوگ، دور تک پھیلی ہوئی سڑکیں، وہ فروٹ چاٹ کی ریڑھیاں.....

یہیں بڑے بوڑھوں کے قول صادق آ گئے تھے۔

ریت کے ٹیلے الٹ گئے۔

شرینہہ اور کھگل کے درخت دب گئے.....

☆.....☆.....☆

شام کی چادر ہر طرف پھیل چکی تھی اور وہاں جہاں کہیں اندرون لاہور میں بلب جلنا شروع ہوئے تھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے ہر طرف زرد رنگ کے جگنوؤں کی برسات آ گئی ہو۔ دور کہیں سے جیسے کوئی راگ الاپا جا رہا تھا اور کہیں سے بانسری کی آواز..... کہ وہاں ہر طرح کے لوگ رہائش پذیر رہے ہیں اور ہر طرح کے فنون لطیفہ نے لاہور میں پرورش پائی ہے۔

جس طرح انسان مختلف قسم کی زندگیاں گزارتے ہیں۔ لاہور میں فنون لطیفہ نے بھی مختلف طرح کے ادوار گزارے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ لاہور کی کوئی صبح، دوپہر، شام اور عصر کے ساتھ ساتھ رات بھی کسی رنگینی سے کم نہیں تھی۔

رات کو جب نیلم ٹی وی کے سامنے جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی اور مونا باجی اپنے ٹیوشن والے بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھیں تو نیلم نے اسے مشورہ دے ڈالا تھا۔

''نتاشا! میری بات سنو۔''

''ہاں کہوں کیا کہہ رہی ہو۔'' نتاشا موبائل پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھی۔

''میں سوچ رہی تھی اگر تم بیوٹی پارلر جوائن کر لو تو بہت اچھا رہے گا۔''

''تم یہ کیوں سوچ رہی تھیں، تم خود جوائن کر لو۔''

اسے یہ مشورہ ذرا بھی نہیں بھایا تھا۔

''نہیں..... میری کالج میں کلاسز شروع ہیں۔ تمہارا تو بی اے بھی اب مکمل ہونے کو ہے تو میں چاہ رہی تھی کہ فارغ رہنے سے اچھا ہے تم یہ جوائن کر لو، تمہارا فائدہ ہو جائے گا۔''

''اور تمہیں کیوں لگتا ہے کہ میں ایک اچھی بیوٹیشن ثابت ہوں گی۔''

''میں جانتی ہوں کہ تمہاری انگلیوں پہ رنگ بہت سجتے ہیں اور جتنی رنگوں کی، نیل پینٹس کی، میک اپ کی سینس ہے تمہیں تو تم لاکھوں کماؤ گی۔ آج کل تو سب میڈیا کے لوگ، اداکار اچھے میک اپ کے لیے پاگل ہیں۔''

نتاشا نے اس شام وہ بات ٹال دی تھی لیکن بعد میں جیسے ہی مختلف قسم کے حکومت کی طرف سے بیوٹیشن کے مفت کورسز کا آغاز ہوا تھا تو نتاشا نے وقت اور فراغت کو دیکھتے ہوئے وہ کورس جوائن کر لیا تھا۔

بعد میں ہر کسی نے دیکھا تھا کہ نتاشا کی انگلیوں سے رنگ بکھر بکھر جاتے تھے اور وہ رنگوں کے کنٹراسٹ، سلیکشن، بلینڈنگ.....ان چیزوں میں اتنی ماہر ہو چکی تھی کہ اب سارے اندرون لاہور میں نتاشا کی دھوم مچ چکی تھی.....!

مونا باجی نے اپنی بہنوں کو زندگی کے میدان میں آگے بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ لاابالی اور چپ چاپ نہیں تھیں، وہ نڈر، بے باک اور چالاک تھیں جو آج کل کی دنیا میں ضروری چیز تھی اور ان کے پاس کیا تھا۔ وہی صدیوں پرانا بی اے کی ڈگری کا ٹکڑا، بے نقوش والا چہرہ اور سادگی جو گزرے وقتوں میں کبھی قیامت کہلائی جاتی تھی مگر اب تو جیسے کوئی بار، بوجھ تھی۔

نتاشا نے ایک کمرے کو گھر کی چھوٹی سی گیلری کے ساتھ ملا کر کچھ پھٹے جوڑ کر ایک پارلر جیسی شکل دے دی تھی۔ نیلم اور وہ دو ہفتے اس پراجیکٹ پر دن رات لگی رہیں۔ اور وہ واقعی ایک سیلون بن چکا تھا۔ لمبا سا چوکور شیشہ، کچھ تصویریں، چند گلدان، اور کچھ میک اپ کی پروڈکٹس کے ساتھ ساتھ جلتی بجھتی رنگ برنگی لائٹوں کی چند لڑیوں نے ''نتاشا سیلون'' کی شکل اختیار کر لی تھی۔ محلے کی جو بھی عورتیں تھیں وہ نتاشا کے میک اپ سے فائدہ اٹھاتی تھیں اور انہیں بغیر کوئی ماتھے پہ شکن ڈالے تیار کر دیتی تھی۔

وہ سیکھ رہی تھی اسے ازبر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ انسانی چہرے اور رنگوں سے کیسے کھیلتے ہیں۔ اسے مزا آنے لگا تھا، اور گھر میں چند پیسے بھی.....پھر اسے نیشنل کالج آف آرٹس کے فلم کے اسٹوڈنٹس نے اپنی شارٹ فلمز کے لیے میک اپ آرٹسٹ کے طور پر ہائر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایسا میدان تھا جس نے اندرون لاہور کی اس لڑکی کے فن کو جوبن عطا کر دیا تھا۔ مہنگے مہنگے برانڈز بیوٹی پروڈکٹس کی

http://kitaabghar.com

سمجھ بوجھ نے نتاشا ابراہیم کو پالش کر کے رکھ دیا تھا۔

تین کھڑکیوں والے اس گھر کے حالات کچھ کچھ بدلنے لگے تھے کہ دھن کی دیوی مہربان ہو رہی تھی۔ نتاشا اور نیلم دونوں بیٹھ کر مارننگ شوز اور ویک اینڈ شوز دیکھا کرتی تھیں اور وہاں آنے والے کاشی، جواد اور بہت سارے سیلون کے میک اپ پر بحث کیا کرتی تھیں۔

ماہین ابراہیم ہمیشہ کی طرح اپنی کرسی پر براجمان اپنا چائے کا کپ تھامے ہوئے ان دونوں کو دیکھ کر سوچا کرتی تھیں۔

''انسان کی زندگی میں بھی وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ جانے کیا کیا تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ اب انہی دونوں کو دیکھ لیں، انہوں نے زندگی کو کسی اور طرح سے برتا تھا اور زندگی اب انہیں اور طرح سے برت رہی ہے۔ شاید نہیں..... قدرت کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لیے کیا سے کیا راستے نکال لیتی ہے۔ شاید کبھی میری زندگی میں بھی کچھ خوش گوار اور حسین ہوگا۔ اب میرے پاس پیسے کم پڑنے لگتے ہیں۔ میں نے اتنے سال ان کو جیب خرچیاں دی ہیں اور آج یہ میرے لیے کافی کے ڈبے اور نئی کتابوں کے نئے ایڈیشن لے کر آتی ہیں۔''

وہ ہمیشہ کوشش کرتی تھیں کہ بس مثبت ہی سوچیں لیکن یہ انسان کا ذہن ایسا ہے کہ انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ اماں بھی اکثر ان کے سامنے ان کی شادی کی باتیں لے کے بیٹھ جاتی تھیں۔

''مونا! میں تیری وجہ سے بہت فکر مند رہتی ہوں۔ تجھے نہیں پتا باہر کی دنیا کیسی ہے؟ باقی نیلم اور نتاشا تو اپنے جوگی ہیں لیکن تیری فکر مجھے کھائے جاتی ہے جس طرح تو شکل صورت کی ماٹھی ہے۔''

وہ جھوٹ موٹ کا کیلکولیٹر ڈھونڈنے میں لگ جاتی تھیں جو کبھی بھی مل کر نہیں دیتا تھا۔

''اماں! انسان کے اپنے بس میں کہاں ہوتا ہے؟'' کیلکولیٹر ڈھونڈنے والوں کو آنسوؤں نے جالیا تھا۔

''سب انسان کے بس میں ہوتا ہے، ان دونوں کو ہی دیکھ اب.....''

''میں کیا کروں اماں! آپ بھی جانتی ہیں کہ یہ اس طرح نہیں ہوتا۔ اس میں میرا تو کوئی قصور

نہیں ہے میری تو کوئی غلطی نہیں ہے ناں..... آپ فکر مت کریں، جو ہونا ہوگا وہ اللہ کی طرف سے ہو ہی جائے گا۔" ماہین ابراہیم نے سب کو سنا تھا۔ اماں کو، ابا کو اور ان دونوں کو بھی مگر ان کو سننے کے لیے کوئی بھی میسر نہیں تھا۔

وہ کھڑکیوں کے پاس رک گئی تھیں۔ دور بادشاہی مسجد کے اوپر آسمان پر کچھ جنگلی کبوتر گھمن گھیریاں کھا رہے تھے۔

"سب کے لیے کچھ نہ کچھ ہے تو میرے لیے کیا ہے؟"

☆.....☆.....☆

پچھلے ایک ہفتے سے مسلسل ایک پرائیوٹ کالج کے مالک ابا کے دروازے پر گاڑی لا کر کھڑی کر دیتے تھے۔ اب پورا گاؤں تجسس اور اس خوشی سے اس گاڑی کو دیکھتا تھا جیسے ریت کے ان ٹیلوں پر گاڑی دوڑا کر لے کر آنا ایک بہت بڑا کام تھا۔

پرائیوٹ کالج کے اس ادارے کے مالک کی ہمیشہ ایک ہی بات تھی ابا کے سامنے کہ وہ اپنی پوزیشن ہولڈر بیٹی کنیزاں کو ان کے کالج میں داخلہ دلوا دیں۔ جہاں انہیں یونیفارم، داخلہ، کتابیں سب کچھ مفت ملے گا اور کسی طرح کا بھی خرچا نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اتنے کاروباری بندے تھے کہ انہوں نے اس کے کالج جانے کے لیے خاص طور پر سواری کا بھی کہا تھا مگر ابا تھے کہ ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھے اور انہیں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور جب یہی بات انہوں نے بختاور اور اماں کے سامنے رکھی تھی تو اماں بھڑک اٹھی تھیں۔

"ارے! آپ بھی کیا سوچتے رہتے ہیں۔ بھلا دس جماعتیں پڑھ لیں۔ بہت ہے۔ ہمارے یہاں تھل واسیوں کو دس جماعتیں ہی کافی ہیں۔ اب آگے کوئی خواب نہ خود دیکھیں اور نہ ہی اسے دکھائیں۔ ہم غریب لوگ ہیں۔"

ابا مسکرا کر انہیں دیکھتے رہتے تھے۔

"ارے بھلیے لوکے! تمہیں کیا پتا دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور اب لڑکوں سے کہیں زیادہ

لڑکیاں پڑھائی لکھائی کر رہی ہیں تو آنے والے وقت میں لڑکیوں کی پڑھائی کا دور ہے۔"

ابا جو کبھی شہر کا چکر لگاتے تھے اور منڈی میں خربوزے پہنچانے جاتے تھے تو انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور ابا کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ ہر نئی تبدیلی کو خوش ہو کر سراہتے تھے۔ اماں کے ساتھ منہ ماری کرنے کے بعد ابا بختاور کی طرف رخ کر لیتے تھے۔

"بختاور بیٹی! تم کیا کہتی ہو پھر کنیزاں کو پڑھنے شہر بھیجیں یا نہیں؟"

"ابا! میں تو کہتی ہوں کہ آپ کنیزاں سے بھی پوچھ لیں اور جیسے آپ کو بہتر لگے وہی فیصلہ کریں۔ جیسا کہ آپ پہلے کہہ رہے ہیں کالج والے بھی آ رہے ہیں تو یہ اچھا موقع ہے، اس کا مستقبل سنور جائے گا اور بہت بڑی استانی بن جائے گی تو ہمارے اپنے گاؤں کا فائدہ ہو جائے گا۔ کم از کم یہاں کی لڑکیوں کو کوئی اور جان جوکھم والے کاموں میں تو نہیں ڈالے گا اور وہ اپنی تعلیم اور پڑھائی پر بھرپور توجہ دیں گی۔ میرا تو یہی کہنا ہے کہ اسے پڑھا ڈالیں۔"

ابا اماں اور بختاور کی میٹنگ پورے دو ہفتے چلتی رہی اور اس دوران بختاور ہمیشہ اسے پاس بٹھا کر پوچھا کرتی تھی۔

"کنیزاں! تم کیا چاہتی ہو؟ کیا تم پڑھنا چاہتی ہو؟"

اور کنیزاں کی آنکھوں میں جانے کتنے جگنوؤں کی اور خوابوں کی قطاریں بن جاتی تھیں۔

"بختاور باجی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میرا دل پڑھنے کے لیے مان گیا ہے اور میں چاہتی ہوں میں بڑی افسرانی بنوں اور پھر ہمارا بھی پکا گھر ہو اور ہماری گاڑی ہو اور ہمارے گھر تک ایک سڑک آتی ہو، سب سے پہلے میں اپنے گھر کی طرف آنے والی سڑک بنواؤں گی۔"

"تم صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو؟"

کنیزاں کا رنگ سلیٹی ہو گیا تھا جیسے دل کی حالت چہرے پر پوت دی گئی ہو۔

"نہیں، میں سب کے بارے میں سوچتی ہوں۔ میرے پڑھنے لکھنے سے آپ کو فائدہ ہو گا، ماں کو ہو گا، سب کو ہو گا۔"

بختاور بس اس کے چہرے پر کھلتے پھول دیکھ کر سوچا کرتی تھی۔

''یہ خود غرضی تو نہیں کہ انسان اپنے لیے سب کرے اور باقی سب کو بھول جائے۔''

اب تو وہ اپنی سہیلیوں کے پاس بیٹھنا بھی چھوڑ چکی تھی۔ جب سے اس کی پوزیشن آئی تھی اس میں ایک اور طرح سے تبدیلی آنا شروع ہوگئی تھی جس کو بختاور کوئی بھی نام دینے میں ہمیشہ کی طرح ناکام رہی تھی۔

''تم کیا چاہتی ہو؟ ابا پوچھ رہے ہیں کہ میں تم سے صاف بات کر کے تمہارا جواب ان تک پہنچا دوں کیا تم آگے پڑھنا چاہتی ہو؟''

''جی بختاور باجی! میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں بڑا آدمی بننا چاہتی ہوں۔ میں کچھ ایسا کرنا چاہتی ہوں جو کبھی کسی نے تھل میں نہیں کیا۔''

''ایک شرط پر.....'' بختاور نے اسے روک دیا تھا۔ جس فریم پر وہ سیپ کاڑھ رہی تھی وہ اس نے دھاگا توڑ کر اور سوئی کو پھنسا کر سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔ اب جیسے وہ مکمل طور پر کنیزاں کی طرف متوجہ تھی۔ دور ریت کے ٹیلوں پر مویشی اپنے راستوں پر رواں دواں تھے۔ کبھی کبھار ٹلیوں کی آوازوں کا شور بھی کانوں کو بھلا لگتا تھا۔

''کون سی شرط.....؟ مجھے بتائیں۔'' وہ خوش ہو کر ان کے سامنے دونوں ہاتھ تھام کر بیٹھ گئی تھی۔

اور بختاور کو جانے کیوں اس کی آنکھوں کی روشنی سے خوف آیا تھا۔ وہ روشنی ایسی تھی جس میں سب کچھ جلنے بجھنے والا تھا۔ ایسی جیسی بجلیوں کی کڑک میں ہوتی ہے اور جب بادلوں کے پار بجلیاں کڑکتی ہیں تو وہی روشنی ہوتی ہے پل بھر کو روشنی اور پھر وہی گھٹا ٹوپ اندھیرا.....!

بختاور نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی اور اسے کہا تھا۔

''تم بہت سے خواب اور خواہشیں لے کے جا رہی ہو اس گاؤں کی اور لڑکیوں کو بعد میں تمہاری ضرورت رہے گی۔ اس تھل کو تمہاری ضرورت رہے گی۔ یہاں کے لوگ بہت سی سہولیات سے محروم ہیں اور ان کی زندگی میں روشنی لانے کے لیے تمہیں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ میں جانتی ہوں جب تم ڈگری لے کر بڑی میم صاحب بن جاؤ گی تو تمہارے پاس اتنی طاقت ہوگی کہ تم باہر والے حکمرانوں

تک ہماری بات پہنچا سکو۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ لوگ یونہی سسکتے ہوئے ان ریت کے ٹیلوں میں کسی دن دب کر مر جائیں۔ میں چاہتی ہوں یہاں بھی پکے گھر، سڑکیں بنیں، لوگ پکے گھروں میں رہیں، انہیں بجلی کی سہولت میسر ہو۔ یہاں بھی سب کچھ ہو، وہ جو کسی شہر میں ہوتا ہے۔ آخر ان لوگوں کا بھی تو سہولیات پر حق ہے، میں بس یہی چاہتی ہوں کہ یہاں سے جانے کے بعد تم کبھی اپنی مٹی کو مت بھولنا۔''

مویشیوں کے ریوڑ گزر گئے مگر ٹلیوں کی آوازیں گونجتی رہیں۔ دھوئیں نے فضا کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تمہاری وفائیں ہمیشہ کھگل کے درختوں اور ریت کے ٹیلوں کے ساتھ سلامت رہیں۔ جو اپنا آپ بھول جاتا ہے پھر اسے دنیا ٹکے کے بھاؤ بھی نہیں خریدتی۔ اور تم نے اپنی قیمت خود لگانی ہے۔ انسان کو ہمیشہ اپنے اصل کے ساتھ ہی زندہ رہنا چاہیے۔ جب کبھی انسان اپنے اصل پر شرمندہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ زندگی میں کہیں کسی جگہ کا نہیں رہتا۔ خسارے کا سودا کبھی مت کرنا۔''

کنیزاں فاطمہ کے لیے اس شام فیصلہ ہو گیا تھا۔ وہ شہر جانے والی تھی جہاں کئی راستے اور منزلیں اس کے منتظر تھے۔

☆.....☆.....☆

نتاشا ابراہیم کی آنکھوں کے سامنے موجود اس گھر کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ وہ دو چیزوں سے بنایا گیا تھا۔ پہلی چیز شیشہ اور دوسری چیز لکڑی.....! اور یہ دونوں چیزیں ہی ایسی تھیں جن کو دوام نہیں تھا، جو فنا ہونے والی تھیں۔

شیشہ ٹوٹ جاتا تھا اور لکڑی جل جایا کرتی تھی۔

لکڑی کو گھن بھی لگ جاتا تھا اور شیشے میں دراڑیں بھی آ جایا کرتی تھیں۔

نتاشا ابراہیم کو اس گھر نے بڑے عجیب انداز میں اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ اس طویل ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں اس کوٹھی نما گھر کو دیکھتی رہ گئی تھی جس کی دیواریں انواع و اقسام کی بیلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی تھیں اور یہ پھول اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ آٹو والے کو پیسے دے کر اس نے

اس گھر کے دروازے پر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دستک دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازے سے ایک چوکیدار نے جھانکا تھا۔

''جی بی بی کیا کام ہے؟'' وہ چہرے مہرے سے بہت اکھڑ مزاج کا لگ رہا تھا۔

''جی میں یہاں انٹرویو دینے کے لیے آئی ہوں۔''

''اچھا..... آپ انٹرویو دینے آئی ہیں۔'' اس چوکیدار نے سر سے لے کر پاؤں تک نتاشا کو دیکھا تھا اور اسے اچانک ہنسی آگئی تھی۔

نتاشا نے اس کے چہرے کی ہنسی کو اسی وقت بھانپ لیا تھا۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟''

''کوئی نہیں بی بی جی! ہمارا تو کام ہے۔ ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ میں تو یہ دیکھ کر ہنس رہا تھا کہ جانے انٹرویو کے لیے کتنی لڑکیاں آئیں اور کتنی گئیں لیکن بیگم صاحبہ اور صاحب کی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھتی اور انہیں کوئی پسند نہیں آرہا۔ آپ بھی انٹرویو دے کر دیکھ لیں۔''

نتاشا کو یوں لگا تھا جیسے ماڈل ٹاؤن کی سڑکوں نے اس کے پیروں کو زنجیر لگا دی ہو۔

''اب تک کتنی لڑکیاں آچکی ہیں؟''

''صاحب پچھلے دو ہفتوں سے انٹرویو لے رہے ہیں۔ کوئی سو کے قریب لڑکیاں جا چکی ہیں اور آچکی ہیں اور ابھی تک بیگم صاحبہ اور ان کو کوئی پسند ہی نہیں آیا۔''

نتاشا کا دل دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا ایک پل کے لیے دل چاہا کہ وہ واپس بھاگ جائے، انہی الٹے قدموں پر لوٹ جائے مگر اس نے اپنی زندگی میں ایک چیز ابھی سے طے کر لی تھی کہ کوئی بھی اگر موقع یا کامیابی اس کی طرف آتی ہے تو وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرے گی۔ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ جانے کیوں اسے وہ اپنا تنگ، اندرون لاہور کے نکڑ پر وہ تین کھڑکیوں والا گھر یاد آیا تھا۔ اسے ماہین ابراہیم یاد آئی تھی جو اپنی رنگت، دبے ہوئے نقوش کے ساتھ رشتوں کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی تھی۔ اسے نیلم ابراہیم کا چہرہ یاد آیا تھا جس کے وجود کی بغاوت

نے گھر کے ہر فرد کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے آدھی راتوں کو ہونے والے اماں اور ابا کے جھگڑے یاد آئے تھے اور اس نے اپنے وجود کی عمارت کو دوبارہ سے تعمیر کرنا شروع کر دیا تھا اور اس نے وہاں پہلی اینٹ حوصلے کی رکھی تھی تا کہ وہ عمارت متزلزل ہو کر گر نہ جائے۔

وہ اپنے شولڈر بیگ کو کاندھے پر رکھتی بہت پرسکون انداز میں اس گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی اور جیسے جیسے وہ اندر داخل ہوتی گئی تھی ایک سحر اور مرعوبیت نے اس کے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔ ساتھ ہی ایک سوئمنگ پول تھا جس کے کناروں پر چند بطخیں ٹہل رہی تھیں۔ اور آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ اور وہاں ایک چیز کی بہتات تھی۔ وہ انواع واقسام کے پودے تھے جن میں کافی زیادہ قسمیں کیکٹس کی تھیں۔ کچھ گل دوپہری کی اور مینگولیا کی بھی..... دور تک پام کے درختوں کی ایک قطار پھیلی ہوئی تھی۔ وہی پل تھا وہ اس گھر کے رہنے والے افراد کے ذوق سے مکمل طور پر مرعوب ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے آپ کو ایک ڈرائنگ روم میں پا رہی تھی جہاں وہ بیٹھی ان میاں بیوی کا انتظار کر رہی تھی جن کی بیٹی کے اشتہارات دیے گئے تھے۔ وہ ایک عظیم الشان ڈرائنگ روم تھا جہاں پر تین چار قسم کی وال کلاک میں ایک جیسا وقت ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ اس منطق کو بالکل بھی سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہاں تجریدی آرٹ کی ساری پینٹنگز بھی آویزاں تھیں اور اس کے علاوہ وہاں پہ چینی کے گلدانوں کی کافی کلیکشن موجود تھی جن پر کیا گیا کام آنکھوں کو خیرا کیے دے رہا تھا۔

روشنیوں کا عجیب طرح سے امتزاج تھا جو انسان کو اچانک سے اندھیرے سے اٹھا کر روشنی میں لا کھڑا کر دیتا تھا اور یوں لگتا تھا وہ ایسا ایکسنر ہو جو انسان کو پوری طرح اسکین کر لیتا ہو۔

جانے کیوں نتاشا کے دل کو دھڑکا اور خوف ساتھ ساتھ محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جانے وہ کیسے لوگ تھے، کس طرح کے لوگ تھے۔ وہ تو بس اخبار میں اس پرکشش نوکری کا اشتہار دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اتاولی ہو کر بھاگی چلی آئی تھی۔ اس کا دل چاہا نیلم کو فون پر کال کر کے دو چار بے نقط سنائے جس نے اسے یہ مشورہ دیا تھا۔ وہ تو بہت آرام اور سکون کے ساتھ موبائل پر انٹرنیٹ پر اپنے بیوٹی پارلر کے لیے کوئی سستی سی میک اپ پروڈکٹس ڈھونڈ رہی تھی جب نیلم نے وہ اشتہار اس کے سامنے رکھا تھا۔

"یہ دیکھو! ایک امیر کبیر گھرانے کو اپنی بیٹی کی گرومنگ کے لیے ٹیچر کی ضرورت ہے اور مجھے لگتا

ہے کہ تم میں یہ صلاحیت ہے کہ تم کسی کو سنوار کر رکھ دو۔"

نیلم نے پھر اس کی توجہ اس اشتہار کی طرف دلائی تھی اور نتاشا نا چاہتے ہوئے بھی اپنا موبائل کنارے پر رکھ کر اس کی طرف آ گئی تھی اور دونوں سر جوڑ کر وہ اشتہار دیکھنے لگ گئی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن کی رہائش تھی۔ وہ دونوں آپس میں ڈسکس کرنے لگی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آج وہ وہاں پہ انٹرویو کے لیے موجود تھی۔

ڈرائنگ روم میں ان دونوں میاں بیوی کی آمد کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک سمندر امڈ آیا تھا، جیسا کہ وہ کوئی مدھر اور مخمور کن سی مہنگی ترین خوشبو تھی جیسے حواس قابو میں ہوتے جا رہے ہوں۔

"کیا نام؟"

"نتاشا ابراہیم۔"

"کہاں سے ہو؟"

"اندرون لاہور۔"

"اردو اور پنجابی اچھے طریقے سے بولنا آتی ہے۔"

"جی آتی ہے۔"

"لڑکوں سے دوستی ہے یا کبھی رہی ہو؟"

نتاشا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

وہ ان دونوں کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ وہاں عام سے سپاٹ سے تاثرات تھے۔

"جی نہیں۔"

"تمہاری کوئی خوبی؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

میک اپ، گرومنگ، مثبت سوچ.....؟

"میں کسی بھی انسان کے لکس کو بدل کر رکھ دیتی ہوں۔"

"صرف میک اپ سے یا ویسے بھی؟"

سامنے میز پر پائن ایپل جوس اور آلمنڈ کیک سرو کیا گیا تھا۔ بادام کی خوشبو نے پرفیوم کی مہک پر

غالب آنے کی ٹھان لی تھی۔

''ویسے بھی، میں نے انسانوں کو غور سے پڑھا ہے، دیکھا ہے، ان کے نقوش کی سمجھ بوجھ لی ہے کہ میں انہیں کسی بھی رنگ میں ڈھال سکوں..... یہ دیکھیں۔''

وہ نیشنل کالج آف آرٹس کے شارٹ فلم کے اداکاروں کی تصویریں انہیں دکھانے لگی تھی۔

''ان کا میک اپ، گیٹ اپ، باڈی لینگویج سب میں نے کروایا ہے۔''

دونوں میاں بیوی نے زیرک نگاہی سے سب دیکھا تھا۔

وہ لڑکی عام نہیں تھی۔ جتنی سادہ اور بے نیاز وہ لگ رہی تھی اپنے کام میں مہارت میں کہیں آگے تھی۔

اس کے لہجے میں خالص اردو کھنک تھی، اٹھک بیٹھک میں ٹھہراؤ تھا۔

''چلو ٹھیک ہے..... تم ہماری طرف سے خود کو فائنل سمجھو۔ اس سے پہلے کہ باقی معاملات ہوں، تم ہماری بیٹی سے مل لو۔''

وہ جیسے کسی آسمانی کنارے کو چھو آئی تھی۔

وہ شیشے اور لکڑی سے بنا گھر جیسے اس کے لیے لکی ثابت ہوا تھا۔

وہ پائن ایپل کے سپ لے رہی تھی جب ڈرائنگ روم میں فردوس گوہر نے قدم رکھا تھا۔

نتاشا ابراہیم کو وہ گھر، خوشبو، بادام کی مہک سب بھول گیا.....

وہ سناٹے میں آ گئی تھی۔

حیرت، تعجب، رعب جانے کتنے ہی محسوسات کا رولر کوسٹر اس کے اوپر چل گیا تھا۔

نیلے رنگ کے لباس میں ملبوس اونچے قد و قامت میں وقار اور تمکنت کے رنگوں سے سجی، انتہائی گھنے زمین کو چھونے والے سیاہ سیدھے بالوں والی وہ لڑکی فردوس گوہر تھی۔

شاید کوئی اپسرا.....!

ایسا چہرہ نتاشا ابراہیم نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

آنکھیں چار ہوئیں اور پھر وہ طلسم وارد ہو ہی گیا.....!

نتاشا ابراہیم کے ذہن میں بس ایک ہی بات چل رہی تھی۔

ہم ٹوٹے ہوئے کو جوڑ سکتے ہیں.....ہم پیوند کو رفو کر سکتے ہیں۔ہم اندھیرے میں روشنی کر سکتے ہیں مگر.....؟

جو جڑا ہوا ہو، اسے کیسے جوڑا جائے؟
جو مکمل سلا ہوا ہو، اسے کیسے رفو کیا جائے؟
جو خود روشن ہو، اسے کیسے روشنی دی جائے؟

کیا نام تیرا نقش تھا سر روح اور
پھر روح کا میں صاحب فردا ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

نایاب جیلانی کا بہت خوبصورت نیا ناول

سلسبیل

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

اُم ایمان قاضی کا بہت خوبصورت نیا ناول

دل کانچ کا گھر

کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
مکمل ناول پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

باب سوئم

پیراسائٹ

پنجے محل پنجاں وچ چانن
باہر ہنیر اوسے
عقلاں، شکلاں، فکراں اتے
چار چفیرے ہسے
اپنے آپ توں پچھے ویکھے
اگے لگ کے نسے
نینیں گھول سمندر پیتے
مڑ تسے دے تسے
باہر وباہر حیاتی موئی
کون اندر دی دسے

پیراسائٹ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ جب تک یہ تعریف سمجھ میں آتی ہے، ہم خود بھی وہیں ان کے جھنڈ میں کھڑے ہوتے ہیں۔ رشتے، جذبات اور تعلق کھانے والے!

عدن جبار ٹھنڈے فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے سامنے موبائل فون تھا جس کی اسکرین پر دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں اور وہ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اور اس کے چہرے کے زاویے بدلتے جا رہے تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک عجیب سا بدلاؤ آتا جا رہا تھا۔ یقیناً وہ موبائل فون کی اسکرین پر لکھی گئی کوئی بات چیت پڑھ رہی تھی۔ وہ ایک بات چیت تھی جو

اسے پتا نہیں کسی عجیب دلدل میں پھنسا کر لیے جا رہی تھی اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بات پر وہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔

''ارے جان! سمجھو ناں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''کیا سمجھوں.....؟ کیا سچ کہہ رہے ہیں آپ؟ میں تھک چکی ہوں۔''

''تھکنا ہی تو نہیں ہے، یہی تو زندگی ہے، گزارو۔''

''کیسے گزاروں.....؟ کب تک ایسا چلتا رہے گا؟''

''کچھ ہی دن ہیں گزار لو ناں، کہہ رہا ہوں نا، یقین کرو۔''

''تین سالوں سے میں تمہاری باتوں کا ہی یقین کر رہی ہوں اور ہر بار تمہارے پاس میرے لیے تسلی اور دلاسوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔''

''ارے یار! ہوتا ہے نا یہی اور ویسے بھی جو جس طرح چل رہا ہے، اسے چلنے دو۔''

''ایسا کب تک چلے گا کیا چاہتے ہو تم۔ میں تمہاری پابند ہو کر رہ جاؤں اور تمہیں جب وقت ملے، تمہارے لیے حالات سازگار ہوں تو تم آ کر مجھے پرپوز کرو، مجھے قبول کرو۔ تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں تو بس صرف تمہیں چاہتا ہوں۔''

''میں تمہارے مکالموں سے بہلنے والی نہیں۔ یہ فلم نہیں ہے۔ یہ زندگی ہے۔''

''میں بھی یہی تو کہہ رہا ہوں زندگی ہے، زندگی ہی کی حقیقت کو سمجھو۔ اچھا چھوڑو، پھر ہم دوبارہ کب مل رہے ہیں؟''

''میں نہیں ملنے والی۔''

''پلیز! جان مل لو ناں!'' بے بسی بھرے لفظ تھے۔

کسی نے عدن کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

''نہیں، میں نے ایک بار کہہ دیا ناں..... میں نہیں ملوں گی۔''

''التجا کر رہا ہوں۔ مہربانی کرو، مل لو۔''

طویل خاموشی جیسے حائل رہی ہوگی، جواب کا انتظار کیا گیا ہوگا۔

کچھ دیر کے بعد جواب آیا تھا۔

عدن جبار کی نظریں اسکرین پر دیکھا ہوا وہ ٹائم نوٹ کر رہی تھیں۔

''چلو ٹھیک ہے، پھر تیئس تاریخ کو ملتے ہیں شام نو بجے امپریس ہوٹل میں۔''

ادھر سے شاید خوشی بے قابو ہوئی ہوگی۔

''چلو ٹھیک ہے، بہت شکریہ۔''

''تیئس تاریخ..... جانے کتنی تیئس تاریخیں ساتھ گزری ہوں گی اور انہیں لاعلمی ہی رہی ہوگی ہمیشہ کی طرح کہ وہ.....!''

عدن جبار کی نظریں جیسے دھندلانے لگی تھیں۔

اسے اب پتا چل رہا تھا پیراسائٹ کیا ہوتا ہے؟ پیراسائٹ کا مطلب ہوتا ہے جو دوسروں کو اپنی خوراک بناتا ہے۔ اگر انسان کیڑا بن جائے تو وہ تعلقات، جذبات اور ہر چیز کو کھانے لگتا ہے بلکہ کھا ہی جاتا ہے۔

وہ جیسے کسی عجیب دلدل میں آ کر دھنس گئی تھی اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہوگا؟

اب بھی اس تیئس تاریخ کو ایک اور شام اس کی زندگی میں بھونچال لانے کو تیار کھڑی تھی۔ لیکن وہ ایک شام صرف اسی کی زندگی میں نہیں آنے والی تھی۔ وہ تین لوگوں کو ریزہ ریزہ کرے گی۔

آہ! اس نے ساری زندگی بس اسی ایک شخصیت پر اعتبار کیا تھا۔

اور آج وہ اعتبار جیسے کرچیوں میں بٹ کر اس کے لیے فرش بن گیا تھا جس پر اس کے اپنے پاؤں زخمی ہو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

عدن جبار نے اچانک دن کے اجالے کو سلیٹی رنگ میں ڈھلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر اب بادلوں سے گھرے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ جاگنگ کے لیے آئے ہوئے اسے دو گھنٹے سے زیادہ ہو

چکے تھے اور وہ وقفے وقفے سے تھک کر بیٹھ جاتی تھی اور ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتی تھی۔ نظریں آس پاس ٹریک پر دوڑتے لوگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ بچے، بوڑھے، عورتیں سب اپنی اپنی زندگی میں مگن جاگنگ ٹریکس پر دوڑ رہے تھے۔ دو لڑکیاں پاس سے کسی رشتے کو ڈسکس کرتے ہوئے گزری تھیں۔

''ارے ہاں! مجھے بھی پتا ہے جو رشتہ آیا ہوا ہے، ان کا سارا بیک گراؤنڈ اور جو بھی باتیں ہیں، بس فائنل بات کرنے کی دیر ہے۔'' وہ اس کے سامنے سے یہی بات کرتے ہوئے تیزی سے گزر گئی تھیں۔

کچھ منچلے نوجوان اپنے اپنے ہاتھوں میں ادھ کھلے گلاب کی کلیاں تھامے فلرٹ کرنے والا انداز اپناتے ہوئے انگریزی گانوں کی عجیب وغریب دھنیں سیٹیوں کی صورت گنگناتے ہوئے گزر رہے تھے اور ان کی نظروں کا فوکس ان لڑکیوں پہ تھا جو ساتھ ہی کے کسی کالج سے تھیں اور وہاں پہ واک کرنے کے لیے چند منٹ یا گھنٹوں کے لیے آجاتی تھیں۔

ہر کوئی اپنی زندگی میں اپنے اپنے موضوعات پر بحث کرنے میں مصروف تھا۔ کچھ چھوٹے بچے فٹ بال کو ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے پھر رہے تھے۔ پارک کے بالکل آخری کنارے پر چند بطخیں ٹہل رہی تھیں اور بطخوں کی آواز دور تک پھیل رہی تھی اور وہیں اس کی نظروں نے دور چھتوں پر دوڑتے چند موروں کا بھی احاطہ کر لیا تھا۔ جن کی آواز پورے ماحول میں گونج رہی تھی۔

عدن جبار نے گہرا سانس لیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ جیسے تھکنے لگی تھی۔ اس نے اپنے بھاری ہوتے پیروں کو اٹھایا اور اپنے وجود کو ایک بینچ پر گرا لیا۔ اس کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ وہ ہاتھ میں تھامی پانی کی بوتل سے گھونٹ لیتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی اور اس کی سوچوں کی وحشت دور تک پھیل گئی تھی۔ تبھی دو موٹے سے بہن بھائی دور سے اسے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ ان کی آوازیں وہ یہاں بیٹھے بیٹھے بھی سن سکتی تھی۔ بھائی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں شاید اپنا ہی پپی تھاما ہوا تھا۔

''مجھے لگتا ہے اسے بھوک لگ رہی ہے۔''

''نہیں، اس نے دودھ پیا ہوا ہے۔''

''پھر اس کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''

''شاید اس نے کچھ اور بھی کھانا ہو۔''

''چلو، اسٹور سے کچھ خریدتے ہیں۔''

وہ عدن کے قریب سے گزرے تو وہ مسکرائی۔

''تم دونوں کا یہ پپی بہت پیارا ہے۔''

وہ دونوں کاٹ کھانے والی نظروں سے عدن کو دیکھنے لگے تھے۔

بھوک سے نڈھال پپی نے بھی اپنی چنی منی آنکھیں کھول کر جیسے عدن کو قہر بھرے انداز میں دیکھا تھا۔

''یہ کوئی پپی نہیں ہے۔ یہ نینسی ہے ہماری بلی.....!''

☆.....☆.....☆

پہاڑی علاقے کی ان ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں اور الجھے ہوئے راستوں پر چند لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو ہانکتے ہوئے لے کے جا رہے تھے۔ اردگرد کافی برف پڑ چکی تھی۔ وہ بہت اطمینان اور سکون سے دیار اور صنوبر کے جھنڈوں میں سے گزر رہی تھی۔ کبھی کبھار صنوبر اور دیار کے اونچے جھنڈوں میں سے برف کے چھوٹے چھوٹے گولے اس کے سر پر آ کر گرتے تھے اور ٹوٹ جاتے تھے۔ وہ ان کا احساس بڑی فرحت سے محسوس کرتی اور ہولے سے ہنس دیتی تھی۔

درنجف بہت سکون سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک بھیڑ اپنے دو میمنوں کے ساتھ اس کے سامنے سر جھکائے جا رہی تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے میمنے بھی آگے خود کدکڑے لگاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ وہ اپنی اس بھیڑ اور میمنوں کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ انہیں سردی گرمی اور ہر چیز سے بچا کر رکھا کرتی تھی۔ آج موسم میں ہلکی سی تبدیلی آئی تھی۔ سردی کی شدت کچھ کم ہوئی تھی تو وہ ان کو چرانے کے لیے ادھر سبزے میں لے کر آئی تھی۔ درنجف ہمیشہ کی طرح اردگرد لگے دیار اور صنوبر کے درختوں کی گنتی کرتی پھر رہی تھی۔

''ایک سو تین، ایک سو چار.....''

ایسے ہی آگے جاتے جاتے وہ پل بھر کو رکی تھی۔ ٹھٹک گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا پیچھا کرتا آ رہا تھا۔ اس نے اپنی انگلی ہونٹوں میں دبائی تھی۔ اندازہ لگایا گیا تھا کہ وہ چاپ صرف ایک انسان کی تھی جو اکثر کبھی کبھار اس کے پیچھے یوں ہی جنگل میں اس کی خبر لینے کو آ جایا کرتا تھا۔

وہ ایسے ہی گنتی پوری کرتی ایک سو پانچ، ایک سو چھ کرتی آگے بڑھ گئی تھی۔

بھیڑا اپنے چھوٹے شرارتی میمنوں کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی اور وہ بھی ایک لمبی سی لکڑی پکڑے ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ تب ہی دیار کی چوٹیوں سے ایک برف کا گولا پھر سے اس کے سر پر آ کر ٹوٹا اور وہ پھر سے کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

تب ہی اس نے مڑے بغیر اونچی آواز میں کہا تھا۔

''سرخاب خان! تم کبھی بھی اچھے تعاقب کرنے والے ثابت نہیں ہو سکو گے، میں نے پہچان لیا ہے کہ تم میرے پیچھے آ رہے ہو۔''

سرخاب خان بھی ہنس دیا تھا۔

وہ واقعی پچھلے کئی سالوں سے ہولے ہولے ہمیشہ کی طرح درنجف کا تعاقب کرتا چلا آ رہا تھا کہ اسے پتا نہیں چلے گا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ درنجف تھی۔ اسے سرخاب خان کے حوالے سے ہر ہر بات پتا تھی۔ اور یہی بات تھی جس پہ وہ فخر سے مورے کو کہا کرتی تھی۔

''مورے! پہاڑ کی کوئی عورت اپنے مرد کو اتنا نہیں جانتی ہو گی کہ جتنا درنجف سرخاب خان کو جانتی ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ میں اس شخص سے کتنا پیار کرتی ہوں۔''

مورے لکڑیاں جلاتے ہوئے اسے دھکا دیتی تھی۔

''ارے ہٹ پرے..... کیسی عجیب عجیب باتیں کرتی رہتی ہے۔ شرم ہے یا نہیں.....؟''

''اس میں شرم کی کیا بات ہے؟''

''ارے کوئی بھی عورت اپنے مرد کا نام اس طرح نہیں لیتی۔''

''تو کوئی عورت کیوں لے نام؟ وہ میرا مرد ہے، میں تو نام لوں گی۔ جو انسان کی اپنی چیز ہو، اس

کے بارے میں تو انسان بات کر ہی سکتا ہے۔"

پتھروں سے بنے اس گھر کی دیواریں آگ کی روشنی سے جگمگ کرنے لگتی تھیں۔

"مگر پہاڑ کی لڑکیاں اس طرح کی باتیں نہیں کرتیں۔"

"نہ کریں مجھے کیا لیکن میں تو سرخاب خان، سرخاب خان، سرخاب خان کہتی رہوں گی۔"

وہ تین بار اس کا نام لے کر ہنسی تھی اور مورے سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

"پتا نہیں اس لڑکی کا کیا ہوگا۔"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔"

وہ بہت اطمینان سے بستر لگا رہی تھی۔ بستر لگانے کے بعد اس نے طاقوں میں رکھے چراغ روشن کرنے شروع کر دیے تھے۔ زرد روشنی میں درنجف کا گلابی رنگ شربتی ہو گیا۔

وہیں شام کی چپ میں تڑتڑ کی آواز گونجی تھی۔ صنوبر کے پیڑ ایک سو پانچ رہ گئے۔ ایک سب سے اونچا پیڑ برف کے بوجھ سے گر پڑا تھا اور وہیں بھیڑ کا ایک میمنا برف میں دب گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ اپنی زندگی کے بارے میں کیے گئے فیصلے، وعدے یا وہ خواہشیں جن کا انہوں نے ذکر کئی سال پہلے کیا ہوتا ہے بھول جاتے ہیں۔ شاید زندگی بھی اسی کا نام ہے چل سو چل..... ہر نئے دن کے ساتھ ایک نئی شروعات انسان کی منتظر ہوتی ہے اور انسان اپنے ماضی کو کہیں گہری گپھا میں ڈال کر بھول بھال جاتا ہے اور زندگی کے رش میں گم ہو جاتا ہے۔

جمال دین کو بھی لگا تھا.....

شاید سب کو لگا تھا کہ تمکین جمال بھی اپنی خواہش کو اس ماضی کی اندھیری گپھا میں ڈال کر گم ہو جائے گی یا بھول جائے گی لیکن ان کی زندگی میں ایسا بالکل بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی زندگی اور ماحول کے ساتھ کئی جنگیں لڑتی آئی تھی۔

لڑکپن جو جوانی کی طرف جاتا ہوا شاید ایک ایسا رستہ ہوتا ہے جہاں کچھ چیزیں انسان کے لیے

http://kitaabghar.com

راسخ ہو جاتی ہیں۔اس کی سوچ، انداز وہ کہیں نہ کہیں دل میں مدھم جذبوں کی آنچ لیے اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔شاید لڑکیوں میں یہ احساس زیادہ ہو، وہ تو گڑیا گڑیا کھیلتے ہی نئے نئے سپنے سجانے لگتی ہیں اور بہت کچھ سوچ لیتی ہیں کہ انہوں نے کیسا گھر بنانا ہے۔گھر میں کتنے دریچے ہوں گے۔کتنا کھلا صحن ہوگا۔اس گھر میں کتنی کھڑکیاں ہوں گی؟اس گھر کا فرش کیسا ہوگا؟ گھر کا باورچی خانہ ہوگا تو اس کی کھڑکی کس طرف کھلتی ہوگی؟ چوبارے کی طرف جاتی سیڑھیاں کون سی ہوں گی؟ صنوبر کی ہوں گی یا پھر لوہے کی ہوں گی؟ کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں جن کو یاد رکھا جاتا ہے۔شیلف ہوگی تو فصیل کتنی ہوگی؟ یونہی زندگی گزرتی ہے۔

جس طرح ایک عمارت کی بنیاد بنتی ہے تو عورت کی زندگی کی بھی بنیاد بننا شروع ہو جاتی ہے۔ تمکین جمال نے بھی اپنی بنیادیں جوڑنا شروع کر دی تھیں۔لوگوں کو دیکھتی تھی، وہ خواب سینچتے تھے نئے آنے والے رشتوں کے اور اس کی ساتھی لڑکیاں کھسر پھسر کرتے ہوئے لڑکوں کے بارے میں باتیں کرتی تھیں۔شاید لڑکوں کے بارے میں بھی.....نہیں آئیڈیلز کے بارے میں.....! اور وہ ان کے ساتھ بیٹھی چپ چاپ جیسے کہیں آسمان کی طرف دیکھے جاتی اور سوچتی رہتی تھی۔

لڑکیاں آس پاس غول کی صورت بیٹھ کر بستوں کو ادھر ادھر رکھ کر اپنی گول میز کانفرنس ترتیب دیتی تھیں۔ان میں سے ایک لڑکی سفید کاغذ لے کے بیٹھ جاتی تھی۔ پہلے بھنویں بنائی جاتی تھیں۔ بھنوؤں کو ٹیڑھا میڑھا گہرا کیا جاتا تھا۔

''ارے ارے اسے اور تھوڑا گولائی میں بناؤ۔اس طرح کی لڑکوں کی بھنویں بہت اچھی لگتی ہیں۔''

''چلو چلو اب اس کی آنکھیں بناؤ۔''

اور پھر وہ ساری سر جوڑے آنکھیں بنانے لگ جاتی تھیں اور کوئی پندرہ منٹ میں بحث و مباحثے کے بعد آنکھیں بن جاتی تھیں۔تھوڑی دیر بعد ناک کی باری آتی تھی۔کبھی ناک گول بن جاتی تھی، کبھی پھینی اور بعد میں ستواں ناک بن جاتی تھی اور وہ ہنس ہنس کر اس کا لطف لیتی تھیں کہ وہ ایک ایسے آئیڈیل کی تصویر بنا رہی تھیں جو ان سب لڑکیوں کے لیے تھا۔شاید انہیں پتا ہی نہیں تھا ایک انار سو بیمار

والی بات تھی۔ تصویر ایک تھی، تصویر کے گرد جمگھٹا لگا کر بیٹھنے والی جانے کتنی تھیں۔

ان میں سے ایک تمکین جمال بھی تھی۔ جو ان بھنوؤں، ان آنکھوں، اس ستواں ناک، تراشیدہ ہونٹوں کی مسکراہٹ سے ہوتی ہوئی بالوں کے کالے سیاہ رنگ سے جانے کہاں پہنچ جایا کرتی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک آئیڈیل جنم لینے لگتا تھا۔ وہ جب بھی کالج کے بعد باہر سڑک پر آتی تھیں تو دور تک کھڑے لڑکوں کو دیکھ کر ایک دوسرے کو متوجہ کرتی تھیں۔

''ارے اس کو دیکھو، وہ لگ رہا ہے ناوحید مراد جیسا.....''

''ارے نہیں، یہ تو اتنا حسین نہیں ہے۔ چھوڑو اسے، کوئی اور اچھا سا ڈھونڈتی ہیں۔''

ان کی یہ مہم جاری رہی یہاں تک کہ کالج بھی ختم ہو گیا تھا اور تمکین جمال نے اپنا ایک آئیڈیل انسان تراش لیا تھا۔

ہر انسان کہیں نہ کہیں اپنی زندگی، اپنے لائف پارٹنر کے بارے میں کوئی نہ کوئی سوچ ضرور رکھتا ہے جیسے تمکین جمال نے بھی رکھ لی تھی۔

پھپھو اب اکثر چکر لگانے آتی تھیں تو وہ ابا سے اس کی شادی کی باتیں کیا کرتی تھیں۔

''جمال! تمہاری بیٹی بڑی ہو گئی ہے اس کے بارے میں اب تم نے کیا سوچا ہے؟''

ابا ہاتھ ملتے ہوئے بس انہیں دیکھے جاتے تھے۔

''ارے! ابھی تو وہ چھوٹی ہے اور اسے پڑھنا بھی ہے۔''

''ارے بھائی! چھوٹی کیسے ہوئی۔ کالج میں پڑھ رہی ہے، ابھی تک چھوٹی ہے۔'' پھپھو کو تاؤ آ جاتا تھا۔ اور وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ پرچ میں پٹخ دیتی تھیں۔ طبل جنگ بجتا اور ہیروشیما ناگاساکی والا حال ہوتا تھا۔

وہ اپنے پودوں کی کیاریوں کے پاس بیٹھ کر کھرپی لیے ان کی گوڈی کیے جاتی تھی اور اندر ہونے والی بحث سنتی رہتی تھی۔

''اصل میں بات یہ ہے آپا، کہ میں اسے آگے پڑھانا چاہتا ہوں۔''

''اے لو! دیکھو، کیا زمانہ آ گیا ہے کہ بن ماں کی لڑکی کو آگے پڑھایا جائے گا۔ ارے، میں تو کہتی ہوں رہنے دو، کون سا اس نے آگے جا کے افسر لگ جانا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا، رشتہ کرو، اور فارغ کرو بس۔ تم کیوں جان جوکھم میں ڈالتے ہو۔''

''ارے نہیں آپا! اسے پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔''

''اے لو، بیٹی نے جو کہا، باپ نے وہی لکیر سمجھ لیا۔ آج کل کا دور بہت مختلف ہے۔ لڑکی ذات ہے، بن ماں کی بچی ہے تو کب تک یہ بوجھ ڈھوتے پھرو گے۔ بس فارغ کرو کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کے..... میں کسی وچولن کو پکڑتی ہوں اور کہتی ہوں کہ تمکین کے لیے کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈے۔''

ابا بے چارے دل مسوس کے ٹھنڈی چائے کی چسکیاں لیتے رہتے تھے اور آپا کے ساتھ ان کے سسرال کے ہنگاموں کے بارے میں باتیں کرتے تھے جو کبھی ختم بھی نہیں ہوتے تھے اور تمکین کھرپی تھامے گوڈی کرتے ہوئے سوچے جاتی۔

''کیا ابا اپنے وعدے سے مکر جائیں گے؟ کیا ہو گا.....؟ پتا نہیں ابا کیا کرتے ہیں میرے ساتھ؟ انہوں نے کہا تھا کہ میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ کہیں ابا اپنا وعدہ بھول تو نہیں گئے۔''

سوچیں جیسے خون آشام بھیڑیوں کی طرح اس کے خوابوں اور خواہشوں کو ماضی کی گپھا میں ہی دفن کرنے کے درپیش تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ شام بہت اداس اور دلگیر تھی۔ آتش دان میں ساری شام رات ڈھلے تک لکڑیاں جلتی رہی تھیں اور وہ اپنی بھیڑ اور اس کے چھوٹے سے میمنے کو اپنے ساتھ لگائے بس روتی رہی تھی۔ رونے کی وجہ سے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ مورے اور سرخاب خان اسے تسلیاں، دلاسے دے دے کر تھک چکے تھے مگر وہ بالکل بھی چپ نہیں ہو رہی تھی۔ مورے نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''بس کر دو در نجف! سب ٹھیک ہو جائے گا، میں تمہیں اور بھیڑ دلا دوں گی۔''

''مجھے اور بھیڑ نہیں چاہیے، مجھے وہی بچہ چاہیے۔ اب میری بھیڑ کی اداسی کیسے ختم ہو گی؟''

سرخاب خان نے اسے غور سے دیکھا تھا۔اسے اپنی بھیڑ کی اداسی کا غم کھا رہا تھا۔سرخاب کو وہ پچھلے تین سالوں والی درنجف یاد آئی تھی جو یکے بعد دیگرے اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد ان کے پاس رہنے آئی تھی اور سارا سارا دن چپ رہتی تھی۔کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا جیسے اس لڑکی کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔تب بس اسے ایک ہی کام آتا تھا،آتش دان میں سلگتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھتے رہنا، چپ چاپ بیٹھے رہنا۔آہستہ آہستہ بہت بعد میں جا کر وہ کچھ ماحول میں گھلنا ملنا شروع ہوئی تھی۔

جیسے ہی اس کے ماں باپ کی وفات ہوئی تھی تو مورے نے ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیا تھا۔وہ آپس میں رشتہ دار تھے۔ابھی باقاعدہ ایسی رخصتی تو نہیں ہوئی تھی لیکن مورے نے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔کسی کو اس بات پر اعتراض بھی نہیں ہوا تھا،اس نے بہت جتن کیے تھے کہ درنجف کا تب دھیان بھٹک جائے۔ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہی تھی۔

اس کے بعد اگر اس کے روزمرہ کے معمول میں اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو وہ دیار اور صنوبر کے جنگلوں میں نکل جاتی تھی اور ان پیڑوں کی گنتی کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔جب بھی مورے اور سرخاب نے اسے ڈھونڈنا ہوتا تھا تو وہ وہیں جنگلوں میں ہی ملا کرتی تھی۔بس اس کے یہی مشغلے تھے۔پھر آہستہ آہستہ جب کافی وقت گزرتا گیا تو مورے اس کے لیے ایک بھیڑ لے آئی تھی تو وہ بہت جلد اس بھیڑ کے ساتھ مانوس ہوگئی تھی۔

اسے چارا ڈالنا،اس کا خیال رکھنا،سردی گرمی میں اس کو ڈھانپے رکھنا۔اس کا دل جیسے لگ چکا تھا تو وقت کے ساتھ ساتھ وہ پھر بہت خوش رہنا شروع ہوگئی تھی۔

مورے نے اسے گھر کے کافی کام کاج بھی سکھا دیے تھے۔

سرخاب لاہور جیسے شہر میں پڑھ رہا تھا۔جیسے ہی اس کی یونیورسٹی کی لاہور کی پڑھائی شروع ہوئی تھی تو وہ بس چھ چھ مہینے بعد ہی چکر لگایا کرتا تھا۔ان چھ مہینوں کے بعد ایک مہینے والی چھٹیوں میں ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے تھے تو ان میں بات چیت ہونا شروع ہوگئی تھی۔کبھی کبھی دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف نکل جاتے تھے۔

''سنو! لاہور کیسا ہے اور وہ یونیورسٹی کیسی ہے جہاں تم پڑھتے ہو؟''

ٹھنڈی ہواؤں میں سرخاب کے پرفیوم کی خوشبو در نجف کو جیسے مسحور کرنے لگتی تھی۔ ان دونوں کا آپس میں شرعی رشتہ تھا جس کی کشش وہ اپنے دل میں محسوس کرنے لگتی تھی۔ وہ سامنے بیٹھے شخص کو چوری چوری دیکھتی تھی۔

بھورے بال، چوڑی پیشانی اور دلکش مسکراہٹ کتنی سجتی تھی اس کے چہرے پر.....

''لاہور کو پاکستان کا دل کہا جاتا ہے اور تمہیں پتا ہے دل کیسا ہوتا ہے۔''

''کیسا ہوتا ہے؟''

''بہت عزیز ہوتا ہے۔ لاہور بہت اچھا شہر ہے۔''

''وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟''

''وہاں کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں مختلف علاقوں سے لوگ پڑھنے آتے ہیں تو ہر کوئی اپنی الگ شناخت لے کر آتا ہے۔ لیکن جس انسان پہ لاہور کی چھاپ پڑ جائے تو وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتا ہے۔''

سرخاب اسے شہر کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ وہاں کے کیفے، چائے خانے کی، سڑکوں کی، مال روڈ کی اور ان اونچی اونچی عمارتوں کی اور وہ آنکھوں میں شوق بھرے اسے ہمیشہ سے سنا کرتی تھی۔ اور جب وہ اسے وہاں کے کھانوں کی باتیں بتایا کرتا تھا اور لڑکیوں کے فیشن کی تو آنکھیں کھول کر اسے دیکھا کرتی تھی۔

''ہائے سرخاب خان! تمہاری تو موجیں لگ گئیں، تم لڑکیوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور پڑھتے ہو۔''

''ہاں تو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''یہاں تو یہ سوچنا ہی معیوب بات ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے بیٹھ جائیں پھر پڑھنا تو دور کی بات ہے۔''

وہ اپنے فون میں لاہور کی تصویریں بھر کے لے آتا تھا تو وہ دونوں آتش دان کے پاس بیٹھ کر دیکھا کرتے تھے۔

''یہ بادشاہی مسجد ہے۔ یہ ہماری یونیورسٹی کا پی سی ڈھابا ہے جہاں باہر سے لوگ کھانا کھانے آتے ہیں۔ ورزش کرنے والا جم بھی ہے، فنکشن بھی ہوتے ہیں، لوگ رقص کرتے ہیں۔''

وہ الف لیلوی داستانیں تھیں جو وہ درنجف کو سنایا کرتا تھا اور وہ پتلیاں جھپکے بغیر سنا کرتی تھی۔

کبھی کبھار درنجف کو اپنی سہیلی گلے کی بات یاد آجاتی تھی۔

''شہروں میں لڑکے لڑکیاں محبتیں کرتے ہیں۔ جامعہ میں ہی ایک دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں شادیاں بھی کر لیتے ہیں کیا پتا سرخاب کو بھی کوئی شہری لڑکی پسند کر لے۔''

گلے نے اس کے دل میں وہم کا بیج بویا تھا۔ وہ بولائی بولائی سی پھرتی تھی۔ جنگل جاتی تھی تو دیار کی گنتی بھول جاتی تھی۔

پھر عید کی چھٹیوں میں وہ آیا تو معمول کے مطابق وہ اسے لاہور کی تصویری سیر کروا رہا تھا جب وہ اخروٹ کا حلوہ بھونتے ہوئے سادگی میں اسے کہہ گئی تھی۔

''سنو سرخاب!''

''ہاں بولو۔''

دھواں اٹھنے لگا۔ باہر کہیں برف کا تودہ گرنے کی آواز بھی آئی تھی۔

''تمہیں شہر میں کوئی یونیورسٹی کی لڑکی اچھی لگے تو اسے پسند کر لینا۔''

☆.....☆.....☆

''سیرت! ہم کہے دیتے ہیں کہ آج کے بعد ہم کبھی بھی تمہارے ساتھ خریداری کرنے کو نہیں نکلیں گے۔''

''ارے پوپلی بوا! کیا بات کرتی ہیں۔ اگر آپ میرے ساتھ نہیں آئیں گی تو میں کس کے ساتھ خریداری کروں گی؟''

''تم نے ضرور بوڑھی ہڈیوں کو خوار کرنا ہوتا ہے۔''

''ارے بوا! آپ بھی کبھی بوڑھی ہو سکتی ہیں..... کبھی بھی نہیں۔ آپ تو ہمیشہ جوان رہیں گی۔''

وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

پچھلے تین گھنٹوں سے سیرت امتیاز کے ساتھ بازاروں میں خوار ہو رہی تھیں۔ سیرت کی جانے کون سی خریداری تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اور ہمیشہ سے یہی ہوتا تھا کہ جب بھی سیرت بازار جانے اور کچھ خریداری کرنے کا نام لیتی تو پوپلی بوا کے دل کو ہول اٹھنے لگ جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ ہی اسکول نہ جانے والے نالائق بچوں کی طرح مختلف قسم کے بہانے ڈھونڈنے کی تلاش میں رہتی تھیں۔

''ارے نہ بھئی سیرت! ہم سے تو نہیں جایا جائے گا۔ ہمارا بی پی بڑا مسئلہ کر رہا ہے۔''

''میں ابھی چیک کرتی ہوں کہ آپ کے بی پی کو کیا ہوا؟'' وہ پریشان ہو کر ان کی طرف آئی تھی۔

''ارے رہنے دو۔ ابھی دوائی کھاؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''ہاں ہاں! اپنی بی پی کی دوائیں لیں اور پھر ہم بازار چلیں گے۔''

کبھی بی پی ہائی ہو جاتا تھا، کبھی شوگر لیول اتنا بڑھ جاتا تھا۔ پتا نہیں بوا ہمیشہ ایسا کیوں کرتی تھیں کہ وہ اس کے ساتھ بازار کا رخ نہ ہی کریں، کیونکہ کبھی کبھی انہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ خریداری ان کے لیے ہی کرتی تھی۔ ان کے لیے کبھی گرم کپڑے لے لیے، کبھی پوپلی بوا کے لیے شال لے لی۔ ان کی عینک کا نمبر بڑھ جاتا تھا تو وہ کبھی ڈاکٹر سے چیک کروا کر عینک تبدیل کروانا بھی اسی کے ذمہ تھا۔

پوپلی بوا کو لگتا تھا کہ جیسے سیرت ان کی ذمہ داری نہیں تھی بلکہ وہ اس کی ذمہ داری تھیں جو احسن طریقے سے کئی سالوں سے نبھا رہی تھی۔ کبھی کبھی انہیں بڑا اس پہ ترس آ جاتا تھا ایک ہی باپ کی اولادیں تھیں مگر زندگی کے چکر میں ہر کوئی اپنی باری پر پس رہا تھا۔

اب بھی وہ پچھلے تین گھنٹوں سے اس کے ساتھ بازاروں میں گھوم پھر رہی تھیں اور وہ نا جانے کیا الم غلم خرید رہی تھی۔

''بس بھی کر دو سیرت! اور کتنا کچھ خریدو گی۔ چلو شام ڈھلنے کو ہے، گھر چلتے ہیں۔ آیت بی بی غصہ ہوں گی۔''

''آپ کو آیت کی بڑی پروا ہے، میری کوئی پروا نہیں۔''

وہ وہیں کھڑی ہوگئی تھی۔ ادھر روڈ کے درمیان ہی اور اکثر وہ جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

''ہمیشہ میرے ساتھ ناانصافی ہی ہوتی رہی ہے۔ پہلے ابا کم تھے ناانصافی کرنے والے جواب پوپلی بوا آپ بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہوگئی ہیں۔ میں تو ایسے ہی ہواؤں میں اڑتی خوش ہوتی پھر رہی تھی کہ پوپلی بوا میرے ساتھ ہیں تو مجھے کسی چیز کی فکر نہیں ہے مگر شاید میں غلط تھی۔''

سڑک کے بیچوں بیچ ان دونوں کا میلوڈرامہ چل رہا تھا۔ چھتریاں بیچنے والا اپنی مسکراہٹ روکے کھڑا تھا۔

''تم نکال لو پہلے دندیاں..... دانت اندر کرو۔''

''ارے! کیا اول فول بکے جارہی ہو، چلو جو خریدنا ہے، خرید لو تمہاری پوپلی بوا ہے تمہارے ساتھ۔''

آخر سیرت کی اداکاری اپنے عروج پر تھی اور ان کو ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بازار کی تنگ گنجان گلیوں میں خریداری کرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ کہیں سے اس نے بیسن لیا تھا کہیں سے اس نے سلینڈر بھروایا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ایک علیحدہ گیس سلینڈر رکھتی تھی کبھی مرضی کا کچھ پکانے کا دل کیا تو پکا لیا۔

وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اس کے اپنے ہی مشغلے اور شوق تھے۔ اس نے زندگی میں کبھی بھی کسی پر انحصار کرنا نہیں سیکھا تھا۔ صابن، سرف، پرفیوم، سرسوں کا تیل، ڈھیر سارے رنگ برنگے چارٹس کا ڈھیر خریدتی ہوئی وہ فروٹ چاٹ کی ریڑھی کے پاس رک گئی تھی۔

''بوا! چاٹ کھائیں گی؟''

بوا دہل گئی تھیں۔

''ناں ناں میری بچی! تم ہی کھاؤ بس۔''

وہ ہنستے ہنستے کھانے لگی تھی۔ ریڑھی والے کو پیسے واپس پکڑا کر اس نے پرس کے اندر جھانکا تھا۔

http://kitaabghar.com

چند نوٹ اور کچھ سکے جھانک رہے تھے۔ جھکا سر آسمان کی طرف اٹھا تھا۔ بوا کا ہاتھ پکڑے سڑکیں پار کرتی ہوئی سیرت امتیاز کو عجب انداز سے خود پر ترس آیا تھا۔

پوپلی بوا کو یاد آیا۔

''ارے تم آج پھر اپنے موزے خریدنا بھول گئیں.....''

☆.....☆.....☆

برتنوں کے شوکیس کے سامنے کھڑے ہو کر عدن جبار نے برتنوں کے اس چینی کے سیٹ کو بہت غور سے دیکھا تھا اور اس کے پیس گننے کی کوشش کی تھی۔ وہ مکمل بہتر پیس کا ایک چینی کا سیٹ تھا جو مسز جبار شاید اپنے جہیز میں لائی تھیں۔ وہ خود ایک امیر کبیر ملکوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں لیکن ان کا سب سے بڑا جرم ان کا کم تعلیم یافتہ ہونا تھا اور شہر کی ہائی سوسائٹی میں خود کو کمفرٹیبل نہ کر پانا تھا۔ اسی بات کا طعنہ مسٹر جبار اکثر انہیں دیا کرتے تھے۔

''تمہیں آتا ہی کیا ہے۔ تمہیں کیا پتا باہر اٹھنا بیٹھنا کیسے ہے، کھانا پینا کیسے ہے، پہننا اوڑھنا کسے کہتے ہیں۔ تم جیسی گاؤں کی گنوار عورتوں کو اور آتا ہی کیا ہے، صرف اور صرف میک اپ تھوپ کے اور سونے کے زیورات سے لد کر غریب ملازموں اور مزارعوں کے درمیان شیخیاں بگھارنا..... زندگی گزارنا، لائف اسٹائل کو اپنانا کیا ہوتا ہے، تم کبھی نہ سمجھو گی۔''

ہمیشہ اس گھر میں صبح کا آغاز ان دونوں کے جھگڑے سے ہوتا تھا۔ وہ کوئی نہ کوئی شعلہ اچھال کر سکون سے ڈان اخبار کے صفحات پلٹنے لگتے تھے اور مسز جبار اپنا دل مسوس کر رہ جاتی تھیں۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو جواب دینا سیکھ لیا تھا۔ اس سب میں اگر کوئی پس رہا تھا تو وہ عدن جبار تھی جس کے صبر کا پیمانہ اب آہستہ آہستہ لبریز ہو رہا تھا۔

پچھلے سارے واقعات ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے برتنوں کے شوکیس کے پاس کھڑی تھی۔ نجانے اس کے دل میں کیا آیا اس نے اچانک سے شوکیس کے شیشے کو دائیں طرف دھکیل کر دو چینی کی پلیٹیں اٹھائی تھیں۔

وہ چینی کی پلیٹ پر ابھرے ہوئے ان پھولوں کو دیکھتی رہی۔ وہ بہت خوب صورت ڈیزائن تھا جو پرانے زمانے میں کاری گر بنایا کرتے تھے۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ابھر آیا تھا اور اس نے چینی کی پلیٹ کو اوپر لے جا کر اچانک فرش کی طرف چھوڑ دیا تھا۔ ایک آواز سارے میں گونجی تھی اور پلیٹ کی کرچیاں دور تک فرش پر پھیل گئی تھیں۔ تب ہی اس نے دوسری پلیٹ اٹھائی تھی اور اس نے اس کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ شاید اسے ایک طرح سے مزا آنے لگا تھا۔ جب تک ملازمہ پہنچی تھی تو فرش سارا کرچیوں سے بھر چکا تھا۔ اور وہیں عدن جبار بہت مکمل اطمینان کے ساتھ اپنے بازو باندھے سکون سے ملازمہ کو دیکھ رہی تھی۔

''بی بی جی! یہ کیا ہوا ہے؟'' ملازمہ کے چہرے پر خوف تھا۔

''کچھ نہیں.....!''

وہ چیزیں توڑتی رہتی تھی کہ شور جاگ اٹھے کہ کہیں کچھ ہوا ہے۔

وہ اطمینان سے باہر نکل گئی تھی تب ہی باہر کچن کی کھڑکی سے بلی کود کر اندر آئی تھی.....!

اس گھر میں سب ٹوٹتا تھا۔ کانچ، خوشبو اور دل.....!

مگر صرف اس ملازمہ کو پتا تھا کہ برتنوں کے ٹوٹنے کے پیچھے بلی نہیں تھی۔ ایک ہی وجہ تھی اور وہ عدن جبار تھی جو اپنی طرف متوجہ کروانے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرتی تھی۔

مسز جبار جو کہ بڑے شہروں کے ہائی فائی لائف اسٹائلز کی دوڑ میں مگن تھیں اگر ان کو ان کی روٹین سے کوئی ہٹا سکتا تھا اور اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا تو وہ صرف عدن جبار تھی۔ جو اپنے ماں باپ کی پسندیدہ چیزوں کو توڑ کر اور انہیں ان کے معمول سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن اب سیکھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سیرت اور پوپلی بوا جب گھر میں داخل ہوئی تھیں تو شام سرک کر منڈیروں پر بیٹھ گئی تھی۔ توتوں نے سیرت کی واپسی پر معمول کے مطابق اسے خوش آمدید کہا تھا۔ وہیں آیت برآمدے میں ادھر ادھر جلے پاؤں کی بلی کی طرح ٹہل رہی تھی۔

''بوا! یہ کوئی وقت ہے واپسی کا؟'' وہ ڈائریکٹ بوا سے ہی مخاطب ہوئی تھی۔

''ارے بٹیا! بلا کا رش تھا تو بوڑھی ہڈیاں لحظہ لحظہ تھکن میں مبتلا ہو جاتی تھیں اور چند گھڑی کو ستانے رکنا ہی پڑتا تھا۔'' بوا اپنے تخت پر ڈھیر ہوئی تھیں۔

وہ اب سیرت کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی.....

تو یعنی کہ اسے سیرت سے ہی مسئلہ تھا۔

''تم نے ابا سے کیا کہا ہے؟''

وہ چونکی تھی اور سر اٹھا کر آیت کی آنکھوں میں جھانکا تھا جن میں سے شرارے جل بجھ رہے تھے۔

''کیا کہا ہے؟''

''کہ تم آگے یونیورسٹی میں داخلہ لے رہی ہو۔''

سیرت کچھ لمحے تو چپ ہی رہی تھی۔ زندگی کو بھی بس وہ ہی ملی تھی کہ مسئلے ڈھیر کرتی جائے۔

''ہاں تو.....؟''

شام نے برآمدے کے پلر پکڑ لیے تھے۔

کچن سے پیاز سڑنے کی باس ماحول پر حاوی ہوگئی۔

''کسی کو بھی بتانا تم نے گوارا نہیں کیا اور خود ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔''

سیرت کو زور کی ہنسی آئی تھی۔

''کیا لطیفہ ہو تم لوگ، میں جو کچھ کھاؤں پیوں، کہیں آؤں جاؤں، سب کچھ تمہیں بتاؤں؟ میں نے تو تم لوگوں سے کبھی کوئی باز پرس نہیں کی۔''

آیت کی خوب صورت آنکھوں میں لالی ابھر آئی تھی۔

وہ تیکھے نقوش کی دلکش لڑکی تھی۔ بحث و مباحثے میں اس کے چہرے کے رنگ دیکھنے والے ہوتے تھے۔

''ہم تمہیں جواب دہ نہیں ہیں۔''

وہ ہولے ہولے چلتے توتوں کے پنجروں کے پاس آ گئی تھی۔

''میاں مٹھو نے چوری کھائی.....آں آں آں.....!''

پوپلی بوا وضو کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ وہ اس جنگ وجدل سے وحشت میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔

''سنو!'' آیت کے لیے صبر آخری چیز بچتی تھی جو وہ کر لیا کرتی تھی۔ ''داخلے کے پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

''وہ میرے بیگ میں رکھے ہیں۔ ابا نے بھیجے تھے چوری۔ میں نے بینک سے نکلوا لیے۔''

آیت دوڑ کر تخت کے ساتھ پڑی آبنوسی میز پر پڑے سیرت کے بیگ کی طرف لپکی تھی۔ وہ بیگ میز پر الٹ دیا گیا تھا۔ شام نے چپکے سے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ سکے میز سے گر کر فرش پر اچھلتے گئے اور چند مڑے تڑے ہوئے نوٹ تھے۔

سیرت نیچے جھکی تھی اور فرش سے سکے چنتی رہی، پھر آیت کو ترحم بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

''ہر انسان کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ تم لوگوں کی حرص ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم سب لوگ حرص کی موت مرو گے۔ رہی بات داخلے کے پیسوں کی تو.....'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ اپنا سامان اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی، پلٹ کر سوتیلی بہن کا چہرہ دیکھا۔

''چلو، بات پوری کر ہی دیتی ہوں تاکہ تم آج رات سکون کی نیند تو سو سکو۔ میرے پاس امی کے کچھ زیور ہیں وہی کافی ہیں میرے لیے..... بے فکر رہو تمہارے باپ سے مانگنے نہیں آؤں گی اور ہاں.....''

آیت کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جانے کون کون سے احساسات اسے بوجھل کر گئے تھے۔

''تمہاری ہنڈیا جل گئی ہے۔''

☆.....☆.....☆

موسموں نے طوفانی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ رات سے کئی بار دیار کے پیڑوں کی چوٹیاں جب برف سے لد جاتی تھیں تو وہ ٹوٹ کر زمین پر آن گرتے تھے۔

پچھلے ایک ہفتے سے جب وہ گھر چھٹی آیا ہوا تھا تو مسلسل برف باری ہو رہی تھی۔ گھر کے سامنے

والا رستہ برف سے چھپ گیا تھا۔ مورے شہد والا قہوہ بنانے میں لگی تھیں۔ گھر کی چمنیوں سے کڑوا کسیلا دھواں فضا میں غائب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں چھتریاں تھامے برف صاف کر رہے تھے۔

''میں نے تمہیں ایک بات بتانی تھی۔''

وہ ایک لمحے کے لیے جیسے خوف میں مبتلا ہوا تھا کہ جانے وہ کیسا محسوس کرے مگر اسے ہر ہر بات درنجف کے گوش گزار کرنی ہی ہوتی تھی۔

''ہاں تو بتاؤ۔'' درنجف کو حیرت ہوئی تھی ایسے تو وہ کبھی بھی بات شروع کرنے سے پہلے کوئی تمہید نہیں باندھتا تھا۔ جانے آج ایسی کیا بات ہو گئی تھی۔

''وہ.....''

''وہ کیا.....؟'' وہ چھڑی روک کر کھڑی ہو گئی تھی، خشک اور سرد ہوائیں ناک کی پھننگ کو چھو کے گزر رہی تھیں تو وجود میں گدگدی سا احساس ہوتا تھا۔

''مجھے ایک لڑکی ملی یونیورسٹی میں.....''

''تو پھر کیا ہوا سرخاب؟'' دل کی دھڑکنوں میں سونامی آ گیا تھا مگر اس نے ہونٹوں کے کھیت پر مسکراہٹ کی فصل کاشت کر ہی لی تھی۔

''وہ میرا پیچھا کرتی ہے۔ ہم اچانک آرکیالوجی کے کوریڈور میں آمنے سامنے ہو گئے تھے۔ تب شاید مٹی کے برتن بنانے کی کوئی ورکشاپ چل رہی تھی تو میں اس سے ٹکرا گیا۔'' سرخاب خان کو لگا تھا جیسے وہ کوریڈور آس پاس پھر سے زندہ ہو گیا ہے اور صنوبر کی چوٹیوں سے وہی دو آنکھیں جھانک رہی ہیں۔ گم صم، لٹی پٹی، خاموش، مسحور.....

''آگے بھی تو بتاؤ۔'' درنجف کو چڑ تھی کہ کہانیوں کو تجسس کے وقت روک لیا جائے۔

''میری ٹکر سے اس کا مٹی کا وہ چھوٹا سا برتن ٹوٹ گیا جو وہ سب سے بچاتے ہوئے اپنی ہتھیلی پر رکھے گھوم رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں اس کے پیچھے پیچھے تھیں، اس نے وہ ان سے بچا لیا تھا مگر وہ مجھ سے نہ بچ سکا تھا۔''

http://kitaabghar.com

سیرت امتیاز جیسے اب بھی فرش سے وہ مٹی کا لوتھڑا اٹھا رہی تھی۔

''وہ کیا تھا برتن؟''

''ایک چھوٹی سی صراحی۔''

یوں لگا تھا درختوں کی چوٹیوں پر برف پگھلنے لگی ہو۔

اندر سے مورے کی آواز آئی تھی۔

''قہوہ تیار ہے۔'' شہد کی خوشبو اور دھوئیں نے سب قابو میں لے لیا تھا۔

''پھر کیا ہوا، آگے بتاؤ ناں۔''

''پھر ہم پنجاب یونیورسٹی کے ایس ٹی سی میں ملے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھا، جب اس نے مجھے بھورے بالوں والے لڑکے کہہ کر بلایا تھا۔ اس شام شاید اس کی سالگرہ تھی۔ اس کے ہاتھ پر ننھا منھا سا کپ کیک تھا جس پر موم بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ مجھ سے ایک ہی سوال کرتی ہے۔''

درنجف نے مشکل سے سانس لیا تھا۔

''کون سا سوال تھا وہ؟''

''وہ پوچھتی ہے کہ تم لمحوں کی واردات پر یقین رکھتے ہو کیا؟''

''تم نے پھر کیا جواب دیا؟''

وہ دونوں اندر آ گئے تھے۔ قہوے کے کپ تھامے کھسر پھسر کرتے ہوئے۔ مورے نے حیران ہو کر انہیں دیکھا تھا جیسے ملک سنبھالنے کی ساری ذمہ داریاں انہی دونوں پر تھیں۔

''میں نے کہا میں حقیقتوں میں رہنے کا عادی ہوں۔''

سڑک سڑک قہوہ پیتا ہوا وہ درنجف کو بہت پیارا لگا تھا۔

''اور تمہاری حقیقت کیا ہے؟''

مورے اور درنجف دونوں اس کے جواب کی منتظر تھیں۔

''تم.....!''

☆.....☆.....☆

مسز جبار سر پکڑ کر ایک طرف بیٹھی تھیں۔ چہرے پر کافی تناؤ کی سی کیفیت تھی جیسے کوئی بہت بڑی جنگ ہار کے بیٹھی ہوں۔ لٹی پٹی سی حالت..... کیوٹکس سے سجے ہاتھ، ہاتھوں کی انگلی میں چمکتی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی اور ایک ڈیزائنر ویئر میں ملبوس وہ اپنے سرکل میں تیزی سے گروم ہوتی ہوئی پرسنالٹی سمجھی جاتی تھیں مگر سامنے بیٹھا شخص جوان کے شوہر کے عہدے پر فائز تھا، وہ اچھے سے ان کے حوصلے کی عمارت کو ڈھیر کرنا جانتا تھا۔

''اور کتنا تھکو گی کشمالہ بیگم! آخر کتنا؟ میرے معیار تک آتے آتے تمہیں صدیاں لگ جائیں گی، شاید وہ بھی ختم ہو جائیں۔''

وہ طنز بھرا لہجہ..... استہزائیہ قہقہے.....

وہ ملکوں کی حویلی کی سب سے شاندار لڑکی تھیں جس کے ناز و انداز اور پہناووں کی سارے ملکوں میں دھوم تھی۔ یہاں جانے انہیں کس کس کسوٹی پہ پرکھا گیا تھا کہ ٹکے جتنا بھاؤ بھی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے خود ہی اپنے واسطے میدان تیار کر لیا تھا۔

اپنے آپ کو بدلنے کی کوششیں تیز کر دیں۔

ٹیبل مینرز، لباس، نشست و برخاست اور کچھ انگریزی جملے جو گفتگو میں شامل کر کے آپ تھوڑے بہت ہائی فائی لگ سکتے ہیں۔

چاٹی کی لسی پینے والی اب کافی زہر مار کرتی تھی۔

وہ جو حویلی کی غلام گردشوں میں پازیبوں کی جھنکار سے شاداں و فرحاں پھرا کرتی تھیں کہ یہ شور کانوں کو بھلا لگتا ہے، اب اونچی ہائی ہیل سے پاؤں سوج جاتے تھے۔ ہر شام نیم گرم پانی کے ٹب میں پیر ڈالے آنکھیں موندے وہ ماضی کو سوچے جاتی تھیں۔

''میں نے بھی کیا خسارے کا سودا مول لیا کہ جہاں سب کچھ بے وزن اور بے معنی ہے۔''

پہلے کچھ کم پھر بعد میں وہ عدن جبار، اپنی بیٹی سے بھی بگاڑ بیٹھی تھیں۔ وہ اپنے باپ کی شیدائی تھی۔ ماں کو دیکھ کر دونوں باپ بیٹی ہنستے تھے۔

''ماں! آپ رہنے دیں۔ کیوں تھکاتی ہیں خود کو۔''

وہ واقعی تھک رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے، آئینے کے سامنے گالوں پر کئی آنسو چپ چاپ لڑھک جاتے تھے۔ ٹشو پیپر کے ڈبے ختم ہونے لگتے۔ پھر ضد نے حاوی ہو کر ان سے آنسو بہانے کا وقت بھی چھین لیا۔ وہ مشین کی مانند چل پڑی تھیں۔

گیدرنگز، پارلرز، جم اور ایونٹس.....

سب کچھ نظر انداز ہونے لگا تھا۔

مسٹر جبار، گھر اور پھر عدن جبار بھی.....!

جب دونوں نے پیر رکھ کر اکھاڑے میں کھیل شروع کر دیا تو وہیں عدن جبار نے اپنی فطرت کو ڈھونڈ لیا۔

وہ آج کی جنریشن کی لڑکی تھی۔ پرفیکشن کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی ہوئی..... پسند کے کپڑے، پسند کے لوگ، پسند کی کافی، کپ بھی، پرفیوم کلیکشن، برانڈز اور دوستوں میں خاص طور پر خلیل..... جو مسٹر جبار کے بہترین دوست کا بیٹا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ دونوں کے پلان اکٹھے بنتے تھے۔

ایمپوریم شاپنگ کرنے جانا ہو یا پھر فورٹریس..... کبھی لاہور میوزک میٹ اور کبھی فیض فیسٹیول کی ڈرم پرفارمنس..... گلوریا جینز کی کافی پر جدید رجحانات کی بحث کا طوفان..... سینما میں لگنے والی نئی فلمز کا دونوں اکٹھا ٹکٹ خریدتے تھے۔ فلم دیکھتے دیکھتے وہ اس کے کندھے پر آدھی نیند بھی پوری کر لیتی تھی۔

''تم اس لیے فلم دیکھنے آتی ہو؟''

''تو کیا ہوا پھر؟'' اس کے اطمینان میں ذرا برابر بھی فرق نہ آتا۔

''میں تمہارا تکیہ نہیں ہوں عدن جبار!''

''ہاں تم تو تکیے سے کہیں بڑھ کر ہو۔''

فلم کے اختتام پر سینما کی پارکنگ کی طرف آتے وہ پاپ کارن اچھال اچھال کر کھا رہے ہوتے تھے۔

''بتاؤ پھر موڈ ٹھیک ہوا یا نہیں؟''

''ہاں کچھ بہتر ہوں۔'' وہ کھل کر سانس لے رہی تھی۔ جب بھی گھر میں والدین کا جھگڑا ہوتا تھا تو وہ ڈپریشن کے دوروں کا شکار ہو جاتی تھی۔

''اب تک تو تمہیں عادی ہو جانا چاہیے یار!''

''خاک عادی ہو جاؤں یار! کبھی اتنی خاموشی کہ سوئی گرنے تک کی بھی آواز سنائی دے اور کبھی اتنا شور شرابا کہ بس.....''

''تو جیسا ہے چلنے دو، تم کیوں ہائپر ہوتی ہو؟'' وہ ہمیشہ اس کو سمجھایا کرتا تھا، وہ سمجھ جایا کرتی تھی۔

''یار! میں بھی چاہتی ہوں کہ ایک فیملی والا ماحول ہو، ہم کھانے کی میز پر اکٹھے ہوں، کہیں آؤٹنگ پر جائیں مگر ان دونوں کی جنگ ہی ختم نہیں ہوتی۔''

اب وہ آئس کریم کونز تھامے تارکول کی سڑک پر چل پھر رہے تھے۔

''اچھا چھوڑو..... یہ بتاؤ آگے ایڈمیشن کا کیا سوچا؟'' وہ اپنے بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ وہ جب بھی ایسے کرتی تھی خلیل بہت پر جوش ہو کر اسے دیکھا کرتا تھا۔ وہ بہت ایٹی کیٹس اور اداوالی لڑکی تھی جس کی اسکولنگ لاہور کے اچھے اداروں میں ہوئی تھی۔

''ہاں! اپلائی کروں گی۔ ماس کمیونیکیشن کا سوچ رہی ہوں۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے ٹہلتے رہے۔ آئس کریم کونز اور سڑک ایک ساتھ ختم ہوئی تھیں۔ وہ دونوں اب واپس آنے لگے تھے۔ دونوں کے سائے زرد بلبوں کی روشنی میں تارکول پر ابھی بھی ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

کئی قسم کے رنگ برنگے پیپر چارٹ تھامے وہ سیڑھی پر چڑھی بیٹھی تھی۔ معمول کا منظر ہی دکھائی پڑتا تھا۔ پڑوسیوں کے نیم کے درخت پر کچھ چڑیاں نیم کے پھولوں کو ٹونگ رہی تھیں تو وہ کبھی کبھار سر اٹھا کر انہیں بھی دیکھ لیتی تھی۔ ابا دار چینی، لونگ اور بادیان کے پیکٹ بنا رہے تھے۔

انہیں چپ سی لگی ہوئی تھی۔ شاید پھپھو کی باتوں کے بعد ہی انہیں زمانے کی سختی کا احساس ہوا تھا۔

''آپ وعدے سے مکر گئے ہیں؟'' سیڑھیوں کی طرف سے آواز آئی تھی۔

وہ چونک گئے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ یہ سوال آنا ہی تھا۔

''کس نے کہا؟''

''مجھے خود ہی ایسے لگا جیسے.....'' وہ چارٹس پر لکھنا شروع ہوگئی تھی۔ مارکر کی نوک میں ٹیڑھا پن تھا، اسے لکھنے میں ذرا مشکل بھی ہو رہی تھی مگر وہ وہیں سیڑھی پر جمی ہوئی تھی۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی کہ کتنی جلدی تم اتنی بڑی ہوگئیں تمکین، مجھے پتا بھی نہیں چلا۔''

وہ چپ رہی۔ عمر بیت جانے کے لیے ہی ہوتی ہے، بس بیت جاتی ہے۔

''زمانہ بڑا ظالم ہے۔ پھر تو پڑھنا بھی لاہور جیسے شہر میں چاہتی ہے۔ میں مسالوں کے بیوپار کے سلسلے میں کئی بار جاتا رہا ہوں لاہور مگر تمکو..... لاہور بڑا شہر ہے اور بڑے شہروں میں انسانوں کے ساتھ ساتھ راستے بھی گم ہو جاتے ہیں۔ میں بھی کئی بار گم ہو جایا کرتا تھا، بس اتنا سوچ رہا ہوں کہ اگر تم گم ہوگئیں تو میں کیسے ڈھونڈتا پھروں گا، بتاؤ..... جواب دو۔''

وہ چارٹ تھامے گم صم بیٹھی رہی۔ نیم کے پھولوں کی کھٹی میٹھی مہک پھیلتی رہی۔

☆.....☆.....☆

آسمان پر چندروئی کے آوارہ گالوں جیسے بادل ٹہل رہے تھے۔ خلیل اپنی اسپورٹس کار پورچ میں ملازم سے دھلوا رہا تھا۔ جب اس لڑکی نے اپنے والدین کے ساتھ اندر قدم رکھا تھا۔ وہ خلیل کو بہت قابلِ توجہ لگی تھی۔ اسے دیکھنے کے بعد آنکھ ارادی طور پر دوبارہ ادھر متوجہ ہونا چاہتی تھی۔

لمبے مخروطی ہاتھ جو ہینڈ بیگ کی اسٹریپس پر نرمی سے جمے تھے۔

شیشے کی ہیل میں خوب صورت پاؤں الگ توجہ کھینچتے تھے۔ وہ بس ایک پہلی اچٹتی نظر خلیل پر ڈال کر کیکٹس کے گملوں کو دیکھنے لگی تھی۔

خلیل کے ابا سائیکالوجسٹ تھے اور انہوں نے گھر کی دوسری منزل پر اپنا کلینک بنا رکھا تھا۔ ان کا شمار لاہور کے بہترین سائیکالوجسٹس میں ہوتا تھا۔ تبھی ان کے اکثر مریض گھر ہی آجاتے تھے۔ ملازم انہیں دوسرے فلور کی سیڑھیوں کی طرف لے جانے لگا تھا۔

خلیل فٹ بال اچھالتا ہوا لان میں پریکٹس کر رہا تھا۔ گھر کے رف حلیے میں سفید ٹی شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس وہ دل کھینچ لینے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔ وہ خود میں مگن ہوگیا تھا جب اس نے

سر اٹھایا تھا۔ وہ لڑکی سیڑھی کے آخری اسٹیپ پر مڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔

آنکھیں جادو کیسے کرتی ہیں۔ انسان جادوگر کیسے ہوتے ہیں۔ شخصیت کا سحر کیا ہوتا ہے، وہ اس لمحے میں خلیل کو ادراک ہوا تھا۔

وہ پہیلی تھی یا کوئی جگسا پزل..... وہ الجھ گیا۔ وہ لڑکی اندر گم ہو گئی تھی۔ وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ ابا کے کوئی جاننے والے تھے یا پھر شاید اس کے پیرنٹس میں سے کسی کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ کیکٹس پانی کے شاور میں بھیگتے رہے۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور عدن جبار خلیل کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح شاندار لگ رہی تھی۔ پراعتماد اور گریس فل۔

''ہائے! کیسے ہو؟'' وہ وہیں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟''

''کیسی لگ رہی ہوں؟'' وہ تفاخر سے پوچھنے لگی تھی۔

''ہمیشہ کی طرح حسین۔''

عدن جبار ہنس دی تھی۔

''خیر! تم بھی کافی قیامت لگ رہے ہو۔''

فٹ بال کو ٹھوکر سے پرے دھکیل کر وہ جوس کے گھونٹ لے رہا تھا۔

''رہنے دو، مجھے تمہاری زبردستی کی تعریف نہیں چاہیے۔''

وہ دونوں وہیں بیٹھے بیٹھے بحث میں الجھے رہے۔ کیٹ ونسلٹ کی نئی فلم، سوچ بینڈ کا نیا البم اور لاہور میں بڑھتا ہوا چائے کے ماڈرن ڈھابوں کا پاپولر ہونا اور لائیو قوالی۔

''سنو! ٹینس کھیلو گی؟'' اتنے عرصے میں ملازم کی لائی گئی کافی وہ شائستگی اور قرینے سے گھونٹ گھونٹ پیتی ختم کر چکی تھی۔

''وائے ناٹ! آج تو میں تمہیں ہرا کر ہی دم لوں گی۔''

وہ دونوں ٹینس کورٹ میں آمنے سامنے آ گئے تھے۔ سارا گھر شور وغل سے گونجنے لگا تھا۔ ساتھ

http://kitaabghar.com

ہی خلیل نے میوزک سسٹم آن کر دیا تھا۔

کھیل کے دوران وقفے وقفے سے وہ کھیل روک کر کسی اور دلچسپ بات میں الجھ جاتے تھے۔ ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنستے تھے۔

وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے.....

لازم و ملزوم.....!

عدن جبار نے بے تحاشا مسکراتے ہوئے، ہنستے ہنستے آنکھوں میں آئے آنسو ٹشو سے صاف کرتے اس شخص کو دیکھ کر سوچا تھا۔

"خلیل! شاید میں زندگی میں کبھی تمہیں بتا سکوں کہ تمہیں دیکھ کر ہی میری سانسیں چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور لگتا ہے کہ دل دھڑک رہا ہے۔"

☆.....☆.....☆

وہ دوسرے فلور پر کلینک کی کھڑکی سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں عجیب سا حزن تھا۔

کوئی محرومی، کچھ کھو دینے کا احساس.....!

وہ خلیل اور عدن کو لان میں بھاگتے دوڑتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسٹیپ کٹنگ بالوں والی لڑکی جو ہنستی تھی تو ہموار موتیوں جیسے دانت چمکنے لگتے تھے اور وہ لڑکا خلیل جس کا کسرتی جسم اور مردانہ وجاہت کسی کو بھی سکون سے محروم کر سکتی تھی۔

وہ شیشے کی کھڑکی کھولے ان دونوں کو باری باری دیکھے گئی۔ جیسے کسی محبوب کو دیکھا جاتا ہے۔ دم بخود ہو کر، زمانے سے بے پروا ہو کر..... آنکھ کو ٹکا کر۔

وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہے تھے۔ خلیل کی پیشانی پر بکھرے بال اور وہ پیٹ تھامے دہرا ہو کر گھاس پر گر کر اداکاری کر رہا تھا۔

کھڑکی کے کھلے پٹ پر ہاتھ رکھے آگے کو ذرا سا جھک کر کھڑی وہ لڑکی عجیب انداز سے ان دونوں سے مسمرائز ہو رہی تھی۔

بس دیکھتی رہے۔ وقت رکا رہے.....!

گھڑی کی سوئیوں کو جمود کا لمحہ چھو لے.....!

وہ زندگی میں پہلی بار اکٹھے دو انسانوں سے انس میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جن کے شاید وہ نام بھی نہیں جانتی تھی۔

زندگی میں ہر تعلق کا نام جان لینا ضروری نہیں ہوتا۔

زندگی میں کسی بھی انسان کا نام جان لینا بھی ضروری نہیں ہوتا۔

پھر ضروری کیا ہوتا ہے؟

شاید لمحے، کچھ پل، ساعتیں.....!

ان دونوں کا اب گٹار بجانے کا کوئی سیشن اسٹارٹ ہو گیا تھا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے خلیل کی نظر اوپر اٹھی تھی۔ وہ جیسے سناٹے میں آ گیا تھا۔ وہی لڑکی کھڑکی میں کھڑی ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

خلیل کو لگا وہ اس کے متوجہ ہونے پر کھڑکی بند کر کے غائب ہو جائے گی۔ وہ کھڑی رہی، دیکھتی رہی۔ ٹکٹکی باندھے..... یہاں تک کہ فردوس گوہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر ابھری اور آنکھوں میں دھند چھا گئی۔

خلیل نے وہ مسکراہٹ کی کوشش میں آنسو چھلکاتی آنکھوں کا بھید پا لیا تھا!

بھید مل جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟

شاید کچھ نہیں.....!

شاید سبھی کچھ.....!

خود گم مدارِ عشق میں ہم ہو گئے
ایسے فنا کہ ہر بقا کا درد ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول **لا** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

باب چہارم

خام

سائیں وے! میں پھر دی کلم کلی
کوئی نہ چلے نال میرے تے
لوکی آکھن جھلی
سائیں وے! میں لیراں لیراں چولا
ناں کوئی مینوں پاؤندا تن تے
ناں میں اڑن کھٹولا
سائیں وے! دل کیتے کی کی کھیکھن
کنداں وچوں اکھیاں لبھدا
جیہڑیاں تینوں ویکھن
سائیں وے! میں ڈھیر غماں داڈھوواں
دل کردا میں بوہے اگے
کوکاں مار کے روواں.....!

خام ضروری ہوتے ہیں کہ انہوں نے خاص ہونا ہوتا ہے مگر خاص نے کچھ نہیں ہونا ہوتا کہ جیسے ان کی بڑھوتری کی عمر رک جاتی ہے۔ شاگرد استاد کے درجے کو جا پہنچتے ہیں اور استاد آگے رک جاتے ہیں کہ اور کیسا سفر کیا جائے۔ جیسے کوئی اڑچن ہو جائے کہ راستہ تمام ہوا ہے یا سفر کو اخیر آ گئی۔

http://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.com

نامکمل کا ناٹک بڑا دلفریب ہے۔ آنکھ، دل سب موہ لیتا ہے۔ کاملیت پہلے تو ملتی ہی نہیں، گر ہاتھ آ بھی جائے تو وہم ہے، وسوسہ ہے، دل کی عمارت میں سیندھ ہے۔

ملٹی پرپز ہال میں جلتی بلتی، چمکتی دمکتی روشنیوں کے جھرمٹ میں جہاں سرخ رنگ کے قالینوں سے فرش سجے تھے جو آپ کو آپ کی مقرر کردہ نشستوں پر چھوڑ آتے تھے۔ تھل واسی بختاور وہیں کشمیری ٹانکے سے سجی شال اوڑھے بیٹھی اسٹیج کی طرف دیکھے جاتی تھی۔ پاس ہی نشست پر ابا براجمان تھے۔ سامنے اسٹیج پر بورڈ میں پوزیشن لینے والوں کو میڈل اور انعامات سے نوازا جا رہا تھا اور وہ دونوں بھی کنیزاں کی بورڈ کے امتحانات میں اول پوزیشن آنے کی تقریب میں شریک تھے جہاں اسے میڈلز اور انعام سے نوازا جانا تھا۔

بختاور خام کے سانچے میں ڈھل گئی تھی مگر دل کاملیت کے وہم کی جنم گھٹی میں تھا۔ وہ روشنیوں کی چکاچوند، وہ کرسٹل کے جیسے قہقہے، وہ خوشبوؤں کے نئے انداز.....

دل جیسے کسی کنویں میں گرتا جا رہا تھا، ہتھیلیاں پسینے میں بھیگی تھیں اور مٹھی میں دبا سو روپے کا نوٹ بھی گیلا ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں جھپکتی جا رہی تھی اور کاجل تھا کہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

کچھ لمحے چپ چاپ گزر گئے۔ ہال تالیوں کے شور سے گونجتا رہا۔ فرش پر پیروں کی تھاپ پڑنے کی آواز بھی بدستور محسوس ہوتی رہی تھی۔ تبھی اچانک بیٹھے بیٹھے بختاور کو لگا پیشانی کی چوٹی سے پھسلنے والی پسینے کی وہ لکیر پیروں کے انگوٹھے پر جا رکی ہے۔ وہ تھرا اٹھی تھی۔ کشمیری شال کے ٹانکے جیسے ادھڑ گئے تھے۔

وہ بڑا عجیب سا لمحہ تھا جب رشتوں میں کئی وہم گھس جاتے ہیں کہ ہم تو ''خام'' ہیں۔ بھلا خام بھی کوئی مول کی شے ہوتی ہے مگر اصل تو خام ہے ناں.....

خام، خاص کی شکل پکڑ لیتا ہے مگر خاص کے بعد کی کوئی ہیئت نہیں..... صورت نہیں۔

☆.....☆.....☆

کنیزاں فاطمہ نے مسکراتے ہوئے چمکتی آنکھوں کے ساتھ انعامی چیک اور میڈل پکڑا تھا۔ وہیں اس کی آنکھوں نے دور بیٹھے ابا اور بختاور کو جا لیا تھا جو دونوں ہال میں بجنے والی تالیوں کا حصہ تھے۔

http://kitaabghar.com

لمبے انارکلی فراک میں ملبوس وہ پراعتماد لڑکی کنیزاں فاطمہ تھی جس کے لباس، طور اطوار، لب و لہجے کی دھوم تھی۔ اس کے وجود پر چڑھے اس لباس کے ایک ایک ٹانکے کی خالق کچھ فاصلے پر بیٹھی بار بار سر سے کھسکتی شال کو برابر کرتی بختاور تھی۔

اس شام تھل کی آندھیوں نے اکٹھے ہو کر حملہ کیا تھا۔ ہر شے ریت ریت ہو گئی تھی، کئی کھگل پیڑ دب گئے، مویشی خوف سے غراتے رہے۔ کچھ دیر بعد سکون ہو گیا تھا۔ بڑی لطیف سی خاموشی ریت کے ٹیلوں پر بکھر گئی تھی۔

اماں اور ابا بھینسوں کا دودھ نکال رہے تھے اور وہ دونوں ٹیلوں پر گھوم پھر رہی تھیں۔

''تمہارا کوئی انکار نہیں سنوں گی بس۔''

''ضد مت کرو۔''

کنیزاں کو ہنسی آ گئی تھی۔

وہ تو کب سے چاہ رہی تھی انعامی تقریب میں وہ بختاور کو لازمی لے کر چلے مگر وہ ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی۔

''نہ بھئی نہ..... میں تو کبھی نہ جاؤں۔ مجھے بڑا خوف آتا ہے اتنے بڑے شہروں سے۔ آسمان سے کوئی ہیلی کاپٹر گزر جائے تو میں ڈر کر اندر چھپ جاتی ہوں، سڑک سے گزرتے ٹرکوں کی آواز مجھے ڈرا دیتی ہے اور تم ہو کہ مجھے سرگودھا شہر لے جانے پر تلی ہوئی ہو۔''

چنے کے کھیت کی سبز نرم سی فصل دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ نیلا آسمان کسی دوشیزہ کے گھاگھرے کی گولائی کی طرح پھیلا تھا۔

''بس بختاور! تم تو ڈرتی ہی رہنا۔ ارے اتنا مزا آتا ہے اصل زندگی تو شہروں کی ہوتی ہے قسم سے۔ یہاں کیا پڑا ہے بھلا ریت کے جھکڑ جھیلتے رہو بس..... میری سہیلیاں تم سے ملنے کو بے تاب ہیں۔''

وہ دونوں اب شرینہہ کے درختوں کے تنوں کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

بختاور کا چہرہ جیسے جل بجھ رہا تھا، دل ہڑک رہا تھا کہ ایک نظر شہر دیکھ آئے اور پھر وہ بھی سب

سہیلیوں کو اکٹھا کر کے شہر کے قصے سنائے..... ناگن سڑکیں، انگریزی درختوں کی قطاریں، سوپ شوپ، شیشے کے دروازوں والی دکانیں..... سب کچھ.....

مگر وہ خام تھی کہ دسترس میں کچھ نہیں تھا۔

''ایک مشورہ دوں؟''

کنیزاں جو درخت کے تنے پر اپنی چوڑی سے کوئی کھدائی کرنے میں مگن تھی، چونک پڑی تھی۔

''کیا مشورہ ہے؟''

''عمل کروگی؟'' بختاور نے ہنسی دبالی تھی۔

''سوچوں گی۔'' وہ بھی آگے اس کی بہن تھی جسے حساب کتاب میں مہارت حاصل تھی۔

''سکندر کو لے جاؤ۔''

کنیزاں اس مشورے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ وہ بختاور کے پیچھے بھاگی تھی اور وہ دونوں یونہی ریت کے ٹیلوں پر گرتی بھاگتی رہی تھیں جبھی انہیں خبر ہی نہ ہوئی ایک سانول سکندر اونٹ کی مہاریں تھامے راستہ روک بیٹھا تھا۔

''تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟''

ماتھے پر لمبے سیاہ بال پھیل گئے تھے۔ ہلکی ہلکی پسینے کی بوندیں بھی تھیں۔ مونچھیں نفاست سے تراشی ہوئی تھیں۔

''کنیزاں نے تم سے کوئی بات کرنی تھی۔'' بختاور نے ساتھ کھڑی کنیز کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''ہاں کہو! میں حاضر ہوں۔''

سکندر حاضر تھا اور بختاور موقع پا کر وہاں سے غائب ہوگئی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' کنیزاں نے دوسری نظر نہیں اٹھائی تھی۔

''اماں بتا رہی تھیں کہ تمہیں سرگودھا بورڈ کی طرف سے انعام ملے گا۔''

اونٹ کی مہاریں تھامے سکندر کے پیچھے اونٹ کے کھروں کے نشان دور تک پھیلے تھے جو ہوا

سے کچھ ہی دیر میں بگڑ جانے والے تھے۔

''ہاں! میں نے بورڈ میں اول پوزیشن لی ہے، انعام ملے گا تو میں ضرور جاؤں گی۔ وہی بختاور کی منتیں کر رہی ہوں کہ ساتھ چلے۔''

وہ اونٹ کی مہار چھوڑ کر اب اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا تھا۔ اونٹ موقع پا کر چنے کی فصل چرنے لگا تھا۔

''بختاور کیا کہتی ہے؟''

''کہتی ہے تمہیں ساتھ لے جاؤں۔'' وہ تیکھی نظروں کا وار سکندر کو گھائل کر گیا تھا۔

''تو لے جاؤ مجھے ساتھ۔''

جیسے آسان تھا.....

وہ کہے گی اور وہ اونٹ کی مہار تھامے گا، وہ پیچھے بیٹھے گی اور وہ چل پڑیں گے۔

کنیزاں کو سوچ کر ہنسی آ گئی تھی۔

''میں کبھی بھی تمہارے ساتھ نہ جاؤں سکندر صاحب!''

وہ لہجہ عام نہیں تھا، خاص بھی نہیں تھا۔

''اتنا برا ہوں میں؟''

''لوگوں کے اچھے یا برے ہونے کے فیصلے میں نہیں کرتی۔''

دل جیسے دکھا تھا۔

وہ اونچے قد والا لڑکا سامنے والی کے لفظوں کی چوٹ کھانے کا ابھی تک عادی نہیں ہوا تھا۔

''مجھے لوگوں میں شمار کرتی ہو؟''

وہ کانچ کی چوڑیوں سے کلائیاں بھرے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا اور پیروں میں کولہا پوری چپل پہن رکھی تھی۔ سارے کا سارا تھل کنیزاں کے وجود میں سمٹ آیا تھا۔

''مجھے جانے دو۔''

نگاہوں کی حرارت نے اسے پگھلانا شروع کر دیا تھا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جسارت کی تھی۔
سورج ڈوب رہا تھا اور سورج کی سرخ روشنی سکندر کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔
''روکنے کا حق مجھے کبھی تم نے دیا ہی نہیں تھل کی شہزادی صاحبہ.....!''

☆.....☆.....☆

''بختاور! تم نے بہت برا کیا مجھے اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر بھاگ آئیں۔''
بختاور دودھ کاڑھ رہی تھی ساتھ ساتھ اپنی عادت کے مطابق فریم بھی لے کر بیٹھی تھی۔
''ہاں تو میں نے سوچا مدت ہوگئی تم لوگوں نے کوئی بات چیت نہیں کی تو اچھا ہوگا کچھ باتیں کرلو۔''
دودھ دیگچی کے کناروں پر آ گیا تھا۔
''بہت شوخا ہے سکندر۔'' وہ جلی بھنی ہوئی تھی، دھاگا توڑتی ہوئی بختاور کو خوب مزا آیا تھا۔
''تم پر گیا ہے۔''
''بھاڑ میں جائے وہ.....'' وہ پانی کا گلاس غٹا غٹ چڑھا رہی تھی، ماتھے پر ننھی سی پسینے کی بوندیں تھیں۔
''ویسے مجھے لگتا ہے تم اس سے دل ہی دل میں پیار کرتی ہو۔''
بختاور کو شوق تھا اندازے مفروضوں کی عمارتیں کھڑی کرنے کا.....
اور کنیزاں کو بھی مہارت تھی ایسی عمارتوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی۔
''بختاور! شاید تمہیں ایک چیز کا علم نہیں ہے۔'' اسٹیل کے گلاس پر ابھرے ہوئے گل بوٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یکا یک وہ بختاور کی پوری توجہ پا گئی تھی۔
''کون سی بات کا؟''
دودھ کنارے آن لگا۔ آگ نے دودھ جلا کر رکھ دیا تھا۔ فضا میں دودھ جلنے کی باس پھیلی تھی۔
دودھ نور ہوتا ہے، نور کو جلنا نہیں چاہیے۔ دل بھی نور ہوتا ہے، اس کی سلامتی بھی ضروری ہے۔
''شکر کرو بختاور، کہ اللہ نے دلوں کے حال پیشانیوں پر تحریر نہیں کیے ہیں ورنہ تم میری پیشانی

پڑھ کر کبھی سکندر کا نام بھی نہ لیتیں۔"

بختاور کے سیپ کے کئی گھر ادھڑ گئے تھے۔

"تم اسے پسند نہیں کرتیں کیا؟" وہ سرگوشیوں میں بات کر رہی تھی۔ "تمہیں وہ پسند نہیں ہے کیا کنیزاں.....؟"

کنیزاں نے چولہے کی کچی مٹی سے بنی اس فرش پر چوکڑی مار لی تھی۔

"یہ دل ہے۔ یہاں منافقت کا دور دور تک گزر نہیں۔ میں بہت جرأت مند ہوں، کسی روز اسے کہہ دوں گی کہ میرے معیار کے پیمانے پر وہ چھوٹا پڑ رہا ہے بختاور۔ مگر میں چاہتی ہوں وہ سب کچھ خود جان لے، میرے لفظ اس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچا دیں۔"

سیاہ بالوں کی لٹیں چہرے کے دونوں طرف پہرہ دار تھیں۔

کولہا پوری چپل میں مقید سفید سفید پاؤں اور ہاتھوں پر بنے مہندی کے گل بوٹے سجائے وہ بختاور کو سچ میں تھل کی شہزادی لگی تھی.....

اور سکندر کسی دور غریب دیس کا درویش جو اونٹ کی مہاریں تھامے نڈھال تھل کی شہزادی کی سلطنت میں آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سرمئی بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ یہ برسات کا تہوار تھا کہ جس میں برآمدے کے پلر بھیگ گئے اور چند آوارہ بلیاں تنگ و تاریک گلیوں میں بھیگی بھیگی سی خراماں خراماں ٹہلے جاتی تھیں۔ ذرا کی ذرا بادلوں کی گھن گرج سنائی دے جاتی تھی۔

وہ برآمدے میں پلر سے ٹیک لگائے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی جو کئی گھنٹوں سے برس رہا تھا۔ پوپلی بوا پاس ہی اپنے مشہور زمانہ تخت پر بیٹھی رضائیوں کی مرمت کر رہی تھیں جو کچھ دیر پہلے انہوں نے سیرت کے ساتھ مل کر نکالی تھیں اور وہ دونوں چھینک چھینک کر تھک گئی تھیں۔

"ہائے پوپلی بوا.....! مجھے لگتا ہے ہم دونوں کو دمہ ہو کر رہے گا۔"

اسٹور میں پڑی پیٹیوں کو کھول کر رضائیاں نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ آخرکار دونوں نے وہ معرکہ سرانجام دے ہی دیا تھا۔

''شکر ہے کہ کوئی اچھی سی رضائی مل گئی ورنہ مجھے فکر تھی کہ تم ہاسٹل میں کیسے رہو گی، موسم کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے تو.....''

''مجھ جیسوں کو کچھ نہیں ہوتا بوا۔''

پلر کے ساتھ ٹیک لگا کر سڑک سڑک کر سبز چائے کا قہوہ پینے کا بھی اپنا ہی مزا تھا۔

''خیر سے چھٹی کتنے عرصے بعد ملا کرے گی؟''

جب سے اس کا لاہور میں داخلہ ہوا تھا بوا کو ہول اٹھ رہے تھے اور وہ اس کی فکر میں دبلی ہوئی جاتی تھیں۔

''یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔''

بارشیں انسانوں اور در و دیوار کو ایک ساتھ بھگوتی رہیں۔ پوپلی بوا نے اسے ساتھ تخت پر بٹھا لیا تھا۔ وہ غائب دماغی کی سی کیفیت میں بلیوں کو بوگن ویلیا کی بیلوں میں لکا چھپی کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ جب بوا نے اس کی ہتھیلیوں پر وہ سونے کے جھمکے رکھے تھے۔ وہ جیسے کسی سنگ مرمر کے بت میں ڈھل گئی تھی۔

''یہ اپنے پاس رکھ لے سیرت.....! میرے پاس دعاؤں کے علاوہ تجھے دینے کو کچھ بھی نہیں، مگر یہ سونے کے جھمکے ہیں۔ کبھی ضرورت پڑے تو بیچ دینا، ضرورت پوری کر لینا۔ مجھے خوشی ہو گی کہ تیرے کسی کام آ گئی ہوں۔''

سیرت کو لگا تھا وہ صحیح برسات کا موسم آیا تھا۔

سب بھیگ رہا تھا۔

انسان، دل اور اکھیاں..... ہر طرف جل تھل تھا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

http://kitaabghar.com

''نہ کریں بوا..... نہ کریں..... مجھے اتنی محبت کی عادت نہیں ہے اور آپ میری عادتیں خراب کر رہی ہیں۔ میں تو کل سے سوچے جا رہی تھی کہ یہاں سے جانے کے بعد کسی کو یاد نہیں آؤں گی اور نہ ہی میں کسی کو یاد کروں گی مگر بوا آپ نے مجھے مقروض کر دیا ہے۔''

پوپلی بوا نے اسے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ وہ جھمکے بھی سیرت کے آنسوؤں میں بھیگ گئے۔ سونا بھی بھیگ رہا تھا۔ وہ بار بار پوپلی بوا کے کانوں کی طرف دیکھتی تھی جو ساری زندگی یہی جھمکے پہنے اتراتی پھری تھیں کہ یہ ان کے میکے کی نشانی ہیں۔

عورتوں کو کتنے عزیز ہوتے ہیں ناں میکے کے گہنے اور چیزیں.....

''بوا! آپ یہ رکھ لیں، میں نہیں لوں گی۔ جب ضرورت ہوگی مانگ لوں گی، مگر ابھی نہیں۔''

وہ انہیں واپس لوٹا رہی تھی۔ وہ اپنی عینک کے عدسے صاف کر رہی تھیں۔ برآمدے کے پلر بھیگ گئے۔

''نہیں، میں بوڑھی ہوگئی ہوں سیرت، چیزیں رکھ کر بھول جاتی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ یہ بھی کہیں رکھ کر بھول جاؤں..... اور یہ دیکھ.....'' وہ اسے اپنے پاس پڑے ڈبے سے ایک اور جھمکوں کا سیٹ نکال کر دکھا رہی تھیں۔

''یہ دیکھ یہ کوڑے (نقلی) میں لے آئی تھی بازار سے..... سونے کا پانی چڑھا ہے، میں یہ پہنے رکھوں گی۔''

سیرت ہاتھوں پر دونوں جھمکوں کی جوڑیاں لے کر بیٹھی رہ گئی تھی۔

کوڑے اور اصلی.....

خام اور خاص!

☆.....☆.....☆

رات کے آتے ہی بادل کھسک گئے تھے۔ اب چاند نے بھی اپنا چہرہ اوٹ سے نکال لیا تھا اور شیشے کی کھڑکیوں سے چھن چھن کر ہلکی ہلکی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ کمرے میں زرد بلبوں کی روشنی نے

http://kitaabghar.com

اندھیرے کو پچھاڑ دیا تھا۔ وہ بیگ کی زپ چیک کر رہی تھی اور ساتھ ہی ایک لسٹ ڈریسنگ کے سامنے پڑی تھی جس پر وہ ساری چیزیں لکھی تھیں جو وہ ساتھ لے کر جانے والی تھی۔

صبح سے لے کر رات تک اس نے اتنے کام ایک ساتھ کیے تھے کہ کنپٹیوں میں درد نے بسیرا کر لیا تھا۔ تبھی دروازہ کھلا تھا اور آیت اندر آئی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی لمبی پیروں تک آتی ہوئی قمیصیں پہنتی تھی جو اس کے پیروں تک کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ اب بھی وہ مختلف رنگوں کے بڑے بڑے گلاب کے پھولوں والی پرنٹڈ قمیص پہنے ہوئے تھی۔

''کیا کر رہی ہو؟''

سیرت نے اس بے تکے سوال پر سر اٹھایا تھا۔

''جو تم دیکھ رہی ہو۔''

وہ آہستہ سے چلتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی تھی۔ باہر رات تھی اور اندر کمرے میں زرد بلب کی روشنی میں اس کے بال سونے کی تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

''کونین چباتی رہی ہو کیا؟''

''ارادہ تو تمہاری گردن چبانے کا تھا، پھر خیال آیا انسان کھانا حرام ہوتا ہے۔''

آیت زور سے ہنسی تھی۔

اسے بڑا مزا آتا تھا جب وہ ہزار کاموں میں مصروف ہوتی تھی اور کان کھجانے کی فرصت نہ ہونے کے باوجود بھی وہ آیت سے بحث میں ضرور الجھ جایا کرتی تھی۔

''ابا کا فون آیا تھا، کہہ رہے تھے کل تم سے بات کریں گے۔''

''تم لوگوں نے اجازت دے دی؟''

''کس کو؟''

''ابا کو، کہ وہ مجھ سے بات کر لیں۔''

ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے چھوٹے سے ٹیڈی بیئر کو وہ اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔

''ہاں تو ہم کب منع کرتے ہیں۔'' وہ ایسے کندھے اچکا رہی تھی جیسے واقعی انہیں اس بات سے ذرا بھی فرق نہ پڑتا ہو کہ وہ اور ابا بات کریں یا نہ کریں۔

''تم معصوم مت بنا کرو آیت!''

سیرت کپڑوں کی تہ لگا کر بیگ میں رکھتی جا رہی تھی اور آیت بھی غیر محسوس انداز میں کپڑوں کو تہ لگانے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔

''تمہیں میری معصومیت سے کیا مسئلہ ہے؟''

سیرت نے دوپٹا اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔

''تمہارے چہرے پر ایک ہی تاثر ابھرتا ہے ظلم کا..... تم ظالم ہو۔''

آیت نے باز آنا کبھی بھی نہیں سیکھا تھا۔ وہ دوبارہ کپڑوں کے ڈھیر کو تہ لگانے لگی تھی۔

''تمہارے چہرے پر پتا ہے کیا تاثر ابھرتا ہے؟''

سیرت نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''ظلم سہہ لیا جاتا ہے سیرت، مگر نفرت نہیں سہی جاتی۔ جب جب تمہاری طرف دیکھتی ہوں، مجھے لگتا ہے تم ہم سب سے بہت نفرت کرتی ہو۔''

باہر بارش کب کی تھم چکی تھی مگر کمرے میں ٹھنڈک سی اتر آئی تھی۔

شاید پوپلی بوا نے سچ کہا تھا کہ موسم کافی بدل سا گیا تھا۔

''تم لوگوں نے مجھے مجبور کیا ہے۔ میں نے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی محرومیاں ہی دیکھی ہیں۔ میرے پاس نفرت تھی، میں نے وہی کی۔ تمہارے پاس ظلم ہے۔ تم وہ کرتی ہو۔''

وہ اب کاسمیٹکس کا سامان الٹ کر دیکھ رہی تھی۔ سوکھی ہوئی نیل پینٹ، لپ اسٹکس، اور مسکارے.....

آیت نے ایک مسکارا اٹھا لیا تھا اور ہاتھ کی پشت پر پھیرا تھا۔

سیاہ رنگ سوکھ گیا تھا۔ ہر شے کی مدت ہوتی ہے، عمر ہوتی ہے اور جب عمر تمام ہو جائے تو چیزیں

http://kitaabghar.com

مرنے لگتی ہیں، نفرت بھی اور ظلم بھی..... کیونکہ یہی زندگی ہے۔

''بریانی کھاؤ گی؟'' آیت نے دوستی کی فضا قائم کرنے میں جیسے پہل کی تھی۔

''زہر لادو، وہ کھالوں گی۔'' وہ جلا بھنا انداز، تپا تپا انداز.....

''نہیں، آج تو میں تمہیں بریانی ہی کھلاؤں گی۔''

وہ کمرے سے نکل گئی تھی جب سیرت سب کچھ پیک کر کے کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے بیٹھی ہوئی تھی تو وہ دوبارہ بریانی کی پلیٹ اور پانی کے ساتھ وارد ہوئی تھی۔ سیرت آنکھیں کھولے اسے دیکھتی رہی۔ وہی لمبی قمیص میں پاؤں نظر ہی نہ آتے تھے۔

''رزق کو منع نہیں کرتے، کھالو۔''

وہ چپ چاپ پلیٹ تھام کر کھانے لگی تھی، چمچے کا شور گونجتا رہا۔

''طاہر کے گھر والے اصرار کر رہے ہیں، ابا بھی آنے کا کہہ رہے ہیں۔ شاید جلدی شادی کر دیں۔ تو اگر جلدی میں سب ارینج کرنا پڑا تو تم میری شادی پر آؤ گی سیرت؟''

سیرت کو پھندا لگا تھا۔ ظالم لڑکی نے پانی کا گلاس آگے بڑھایا تھا۔ وہ جب پانی پی کر سنبھلی تھی تو بس اتنا ہی بول پائی تھی۔

''میں دیکھوں گی آیت!''

وہ ساتھ بیٹھی ٹیبل لیمپ کو آن آف کرتی رہی تھی۔ لمحے گزرتے رہے۔ زرد بلبوں کی روشنی میں جیسے نفرت کی عمر پوری ہو رہی تھی۔ سیرت نے خود کو ہلکا ہوتا محسوس کیا تھا۔

آیت اچانک اٹھی تھی جیسے اسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو جسے سرانجام دینا بہت ضروری ہو۔

سیرت آخری چمچہ لے رہی تھی جب وہ دروازے سے نکلتے نکلتے رک گئی تھی۔ دروازے کے ونڈ چائمز کی طرف ہاتھ اونچے کیے وہ اٹھی ایڑیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ قمیص اونچی ہوئی تھی تو سفید گلاب کی پتیوں جیسی نزاکت والے پیر نظر آنے لگ گئے تھے۔ سیرت کی نظریں اس کے پیروں سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ آیت نے ونڈ چائمز کو چھیڑا تھا تو ایک موسیقی کی گونج پیدا ہوئی تھی۔

http://kitaabghar.com

پوپلی بوا نے سونے کے جھمکے تمہیں دے دیے، افسوس! وہ تو مجھے بہت پسند تھے۔ اب سونے کے پانی چڑھے ہوئے جھمکے پہنے گھومتی ہیں۔ بھلا نقل بھی کبھی اصل سے بازی لے سکا ہے۔ افسوس.....!"

موسیقی دردناک آواز میں ڈھلتی گئی۔ سیرت کی آنکھ سے آنسو ٹپک گیا تھا۔

وہ ایک مغالطے کا شکار ہوگئی تھی کیونکہ یہ تو نفرت کی پیدائش کا وقت تھا۔

☆.....☆.....☆

تمکین جمال کو یوں لگا تھا جیسے پورے چیچہ وطنی پر کسی نے رنگ برنگے پھولوں کی بارش کر دی ہو۔ وہ جیسے ہواؤں میں تھی۔

ابا اس کا ہاتھ تھامے اسے بازار میں لیے لیے گھوم رہے تھے اور وہ ضرورت کی ہر شے خرید کر اسے دینے پر تلے ہوئے تھے۔

جب سے اس کا نام پنجاب یونیورسٹی کی میرٹ لسٹ میں آیا تھا تو وہ جو صرف تمکین کا خواب تھا آگے پڑھنے کا، اب وہ آدھا جمال کے حصے میں آ گیا تھا۔ ہر دکان پر کچھ بھی خریدتے ہوئے وہ دکان دار کو ساتھ یہ بتانا لازمی سمجھتے تھے۔

"اچھی سے اچھی چیز دکھانا یار! میری بیٹی نے لاہور جانا ہے پاکستان کی سب سے بڑی اور مشہور یونیورسٹی میں میری بیٹی کا داخلہ ہوا ہے۔"

دکان دار بہت متاثر ہو کر اس دبلی پتلی لڑکی کو دیکھتے تھے جو ذہین آنکھوں کی مالک تھی، اپنے باپ کا مضبوطی سے ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ تھی۔

کپڑے، جوتے، میک اپ، پرفیوم، تولیے، ہینڈ بیگ، سامان کے اٹیچی کیس..... ابا نے ہر ہر چیز اسے لے کر دی تھی۔ وہ دونوں اب ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔

"تمکو! تو خوش تو ہے ناں؟" وہ اپنے باپ کی آنکھوں میں خوف واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔

"ابا! آپ پریشان مت ہونا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

''تمکو! لاہور بڑا شہر ہے اور بڑے شہروں میں بڑے سے بڑا بندہ بھی ایک لمحے کو پریشان ہو جاتا ہے۔ بڑے شہروں کے خوف بھی بڑے ہوتے ہیں۔''

پیالیوں میں پڑی چائے کی شکر گھلنے لگی تھی۔ وہ ان کے دونوں ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔

''آپ کو پتا ہے ابا کہ آپ کی تمکین بھی اب چھوٹی نہیں رہی اور آپ دیکھیے گا کہ جلد وہ وقت آئے گا جب آپ کو مجھ پر فخر ہوگا۔''

جمال دین نے اپنی اولاد کی آنکھوں میں حوصلے کی سطر پڑھ لی تھی۔

''لوگ پوچھتے ہیں کون سی تعلیم کرے گی؟'' وہ ابھی بھی جیسے گومگو کی سی کیفیت میں تھے۔

وہ ہولے سے ہنسی تھی۔ وہ الفاظ ڈھونڈ رہی تھی کہ انہیں بتا سکے دنیا نے کتنی رفتار پکڑ لی ہے۔ جدت نے کیا کیا شکلیں نکال لی ہیں۔ اب پروفیشن بدل گئے ہیں۔ پہلے زندگی جیسے انجینئرنگ اور ڈاکٹری پر رک گئی تھی مگر اب حوصلے اور راستے اور قسم کے ہیں۔

''آپ انہیں بتایا کریں کہ تمکین ٹی وی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ جسے صحافت کہتے ہیں۔ اخبار کی تعلیم ہے، بول چال کی تعلیم ہے۔''

ابا دیکھتے رہے، سنتے رہے اور وہ بولتی رہی تھی۔

ذرائع ابلاغ میں جانا اس کا خواب تھا۔ کبھی اس نے کوئی اخبار کا تراشا نہیں چھوڑا تھا۔ اسکول میں جب اخباروں پر پکوڑے اور چٹنیاں ملا کرتی تھیں تو تب بھی وہ استعمال شدہ تراشے پڑھا کرتی تھی کہ لفظوں کی دنیائیں کیسی ہوتی ہیں۔ سیاہی کیسے کہانی میں ڈھل جاتی ہے، واقعات کیسے خبر بن جاتے ہیں۔

تمکین جمال کامیاب رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

پھپھی جب بھی ان کے گھر آتی تھیں تو بھائی اور تمکین کو سخت سست سنانے سے باز نہ آتی تھیں۔ آج چپ چپ تھیں۔ وہ جو دو تین دن کی اب گھر میں مہمان تھی، پھر بھی پھپھی کی خاطر تواضع میں لگی ہوئی تھی۔

پھپھی نے دسترخوان پر سجے ان کھانوں پر نظر ڈالی تھی۔

بریانی کا ہر چاول الگ الگ اور کھلا کھلا تھا اور خوشبو اتنی اشتہا انگیز تھی کہ وہ جو پریشانی میں کھانا پینا بھول بیٹھی تھیں اب کھانا دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ وہ شاید ایک دن سے بھوکی ہیں۔ اولاد کی فکریں یونہی بھوک اڑا کر رکھ دیتی ہیں۔

دسترخوان سج گیا تھا۔ بریانی، کباب، یخنی، خوب صورت انداز میں کٹا ہوا سلاد، شیشے کے صاف ستھرے گلاس جن پر ایک ذرہ بھی گرد کا نہ تھا۔

سب جگہ ایک عجیب طرح کا سلیقہ اور قرینہ تھا جو آنکھ اور دل دونوں کو بھا رہا تھا، قائل کر رہا تھا۔

وہ ٹکر ٹکر تمکین کو ادھر ادھر کام کرتے بھاگتے دوڑتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ سارا صحن جیسے پانی کے چھڑکاؤ سے چمک رہا تھا۔ پینٹ کیے ہوئے چند چھوٹے چھوٹے گملے دیوار کے ساتھ دھوپ میں رکھے تھے جن پر پھول آئے ہوئے تھے۔ ایک طرف کیاری میں کچھ پودینہ، دھنیا اور میتھی کی فصل تھی جیسے ہی ہوا چلتی تھی تو میتھی کی تازہ خوشبو نتھنوں میں گھس آتی تھی۔

وہ سارے گھر میں گھومتی رہیں۔ چینی کے گلدان سلیقے سے سجے تھے۔ ایک طرف کتابوں کی الماری تھی جہاں کچھ انگریزی کے اخبار اور موٹی موٹی سی کتابیں رکھی تھیں۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ پھر انہوں نے غور سے تمکین جمال کو دیکھا تھا جو ان کی بھتیجی تھی جس نے ماں کے بغیر عمر گزاری تھی۔ وہ بس ٹکٹکی باندھے دیکھے گئیں۔

مناسب قد و قامت، لمبے گھنے سیاہ بال جو پشت پر لہرا رہے تھے۔ کاسنی رنگ کا دوپٹا اوڑھے اور ہاتھوں کی لمبی خوب صورت انگلیوں کے تراشے ہوئے ناخن۔ کہیں کچھ بھی نقص نہیں تھا۔ وہ ساری زندگی بھائی کو کوستی رہی تھیں کہ بیوی کی موت کے بعد دوسری شادی کر لے مگر وہ ہر بار یہی کہتا رہا تھا۔

"نہیں آپا! تمکین اور دل دونوں نہیں مانتے۔"

کتنا کھرا سودا کیا تھا جمال دین نے۔

وہ بن ماں کی بچی جس نے سب سنبھال لیا تھا۔

گھر کو بھی، باپ کو بھی اور خود کو بھی.....!

پھپھی کھانے کے دوران آنسو پیتی رہی تھیں۔ کھانے کے بعد وہ بھائی کے آگے ریت کے گھر کی مانند ڈھے گئی تھیں۔

''جمال! تو آج جیت گیا ہے..... سچ کہتی ہوں، تو جیت گیا ہے۔ واقعی میں ہی کم عقل تھی۔''

جمال دین گھبرایا ہوا بہن کو دیکھتا رہا تھا۔

''میں ایک عورت ہوں اور ماں بھی ہوں جس نے اپنے بچوں کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی مگر پھر بھی ناکام ہوگئی۔ اولاد کی فصل ہر ایک کو راس نہیں آتی جمال! ہر کسی کو راس نہیں آتی۔ تو خوش قسمت ہے کہ اللہ نے اچھی اولاد سے نوازا ہے۔''

تمکین چائے کا پانی چڑھائے پھپھی کی باتیں سنتی رہی۔ وہ اس کے ہاتھ چومتی رہیں۔ کبھی ہاتھ، کبھی پیشانی..... وہ دونوں جیسے ایک دوسرے کو سمجھ گئی تھیں۔ جیسے عورت عورت کو سمجھ جاتی ہے۔

وہ سب بتاتی گئیں۔ ان کی اپنی اولاد میں طریقے سلیقے کی کمی تھی۔ گھر میں روز کی چخ چخ، بے برکتی، رزق کو برتنے کا طریقہ سلیقہ تک نہیں تھا۔ وہ بہت افسردہ تھیں جو اپنی اولاد کی نافرمانی کی چوٹ کھائے ہوئے تھیں۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا پھپھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شعور کی بھی ہر کسی کی اپنی اپنی عمر ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی انسان اپنی اس عمر کو پہنچتا ہے تو اسے پالیتا ہے۔ اس میں آپ کی تربیت کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

☆.....☆.....☆

شہرِ لاہور صرف ایک شہر نہیں ہے، یہ اپنے آپ میں ایک پوری دنیا ہے جہاں کئی شہر آباد ہیں اور ہر شہر کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ لاہور کبھی بھی کسی کی شخصیت کو دہرا رنگ نہیں دیتا۔ لاہور کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ یہاں شاگرد آتے ہیں۔ خام آتے ہیں۔ پھر آپ شاگرد ہوں، خام ہوں یہ آپ کو قبول کر لیتا ہے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے۔

آپ لاہور کے ایک بار ہو جائیں تو پھر کہیں کے نہیں رہتے۔ مگر لاہور سب کا پھر بھی رہتا ہے۔ یہی اس شہر کا وصف ہے۔ ہر کسی کا ہو جاتا ہے۔

شکر ہے کہ شہروں میں انسانوں جیسی صفت نہیں ہوتی۔

شہر لاہور میں ایک اور شہر ہے۔ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا..... جسے پنجاب یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ جس کا اپنا رعب ہے، حسن ہے، جادو ہے جو ٹھٹکا دیتا ہے۔ یہاں کبھی بھی آپ ویسے نہیں رہتے جیسے آپ ہوتے ہیں۔ یہ رنگ آپ پر چڑھتا ہے تو کسی اور رنگ کو اجازت نہیں دیتا۔

لمبی لمبی سرمئی سڑکیں جہاں راستے کبھی ختم نہیں ہوتے..... گھنے چھتنار دور تک سڑکوں پر سایہ کیے ہوئے بوڑھے درخت..... گھاس کے میدان..... فصلیں..... نت نئے پھولوں کا جوبن..... پنجاب یونیورسٹی میں آپ سر اٹھا کر آسمان کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں کئی ہجرتی پرندے مہمان ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی لگتا ہے پنجاب یونیورسٹی کو جنگلی کبوتروں کے شہر کا لقب ملنا چاہیے۔

مختلف ملکوں، خطوں سے آئے ہوئے رنگ برنگے لوگ، دلچسپ زبانیں.....! جو اپنی اپنی آنکھوں میں خواب لیے پنجاب یونیورسٹی کے دروازے پر آتے ہیں۔

تمکین جمال نے ہاسٹل گیٹ نمبر چار سے پنجاب یونیورسٹی میں قدم رکھا تھا تو یوں لگا جیسے ہر طرف ایک شناسائی کا حسن پھیل گیا ہو۔ جیسے مدتوں سے ساتھ ہو۔ جان پہچان ہو۔ وہ اپنا بیگ تھامے ہوئے سڑک پر جمال دین کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ سر پر دوپٹا برابر کرتی وہ بہت پرسکون اور مطمئن لگ رہی تھی۔

ابا جیسے ہی گیٹ سے اندر داخل ہوئے تھے جیسے سکون میں آ گئے تھے۔ اس ماحول نے جیسے انہیں بھی مسمرائزڈ کر کے رکھ دیا تھا۔ لمبی سیاہ سڑک کے دونوں طرف لگے چھتنار درختوں کے سائے تلے چلتے ہوئے وہ دونوں ہاسٹل الاٹمنٹ کے لیے چیئرمین ہال کونسل پہنچے تھے۔ جہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں اپنے اپنے والدین کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔

پنجاب یونیورسٹی کی زمین کے خواب سانجھے تھے جو ہر کسی کو ایک ہی مقام پر کھینچ لائے تھے۔

تھوڑے بہت انتظار کے بعد ہاسٹل الاٹ ہو گیا تھا۔ ابا کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بس وہ اسے چھوڑ کر واپس جانے والے تھے۔ وہ بار بار تمکین کی طرف دیکھے جاتے تھے۔ جیسے دل بھر ہی نہ رہا ہو۔

اولاد کی محبت یونہی زنجیر کرتی ہے۔

بیوی کی موت کے بعد ان دونوں کا ساتھ بے حد مثالی تھا۔ آج انہیں الگ ہونا تھا۔ یہی زندگی کے تقاضے ہیں جن پر عمل کرنا ہی ہوتا ہے۔

وہ ہاسٹل کے دروازے پر ان کے ساتھ لگی کھڑی رو رہی تھی۔ وہ اس کی پیشانی چوم رہے تھے۔ ''پریشان مت ہونا تمکو! کوئی بھی مسئلہ ہو، مجھے فون کر دینا۔''

''ابا! آپ بالکل بھی فکر مت کیجیے گا۔ میں بزدل نہیں ہوں اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔''

دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کو تسلیوں، دلاسوں سے نوازتے رہے۔ پھر وقت تمام ہوا اور سورج کی تپش نے کم ہونا شروع کر دیا تھا۔ جمال دین واپس آنے لگے تھے۔ وہ گیٹ سے لگی دور تک انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ وہ بھی بار بار پلٹ کر دیکھتے تھے۔

پھر تمکین نے انہیں اپنی پگڑی سے آنکھوں کے آنسو صاف کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہاتھ سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا۔

''اللہ کی امان میں رہو تمکو بیٹا!''

تمکین جمال نے ہاسٹل کا گیٹ پار کر لیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے درختوں کے جھنڈ کے پار سورج کا سرخ گولا غروب ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کھانے کی میز پر ہمیشہ کی طرح برتنوں کا اتنا شور تھا کہ عدن جبار نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

''تو آپ ایک ہفتے کے لیے کراچی جا رہے ہیں۔'' اس نے باپ سے سوال کیا تھا۔

اکثر یہی ہوتا تھا کہ جب چمچ کانٹوں کا شور بڑھ جاتا تھا تو وہ سوالوں سے ہی وہ آواز دبانے کی کوشش کرتی تھی کہ اگر شور ہی مقصود ہے تو پھر انسانوں کا ہی ہو۔

''ہاں میری ایک بزنس میٹنگ ہے۔''مسٹر جبار کانٹے میں فش پھنسا کر کھا رہے تھے۔

''ضروری میٹنگ ہے؟''

مسز جبار چپ چاپ ان دونوں باپ بیٹی کے مکالمے سن رہی تھیں۔اسی اثناء میں ان کا فون بجا تھا تو وہ سننے لگی تھیں۔ملازم ذرا فاصلے پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے کہ جیسے ہی کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ حاضر کر دیں۔

''ہاں بیٹا! میٹنگز ضروری ہی ہوتی ہیں۔''

وہ سر ہلا کر ٹرائفل نکالنے لگی تھی۔

مسز جبار اب بھی فون کال پر مصروف تھیں۔

''نہیں، میں نہیں آسکوں گی مسز زبیری، میری طبیعت پچھلے دو دنوں سے خراب ہے۔''

مسٹر جبار اور عدن دونوں ان کی اس بات پر ان کی طرف اچانک متوجہ ہوئے تھے۔بس لمحوں کی بات تھی۔مسٹر جبار اپنے جوس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

عدن جبار نے ان کے انداز و آواز پر غور کیا تھا۔

واقعی وہ کچھ مضمحل اور نڈھال سی نظر آرہی تھیں۔

''مما! آپ ٹھیک ہیں؟''دل میں عجیب سی بے چینی نے سر اٹھایا تھا۔

ان کے سامنے پڑی کھانے کی پلیٹ ویسے کی ویسے ہی پڑی تھی، بس وہ کھانا جیسے ٹونگ رہی تھیں۔

اسے یاد آرہا تھا کچھ دنوں سے واقعی وہ عجیب سی ہو گئی تھیں۔بے زار اور سست.....ان کے ان ڈور پلانٹس بھی ان کی غفلت کی وجہ سے جل گئے تھے مگر وہ جیسے ہر ہر چیز پر کمپرومائز کرنے پر مجبور تھیں۔

مسٹر جبار ٹشو باکس سے ٹشو کھینچتے منظر نامے سے غائب ہو گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی کے جانے کی آواز آئی تھی۔

عدن کا دل چاہا وہ ان کا ہاتھ تھام کر بیٹھے، انہیں سہلائے.....

کوئی بیریئر تھا، کوئی گیپ تھا جو ان کے درمیان زندہ ہو گیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں عدن!'' وہ شیک کے گھونٹ لے رہی تھیں۔ عدن کی نظریں صوفوں پر لوٹیاں لگاتے بلے پر جمی تھیں۔

''میں نے آپ کو کچھ بتانا تھا۔'' وہ بات کا آغاز کر رہی تھی۔ کشمالہ بیگم متوجہ ہوئی تھیں۔

''ہاں بولو!''

بات کرتے ہوئے وہ بغور اس کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ وہ بالکل اپنے باپ پر گئی تھی۔ وہی مغرور نقوش، وہی خوب صورتی اور رعب.....

''میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا ہے۔''

کشمالہ بیگم کو خوشی ہوئی تھی۔ انہوں نے شیک کا گلاس سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔

''کس سبجیکٹ میں؟''

''ماس کمیونیکیشن میں۔''

ڈرائنگ روم میں روشنی پھیل رہی تھی۔ باہر دھوپ نے اب تیز ہونا شروع کر دیا تھا۔

''تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تم میڈیا کی فیلڈ میں انٹرسٹڈ ہو۔'' انہیں اطمینان ہوا تھا کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق ہی فیلڈ لے رہی تھی۔ جتنا اس میں کانفیڈنس اور گفتگو کا سلیقہ تھا تو اس لحاظ سے یہی فیلڈ اس کے لیے بہتر تھی۔

''آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔''

ایک خاموشی نے ان دونوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

''آپ نے کبھی وہ کمیونیکیشن گیپ ختم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی جو ہمارے درمیان تھا۔ آپ کو تو بس ساری عمر ڈیڈ کے معیار پر پورا اترنے کی ہی پڑی رہی۔ کاش! آپ دونوں نے مجھے اپنی اپنی جنگوں میں نظر انداز نہ کیا ہوتا۔''

ہر کوئی اپنی اپنی جگہ درست تھا۔ ہر کسی کے پاس اپنی اپنی دلیلیں اور وضاحتیں تھیں۔

''تم سارے قصور میرے کھاتے میں ڈال رہی ہو عدن!'' وہ کٹا کٹا سا بے بس لہجہ تھا۔ عدن نے کبھی ترس نہ کھایا تھا۔

''جب قصور ہی آپ کا ہے۔ ڈیڈ کے ذمے باہر کے کاموں کی ذمہ داریاں ہیں اور آپ کے ذمے گھر چلانا تھا مگر آپ نے بھی باہر کے کام لے لیے۔ آپ دونوں کو ٹیبل ٹاک کے ذریعے اپنی اولاد کے لیے فیصلے لینے چاہیے تھے۔ آپ نے تو بس مجھے ملازموں کے سر ڈال دیا مما! سڑک کے کنارے تو لگی جڑی بوٹیاں بھی خود پل جاتی ہیں مما! میں تو آپ دونوں کی اولاد تھی۔''

عدن کی حسین آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئی تھیں۔ دھوپ کی تیز روشنی شیشوں میں نقب لگا کر اندر آ گئی تھی۔ آج کوئی بھی مزاحمت نہیں تھی۔

''ہر کسی کے پاس اپنا اپنا سچ ہے۔ میرا سچ کبھی کسی کو سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یہ بھی اتنا ہی دکھ دینے والا ہے جتنا تمہارا اور تمہارے باپ کا ہوگا۔ تم نے بھی تو اپنے باپ کے ساتھ مل کر مجھے ڈس اون ہی کیا ہے کہ مجھ میں سوسائٹی کی سمجھ بوجھ نہیں۔ تم چھوٹی تھیں، تمہیں اچھا ماحول دیا، اسکولنگ دی..... میں عمر کے اس حصے میں کس اسکول جاتی عدن بتاؤ، مجھے جواب دو۔''

جانے کیسے اسپون اسٹینڈ سے چمچہ گر گیا۔ عدن کو لگا تھا ہر کسی کو آئینے ضروری ہوتے ہیں۔

عدن کو بھی.....

جبار کو بھی۔

کشمالہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''تمہارے باپ کے پاس سرکل ہے، مصروفیت ہے۔ تمہارے پاس دوست ہیں۔ میرے پاس صرف میری ماں کے دیے ہوئے میکے کے بس کچھ برتن ہیں عدن..... اور عمر کے اس حصے میں پلیز، میرے لیے میرا میکا سلامت رہنے دو۔''

سناٹا چھا گیا تھا یہاں تک کہ عدن کو اپنی سانس لینے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

تو انہیں سب پتا تھا کہ گھر میں صرف وہی تھی جو ان کے جہیز کے برتن توڑتی تھی کہ ماں کی توجہ لے لے.....

سب کا اپنا سچ..... میرا..... تمہارا..... سب کا.....!

☆.....☆.....☆

امپریس ہوٹل کی اونچی بلڈنگ کو عدن نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ آنکھوں میں درد کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ گلاسز لگائے ہوئے تھی۔ لفٹ میں سوار وہ فورتھ فلور پہ پہنچ گئی تھی۔ آج آر یا پار کا فیصلہ ہو کر رہنے ہی والا تھا۔ ہمت، حوصلہ..... سب کچھ پارہ پارہ ہوتا جا رہا تھا۔

جب آپ کو پتا ہو کہ آپ نے ایک لڑائی لڑنی ہے اور اس لڑائی میں آپ کے حصے میں صرف اور صرف مات ہی آئے گی تو.....! وہ مات کے حوالے خود اپنا آپ کرنے آئی تھی۔

دروازے پر دستک دے کر وہ منتظر کھڑی رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ صرف ایک دروازہ نہیں تھا، جو کھلا تھا۔ وہ ایک طوفان تھا، سیلاب تھا جو سب کچھ بہا کر لے گیا تھا۔

تعلق، رشتے..... سبھی کچھ!

شہلا نے دروازہ کھولا تھا اور اسے لگا تھا امپریس کی عمارت اس پر گر گئی ہو۔ باہر وہی کھڑی تھی عدن جبار..... اپنے پورے رعب و دبدبے کے ساتھ۔

وہ جب آفس آئی تھی، شہلا کو خوف کا شکار کر گئی تھی اور آج تیئس مارچ کو تو وہ اسے زندہ درگور ہی کر گئی تھی۔

''ڈیڈ کہاں ہیں شہلا؟'' سپاٹ سا لہجہ..... گلاسز میں اس کی آنکھوں کا رنگ نظر نہیں آ سکا تھا۔

''وہ اندر ہیں۔''

وہ شہلا کو دھکیلتی اندر آ گئی تھی۔

سامنے ہی صوفے پر صرف بنیان میں ملبوس مسٹر جبار ہاتھوں میں ریموٹ لیے نیشنل جیوگرافکس دیکھ رہے تھے۔

عدن کے اندر پہلے غبار، پھر غصہ اور آخر میں آنکھ سے آنسو لڑھک گئے۔

مسٹر جبار جہاں کے تہاں رہ گئے تھے۔

''عدن تم؟''

انہیں شاک لگا تھا۔ وہ یہاں ایسے کیسے آ سکتی تھی؟ انہیں اس حالت میں شہلا کے ساتھ کیسے دیکھ

سکتی تھی؟ جبکہ وہ تو ان کے نزدیک کراچی بزنس کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ مگر سب ہو گیا تھا۔

وہ شرٹ اٹھا کر پہن چکے تھے۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ گلاسز نیچے فرش پر گر گئے تھے۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرے کو چھپائے ہولے ہولے سسکیاں لینے لگی تھی جو تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔

''اگر میں آج زندہ اس وقت آپ کے سامنے موجود ہوں تو وجہ صرف اور صرف وہ جاہل اور گنوار عورت ہے جو اس وقت آپ کے گھر میں حلال رشتے کے ساتھ موجود ہے۔ میری ماں اور آپ کی بیوی۔''

وہ ہاتھ ملتے ہوئے بیٹھے رہ گئے تھے۔ بھرم، تعلق..... کچھ بھی تو سلامت نہیں رہا تھا۔

''آئی ایم سوری بیٹا!''

شہلا چپ چاپ وہاں سے اپنا سامان پیک کرتی دروازہ ہولے سے بند کرتی باہر نکل گئی تھی۔

''سوری چھوٹا لفظ ہے ڈیڈ..... ہمارے نزدیک وہ جاہل اور گنوار عورت سچ کہتی ہیں کہ ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہوتا ہے۔ صحیح کہتی ہیں ڈیڈ..... آپ کے سچ نے تو ہمیں کسی چیز کے لائق نہیں چھوڑا..... میرا دل پھٹ رہا ہے۔''

وہ واقعی حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

وہ پانی کا گلاس لیے اس کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ دونوں باپ بیٹی فرش پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

اولاد کا دکھ کائنات کا دکھ ہے۔

پانی کا گلاس عدن نے دور کر دیا تھا۔

''آئی ایم سوری عدن!'' وہ بار بار ہاتھ جوڑ رہے تھے۔

''ڈیڈ! ہم نے غلط کیا..... میں نے، آپ نے..... غلطیاں معاف ہو جاتی ہیں اور گناہ نہیں ہوتے۔ مجھے لگتا ہے ان کو سب پتا ہے تبھی وہ بیمار پڑتی جا رہی ہیں۔ مجھے گھن آ رہی ہے، خود سے، آپ سے.....''

وہ صوفے کی ہتھی سے سر ٹکرا کر زور زور سے مار رہی تھی۔ مسٹر جبار کو اب سمجھ میں آیا تھا کہ اللہ

نے جو عیبوں پر پردے رکھے ہیں تو کیوں رکھے ہیں۔ اگر جو یہ اٹھ جائیں تو.....؟

وہ شام اماوس کی رات کے ساتھ اتری تھی۔

وہ دونوں باپ بیٹی آدھی رات کو گھر آئے تھے۔ دونوں نے کشمالہ کے کمرے کا رخ کیا تھا جہاں وہ نیند کی گولیوں کی وجہ سے سو رہی تھیں۔ عدن ان کے سر کو گود میں لے کر بیٹھ گئی تھی۔

مسٹر جبار نے اپنے آپ کو اس عورت کے قدموں کے پاس پایا تھا جو تمام عمر ان کے لیے بس جاہل اور گنوار ہی رہی تھی۔

وہ کامل تھے، خود کو سمجھتے تھے۔ کاملیت انسان کو زیب نہیں دیتی۔

☆.....☆.....☆

اندرون لاہور کے اس گھر میں اتنا سناٹا کبھی بھی نہیں رہا تھا جتنا اس دن تھا۔ شام کے اس پہر نیلم اکثر جھروکے میں کھڑی ہو کر فون پر گپیں ہانکتی تھی اور وقفے وقفے سے اس کے قہقہے سنائی دے ہی جاتے تھے۔ اماں اور نیلم کہیں گئی ہوئی تھیں۔ ماہین ابراہیم اپنے اسکول کی کاپیوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے کے گرد جو چند لٹیں تھیں ان بالوں میں بھی چاندی کی جھلک واضح تھی۔ دور کہیں سے راگ درباری گایا جا رہا تھا۔ کچھ جنگلی کبوتروں کی مسلسل غٹرغوں کی آوازیں..... بسنت کا شور.....

نتاشا پانی کا گلاس لیے جانے کب سے کھڑکی میں کھڑی تھی۔

''تم ٹھیک ہو، پانی نہیں پی رہیں؟'' ماہین نے اس کے وجود میں در آنے والی خاموشی کا سراغ پانے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں میں بھول گئی تھی۔'' اگلے لمحے نتاشا نے پانی کا گلاس غٹا غٹ سارا چڑھا لیا تھا۔

حساب کی کاپیاں چیک کرتے ہوئے ماہین کو یہ کافی عجیب لگا تھا کہ پیاسے کے پاس پانی ہو اور وہ کہیں اور گھن چکر بنا ہوا ہو۔

''کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' وہ کافی دیر سے کام کر کر کے تھک چکی تھیں تو ذرا دیر کے لیے کاپیاں پرے کھسکا کر اور ساتھ پڑے تھرماس سے چائے کا کپ بھر کر وہ نتاشا کے پاس کھڑکی میں آ گئی تھیں۔

''آپ کو پتا ہے کہ آپ نے مجھے ایک بار کہا تھا کہ بڑے لوگوں کی بیماریاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔

ان کے دکھ بھی بڑے ہوتے ہیں اور ہم جیسے تو بس نزلے، زکام میں مبتلا ہوتے ہیں اور ٹھیک ہو جاتے ہیں۔'' وہ دور آسمانوں میں پتنگوں کے جھرمٹ کو دیکھ رہی تھی۔

''تب آپ کی اس بات کا میں نے اور نیلم نے بڑا مذاق اڑایا تھا مگر آج مجھے لگا آپ نے سچ کہا تھا بڑے لوگوں کی بیماریاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔''

ماہین کو لگا جیسے وہ کوئی اور لڑکی ہو جو نتاشا ابراہیم کے سانچے میں گھس آئی ہے۔

''پرانی جھوٹی بات کو تم اتنے سالوں بعد سچ مان رہی ہو؟ کوئی وجہ تو ہوگی۔''

''ہاں! وجہ تو ہے اور وجہ بھی بہت بڑی۔''

کبوتر اڑانے والوں کی سیٹیوں کا شور بڑھنے لگا تھا۔ دور پتنگیں کٹ گئی تھیں۔ تیز دھار دھاگوں نے بسنت کا تہوار امر کر دیا تھا۔

''کیا وجہ ہے؟''

نتاشا نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

''فردوس گوہر!''

☆.....☆.....☆

فردوس نے کافی کا کپ نتاشا کے سامنے رکھا تھا۔

''تمہارا نام مجھے بہت اچھا لگا نتاشا۔''

وہ دونوں گھر کے عقبی حصے کے لان میں بیٹھی تھیں۔ نتاشا ابراہیم کو اس شیشے اور لکڑی سے بنے صرف گھر نے ہی متاثر نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس گھر کے ہر ہر فرد سے متاثر ہوئی تھی۔

''آپ کا نام بھی تو بہت خوب صورت ہے۔''

فردوس ہنسی تھی۔ جیسے گل لالہ پر بہار اتری ہو۔

''دنیا خوب صورتی کو ہی سراہتی ہے، داد دیتی ہے، مگر بدصورتی کا کیا نتاشا؟''

وہ دونوں کافی کے سپ لے رہی تھیں۔ نتاشا کو اس ملازمت پر آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اس ایک ہفتے میں اس کی زندگی کا نظریہ ہی بدل گیا تھا۔ سامنے بیٹھی اپسرا جو سب کو مکمل نظر آتی تھی،

اس کے وجود کا بھید صرف اور صرف نتاشا ابراہیم کو پتا تھا۔

''انسانوں کو عادت ہے سوال اٹھانے کی، بات کرنے کی، مگر تخلیق کا دکھ اصل چیز ہے۔ جو اس راز کو پا گیا تو پھر اس کے لیے یہ بدصورتی ہی اصل ہے۔ بدصورتی بھی خوب صورتی کا رنگ ہے مگر جو بھید میں ہے۔''

وہ دونوں یونہی باتیں کرتی رہیں۔ فردوس گوہر کو وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ سب سے الگ تھی۔ نتاشا کو ان سات دنوں میں نہیں یاد کہ کبھی اس نے نتاشا سے پہلے کچھ کھایا پیا ہو۔ وہ ہمیشہ پہلے اس کے سامنے رکھتی تھی، پھر کھاتی تھی۔

امپوریم اور فورٹریس گھومتے ہوئے لوگ اسے دیکھ کر بت بن جاتے تھے۔ وہ نتاشا کا ہاتھ تھامے چلتی تھی جیسے وہ اب محفوظ ہے۔ سات دنوں میں اس نے عمر بھر کا اعتماد کر لیا تھا۔ نتاشا کے لیے وہ شاپنگ کا ڈھیر لگا دیتی تھی۔

''یہ سلور بیڈز والے جھمکے تم پر ہی سوٹ کریں گے۔''

وہ دونوں آئس کریم کھاتے ہوئے، شاپنگ کرتے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتی تھیں۔

وہ ایک بہت خوب صورت دن تھا جب دھوپ اور بارش دونوں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہ دونوں چھتریاں تانے گاڑی سے نکل کر امپوریم میں داخل ہوئی تھیں۔ جیسے وہاں لوگوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ مختلف برانڈز شیشے میں سجے متوجہ کر رہے تھے۔ میک اپ، جوتے، کپڑے، ہر چیز موجود تھی۔ جب ان دونوں کو احساس ہوا تھا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے۔

''میم! مجھے لگتا ہے وہ لڑکا کب سے ہمارے پیچھے ہے۔''

''میں نے تمہیں منع بھی کیا ہے، مجھے میم مت کہا کرو۔ میں تمہارے لیے صرف گوہر ہوں۔''

وہ جب بھی اسے میم کہہ کر بلاتی تھی، وہ برا مانتی تھی۔

نتاشا کی بات پر اس نے پلٹ کر اس طرف دیکھا تھا۔ وہ ایک اونچے قد و قامت کا بہت دلکش لڑکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ دل میں کہیں درد سا اٹھا تھا۔ وہ دونوں کافی شاپ میں آ گئی تھیں، تب بھی وہ پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔

''سنیں مس!''

وہ اکیلی بیٹھی تھی۔تب نتاشا واش رومز کی طرف تھی۔آرڈر آنے میں ذرا وقت تھا۔وہ سامنے بیٹھ گیا تھا۔گوہر کو اس کی جرأت پر حیرت ہوئی تھی۔

''کیا میں آپ سے بات کر سکتا ہوں؟''

وہ صرف سر کو ہی ہلا سکی تھی۔

امپوریم کی روشنیوں میں سحر تھا، جادو تھا۔اس سے کہیں زیادہ سحر اس لڑکے کی آنکھوں میں تھا۔

''میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے بار بار دیکھ رہا ہوں۔میرا دل نہیں سنبھل رہا آپ مجھے باقی لڑکوں کی طرح مت سمجھیے گا۔'' ساتھ ساتھ معذرت بھی جاری تھی۔وہ بس اس لڑکے کو دیکھے گئی۔

''میں جانتی ہوں آپ سچ کہہ رہے ہیں۔آپ کے الفاظ اور آپ کی آنکھیں دونوں ایک ہی بات کہہ رہی ہیں مگر مسئلہ صرف ایک ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

کافی کے دو کپوں کا آرڈر آچکا تھا جو میز پر ہی پڑے رہ گئے۔

نتاشا بھی وہیں آ گئی تھی۔

''میرے اندر محبت کا وصف ہی نہیں ہے شاید۔محبت کرنے میں، متاثر ہونے میں اتنی جلدی نہیں کرتے اچھے لڑکے۔'' یہ کہہ کر وہ نتاشا کا ہاتھ پکڑتی ہوئی پلٹ گئی تھی۔

وہ لڑکا حیران وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

امپوریم جیسے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات کے ایڈمیشن آفس کے باہر موجود تھیں۔فیس جمع کروا کر گوہر اور نتاشا نے سارا ڈیپارٹمنٹ وزٹ کیا تھا۔

حمید نظامی ہال والی گیلری جس کی جالی کیفے ٹیریا کی طرف کھلتی تھی، وہاں کچھ اسٹوڈنٹس کا گروپ گٹار بجا رہا تھا۔کچھ دیر وہ دونوں وہیں کھڑی سنتی رہیں۔پھر انہوں نے آغا شورش کاشمیری بھی

وزٹ کیا۔ ڈیپارٹمنٹ کے سامنے ہی طویل گراؤنڈ تھا جہاں میڈیا کے اسٹوڈنٹس اپنے اپنے پروجیکٹس ڈسکس کرنے میں مگن تھے۔ جب تک وہ دونوں وہاں موجود رہیں، پاس سے گزرتے ہوئے لڑکے ان کی طرف مسکراہٹیں اچھالتے رہے تھے۔

اپنے ڈاکومنٹس جمع کروا کر جب وہ دونوں ڈیپارٹمنٹ سے نکل رہی تھیں تو وہیں فردوس گوہر نے ایک سلور رنگ کی کار سے ان دونوں کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

نتاشا نے نظروں کے تعاقب میں دیکھ لیا تھا۔

''آپ جانتی ہیں انہیں؟''

اسے عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔

''نتاشا! مجھے لگتا ہے میں دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی ہوں۔ یہ دونوں.....''

گوہر کے اشارے پر نتاشا نے دوبارہ ان کی طرف دیکھا تھا۔

''ان دونوں کو دیکھ کر لگتا ہے ناں کہ ان سے محبت کی جائے۔''

''گوہر! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ ڈرائیور باہر گیٹ پر انتظار کر رہا ہے۔''

وہ مقام جہاں فردوس گوہر صدیاں رک سکتی تھی، نتاشا ابراہیم نے لمحوں میں اسے واپس حقیقت کی دنیا میں کھینچ لیا تھا۔

دل خام مال نہیں تھا پر تیرے ہجر نے
یوں بے بہا کیا اسے، یہ زمرد ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

باب پنجم

دشتِ لیلیٰ

سائیں وے! میں اندروں اندر خالی
ناں کوئی باغ اے جنے اندر
ناں کوئی میرا مالی
سائیں وے! میں ہجر سرہانے پالا
کالک ملی منہ دے اتے
سینہ اندروں کالا
سائیں وے! میں لہودی دھوڑ کھلاری
اپنا سایہ لبھدی پھردی
میں حیرت دی ماری
سائیں وے! اکھیاں ریت بھرایاں
انھی ہو کے واجاں ماراں
سائیاں سائیاں سائیاں

دشت لیلیٰ کو رات کے اندھیرے نے جادبوچا تھا، پھر بھی وہ کھڑکی سے لگ کر آنکھیں میچ میچ کر آسمان پر چاند ڈھونڈتی رہی تھی کہ کہیں سے کیسے بھی کر کے کوئی روشنی کا ذریعہ تو ہو مگر چار سو سناٹا اور گھپ اندھیرا تھا۔ سیاہی نے سب نگلنا شروع کر دیا تھا۔

http://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.com

روشنی.....

درخت.....

تھل.....

اور تھل واسی.....!

چھکڑ چھکر کے شور کے ساتھ ریل گاڑی چلتی رہی۔ جانے کتنے جنکشن گزرے، قلی سامان ڈھوتے رہے اور وہ بہت خاموشی کے ساتھ ہر ریلوے اسٹیشن پر لگے بوڑھے اور قدیم پیپل کے درختوں کو دیکھتی رہی تھی۔ دل بھر بھر آ رہا تھا۔ سامنے ہی ٹرنک پاس رکھے ابا غنودگی میں تھے۔ آہستہ آہستہ سب کچھ پیچھے چھوٹ رہا تھا۔

اماں، بختاور، شرینہہ، کھگل، تھل اور سکندر.....!

آخری نام اسے کسی ڈنک کی مانند جا لگا تھا۔

اس نے ہاتھ پھیلایا تھا۔ انگلی میں سجی وہ انگوٹھی جیسے کوئی ناگ تھی۔ وہ بختاور سے کتنا لڑی تھی۔

''لاہور جا رہی ہوں بختاور! سات سمندر پار نہیں جا رہی کہ کوئی مجھ پر اعتبار ہی نہیں کر رہا۔''

''بات اعتبار کی ہوتی کنیزاں تو تم شہر بھی نہ جاتیں، کبھی بھی نہیں۔ بات ماحول کی ہوتی ہے، محسوسات کی ہوتی ہے۔ انسان کو نیکی سکون دیتی ہے مگر شر میں کشش ہے، کھینچ لیتا ہے۔''

پیکنگ کرتے ہوئے وہ سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔

''بس کر دو بختاور! سب باتیں ہیں۔''

بختاور نے ساگ کی ہانڈی میں ڈوئی چلائی تھی اور گرم چھینٹے اڑنے لگے تھے مگر وہ برابر گھوٹنا چلا رہی تھی۔

''تم کاش اپنا ناشکرا پن ختم کر لو تو تمہاری زندگی آسان ہو جائے گی۔ زندگی میں ہر ایک کے چاہ پورے نہیں ہوتے، کچھ مجھ جیسوں کی عمریں تو دھوئیں میں آنکھیں نکالتے اور گوہے تھاپتے گزر جاتی ہے۔''

بختاور کے سامنے ایک اسٹیج سج گیا تھا جہاں وہ بس تماشائی تھی اسے بس تالیاں بجانی تھیں۔

''کل کو میں نے، زرقا نے اور شانو نے کہہ دیا کہ ہم نے بھی کوئی کورس کرنے شہر جانا ہے تو ہمیں کوئی بھی نہیں جانے دے گا۔ حق اور فرض کی باتیں صرف تم جیسے پڑھے لکھے لوگوں کو ہی راس آتی ہیں، ہم جیسے تو بات کر کے بھی پوری عمر کی ذلت چہروں پر پوت لیں گے۔''

کچے کوٹھے پر چند کوؤں کی جوڑیاں بیٹھ گئی تھیں۔ اماں مویشیوں کو چارا ڈال رہی تھیں۔ وہ پیکنگ کر کے اب چارپائی پر بیٹھ چکی تھی۔ شام کو سکندر کے ساتھ رشتہ پکا ہو گیا تھا۔ وہ جو اشاروں کی بات تھی، وہ اب حقیقت میں سامنے آ چکی تھی۔

''بات یہ نہیں ہے بختاور!''

''تو کیا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے کسی نے مجھے قید کر دیا ہے جیسے، میرا ذہن ادھر ہی لگا رہے گا، میں لاہور جانے کا سوچ کر ہی بہت خوش تھی مگر یہ رشتہ..... یہ مجھے عجیب طرح سے بار دے رہا ہے۔''

بختاور نے چھینٹوں کی پروا نہیں کی۔ ساگ کے پتے ابلتے رہے، گرم چھینٹوں نے کلائیوں پر نشان چھوڑنے شروع کر دیے تھے۔ بختاور گھونٹنا چلاتی رہی تھی چپ چاپ جیسے بہت کچھ سوچ رہی ہو۔ دور کہیں سے اونٹوں کی ٹلیاں گونجتی رہیں۔ وہ پھر سے اسٹیج کے سامنے بیٹھی تھی۔ تالیاں بجا بجا کر ہاتھ سرخ ہو گئے تھے۔

''کتنی جھلی ہے ناں تو کنیزاں کہ تجھے لوگ فخر اور محبت سے دیکھتے ہیں، تیرے لیے رستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ تجھے ہر اہم موقع پر مہمان بلاتے ہیں مگر ہم جو ساگ گھونٹنے میں کلائیاں جلائیں، گوہے تھاپ تھاپ کر یہاں تک کہ کبھی کھانے کے نوالوں سے بھی باس آتی ہے، چپ چاپ کھا لیتی ہیں۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر دودھ کے ساتھ ساتھ اپنے خواب بھی کاڑھ لیتی ہیں۔ دودھ کڑھ جاتا ہے، خواب جل جاتے ہیں۔''

کنیزاں سناٹے میں آ گئی تھی۔ بختاور کیا سوچتی رہتی تھی، وہ ششدر بیٹھی تھی۔

''جو تو پہنتی اوڑھتی ہے، ہم نے کبھی نہیں پہنا، جو شہری کھانے تو کھاتی ہے، ہمیں تو ان کے نام

تک نہیں پتا۔ وہ جو تو میرے لیے لے کر آتی تھی چاکلیٹ..... ہاں شاید چاکلیٹ..... سب کچھ تو تم نے دیکھا، پرکھا اور برتا.....'' شرینہہ کے پھول پیلے اور زرد ہوا سے اڑ کر چولہے کے پاس آ گئے۔ ''اور ہم نے کیا دیکھا کنیزاں.....! ریت، اونٹ اور کھگل..... بس یہی چیزیں ہماری آنکھوں کا رزق ہیں۔ تم تو لیلیٰ ہو..... یہ تھل تمہارا ہے۔ دشت لیلیٰ ہے..... ہم تو چاک کے کوزے میں نہیں.....''

سنگ چور کی مانند کسی شے نے کنیزاں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے معلوم ہوا تھا کہ سمجھ اور سوچ بڑی شے ہوتی ہے جو ہر انسان کے پاس ہوتی ہے وہ تھل واسی بختاور کے پاس بھی تھی۔

ابا بار بار آ کر پوچھتے تھے۔

''سارا سامان باندھ لیا ہے ناں؟''

''جی ابا! سب کچھ باندھ لیا ہے۔''

اماں کے دل کو صحیح معنوں میں ہول اٹھنا شروع ہو چکے تھے۔

''کنیزاں! میرا دل بہت اوکھا ہو رہا ہے، تو کیسے رہے گی وہاں اکیلی؟''

اس نے اماں کی چارپائی پر بیٹھ کر ان کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔

''اماں! آپ فکر مت کریں۔ میں پہلے بھی تو رہتی رہی ہوں نا، تو اب بھی رہ ہی لوں گی۔ وہ چھوٹا شہر تھا، لاہور بڑا شہر ہے۔''

''اتنے لوگوں میں، موٹر گاڑیوں کو دیکھ کر تیرا دل نہیں گھبراتا؟''

وہ ہنس دی تھی۔

''نہیں اماں! اب تو جیسے عادت سی ہو گئی ہے۔''

اماں کو کسی حد تک مطمئن کرنے کو وہ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی تھی۔ دھیان بٹ گیا تھا۔ وہ چپل وہیں چھوڑتی تاریک رات میں ننگے پاؤں آنگن میں ٹہلنے لگی تھی۔ پیروں کے راستے دل تک سکون اترتا چلا گیا۔ آسمان پر چاند جھول رہا تھا جیسے ابھی کے ابھی ہوا سے لہراتا ہوا کسی ریت کے ٹیلے پر آ گرے گا۔

http://kitaabghar.com

''زندگی بھی کیا چیز ہے کہ مسلسل سفر میں جا رہی ہے مگر اچھا ہے کہ کچھ تو ہو رہا ہے۔''

چاند کی روشنی میں ایک اور سایہ چپکے سے ہم قدم ہو گیا تھا۔

''تو تم کل چلی جاؤں گی؟'' بختاور کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔

''جانا تو ہے ہی۔'' کنیزاں نے آواز میں نرمی بھرنے کی بہت کوشش کی تھی۔

''مجھے تمہیں وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

وہ دونوں رک گئی تھیں، آمنے سامنے ہو کر.....

اب مدعا پر بات کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

''تم نے سچ کہا تھا بختاور.....! انسان کو کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میں تو بس اتنا کہنا چاہتی تھی کہ انسان اور جانور کے کھونٹے میں فرق ہونا چاہیے تھا۔''

''تم بہت پڑھ لکھ گئی ہو مگر کتابیں رٹ لی ہیں کنیزاں، ہم جیسیوں نے چولہوں کے پاس بیٹھ کر ذہن کی تختیاں لکھی ہیں۔ اور تمہیں شاید ایک بات پتا نہیں ہے۔''

''کون سی بات؟'' وہ چونک گئی تھی۔

چاند سرکتا ہوا ٹیلوں کے پار گم ہونے کو تھا۔

''تمہاری آنکھوں میں وفاداری نظر نہیں آتی کنیزاں!''

چاند ٹیلوں کے پار اتر گیا۔ رات ڈھل گئی۔

☆.....☆.....☆

رات ہوتے ہی ہاسٹل کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

تمکین جمال لان میں رکھے پتھر کے ایک بنچ پر اپنے سامان سمیت بیٹھی تھی کیونکہ ہاسٹل کا کلرک ہوا خوری کے لیے باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ اور جب تک وہ حضرت تشریف نہیں لاتے اس نے منتظر ہی رہنا تھا کہ ان سے اپنے کمرے کی چابی پکڑ سکے۔ وقت گزاری کے لیے وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو دلچسپی سے دیکھنے لگی تھی۔

چھت پر ہیڈ فون لگائے کچھ لڑکیاں چہل قدمی میں مصروف تھیں۔ لڑکیاں لان میں رکھے قالین

کو گھسیٹ کر اپنے کمرے کی طرف لے جا رہی تھیں۔ معلوم یوں پڑتا تھا کہ انہوں نے وہ دھونے کے بعد سکھانے کو لان کی دھوپ میں ڈال دیا تھا۔ اونچے قد آدم سنبل اور سفیدے کے درخت آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ایک نظر کے چشمے میں لڑکی نوٹس کا بنڈل تھامے انتہائی ڈپریشن کا شکار نظر آتی تھی۔

''نطشے اور کارل مارکس کے مطابق یہ اصول.....'' آگے وہ بار بار بھول جاتی تھی۔

ذرا فاصلے پر کوریڈور میں ٹی وی لاؤنج تھا جہاں لڑکیوں کا ایک جتھا کوئی ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھا، ساتھ ہی ساتھ کچھ دیر بعد تالیوں کے ساتھ ساتھ چند قہقہے بھی سنائی دے جاتے۔ تمکین کی پشت پر مالٹے کا درخت تھا جس پر ابھی ابھی پھول آئے تھے اور ان کی خوشبو سارے ہاسٹل میں پھیل گئی تھی۔ جو بھی پاس سے گزرتا تھا ایک گہرا سانس لے کر آگے ہو لیتا تھا۔

چند موٹی تازی بلیاں اپنا آپ مشکل سے سنبھالے ادھر ادھر لڑھکتی پھر رہی تھیں۔

کچھ فوٹو گرافی کی شوقین لڑکیاں لان کے پھول پتوں اور پرندوں کے بعد اب فوٹوز کے لیے بلیوں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ سی آ گئی تھی۔

''کتنی مطمئن اور پرسکون سی زندگی نظر آتی ہے جیسے میں کسی محلے میں بیٹھی ہوں اور دیکھنے کو اتنا دلچسپی کا سامان موجود ہے میرے سامنے.....'' سامنے ہی کچھ لڑکیاں چکن اور پیاز پکڑے گزر رہی تھیں۔

''شاید آج شام کا کھانا یہ خود بنائیں گی۔''

بالکونیوں میں لٹکے کپڑے، قد آدم اونچے درخت، کہیں ہلکے سے لوک میوزک کی آوازیں، بلیوں کی میاؤں میاؤں، نطشے اور کارل مارکس کے اصول، مالٹے کے پھولوں کی مسحور کن خوشبو، ہمایوں سعید کرش پر لڑکیوں کے قہقہے اور گوسپس، رات کے اندھیرے میں ہاسٹل کی زرد زرد سی روشنیاں.....

تمکین جمال کو لگا تھا جیسے دل کسی برسات کی بارش کے بعد جیسے سکون میں آ گیا ہو۔

سامنے والا بنچ خالی پڑا تھا جب تک وہ دیکھتی رہی تھی، اب جیسے ہی نظر سامنے اٹھی تھی تو وہاں اسی کی طرح سامان تھامے کوئی اور لڑکی آ کر بیٹھ چکی تھی۔ سندھی شال اوڑھے، ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے وہ تمکین کو اپنے جیسی ہی لگی تھی جو جانے کتنا سفر کر کے یہاں اپنی منزل مقصود تک آ پہنچی تھی۔

☆.....☆.....☆

کنیزاں فاطمہ نے حیرانی سے اپنے چاروں طرف دیکھا تھا۔ یہ کون لوگ تھے اور یہ اتنے خوب صورت اور مکمل کیسے نظر آتے تھے۔ جیسے ساری دنیا انہی کی وجہ سے چل رہی ہو۔

فلیٹ چپل میں مقید لڑکیوں کے گورے پیر، کیچر میں جکڑے سیاہ لمبے بال، مہنگے اور خوشبو دار پرفیوم جن کی مہک اگلے کو کسی اور ہی جہان میں لے جاتی تھی..... لمبی طویل سڑک پر سامان گھسیٹتے ہوئے اسے سامان کے بوجھ کے علاوہ بھی کسی چیز نے تھکا دیا تھا۔ کچھ تھا جو اندر ہی اندر گھس کر بیٹھ گیا تھا۔ گیٹ نمبر چار کے سامنے ہاسٹل کی طویل سڑک تھی جس کے گردار جن کے درخت لگے تھے۔ سنبل اور سفیدے کی بھی بہتات تھی۔ ساتھ ہی گراؤنڈ تھے جہاں کچھ لڑکے فٹ بال کھیلتے نظر آتے اور لڑکیاں گروپس میں واک کر رہی تھیں۔ گھاس اور مکئی کے کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں دھان کی فصل کی مہک بھی سارے ماحول پر حاوی ہو رہی تھی۔

"اگر اماں اور بختاور دیکھ لیں کہ یہاں بھی گھاس، گندم اور دھان کی فصل ہے تو حیران رہ جائیں۔"

پنجاب یونیورسٹی ایک شہر تھا۔ جہاں سب کچھ تھا۔ جدت اور قدامت ہر جگہ کا مقدر نہیں ہوتی کہ جہاں یہ دونوں میسر ہوں۔ پنجاب یونیورسٹی کے در و دیوار کو یہ شرف حاصل تھا۔

ہاسٹل پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی تھی۔ روشنیاں جلتے ہی سامنے لیٹی ہوئی سرمئی سڑک جیسے سانس لینے لگی۔ درختوں کی گھنی چھاؤں کو تیز روشنیوں نے تتر بتر کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ ہاسٹل آ کر لان میں پڑے بنچ پر بیٹھ گئی تھی۔ پسینے سے چہرہ تر ہو رہا تھا۔ جانے کیوں دل پر اداسی نے اچانک حملہ کر دیا تھا۔ بختاور اور اماں کی شدت سے یاد آئی تھی۔ وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو پرے دھکیلنے لگی تھی۔ تب ہی نظر سامنے بیٹھی لڑکی پر پڑی تھی جو اس کی طرح چہرے پر تھکن طاری کیے اپنا سامان اپنے چاروں طرف پھیلائے ہوئے پیروں کو اونچا کر کے بنچ پر سکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔

"جانے کون ہو گی، کہاں سے آئی ہو گی، ہر کوئی اپنے حصے کا سفر کر کے اپنی اپنی منزل پا ہی لیتا ہے۔"

☆.....☆.....☆

لاہور کے موسم کا اعتبار نہیں رہا تھا۔ مغرب کی طرف سے رات کو آندھی اٹھی تھی اور جو بھی میس

ہال میں کھانے کی میز پر موجود تھا اپنا اپنا کھانا چھوڑ کر اپنے کمروں کی کھلی ہوئی کھڑکیوں کو بند کرنے بھاگا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ شاید ساون کی پہلی جھڑی لگنے ہی والی تھی، ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ چند لڑکیاں بالکونیوں سے اپنے دھلے ہوئے کپڑے اتار رہی تھیں۔ نیوز کاؤنٹر پر پڑے ہوئے کل کے باسی اخبار کوریڈور میں اڑنے لگے تھے جنہیں پکڑنے کو بے تاب کچھ انٹلکچوئل لڑکیاں پیچھے پیچھے تھیں۔

وہ دونوں کھچڑی بالوں والے کلرک کے کمرے میں اپنے کمرے کی چابی لینے کو کھڑی تھیں۔ ان دونوں کی انتظار نے مت ماردی تھی۔

''کیا نام ہے آپ کا محترمہ؟'' پین ہاتھ میں تھامے پرنٹر سے پرنٹ نکالتے ہوئے اس نے اچٹتی ہوئی نظر تمکین جمال پر ڈالی تھی۔

''جی تمکین جمال!''

''جمال کی بیٹی ہو؟'' وہ حیرت سے دیکھنے لگی تھی جیسے وہ ابا سے واقفیت رکھتا ہو مگر شاید وہ ویسے ہی بات کر رہا تھا۔

''جی.....!''

''اور محترمہ آپ؟''

تمکین نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ جانے کیوں اسے محسوس ہوا تھا بنچ پر بیٹھی ہوئی وہ عجیب سہمی ہوئی، اداس نظر آئی تھی مگر اب اس کا لہجہ صاف تھا۔ کسی بھی قسم کے سہم سے خالی، پر اعتماد.....

''دیکھیں، آپ دونوں کا ایک ہی کمرہ ہے، کمرہ نمبر اکہتر..... یہ آپ کی چابی ہے، آپ کل تک یہ چالان جمع کروائیں۔''

تمکین نے پرنٹر سے برآمد ہوتا ہوا چالان پکڑ لیا تھا۔

''اگر کمرے میں پنکھے اور لائٹ کا کوئی بھی مسئلہ ہو تو آپ یہاں رپورٹ کیجیے گا، آپ کا مسئلہ حل کر دیا جائے گا۔''

وہ دونوں شکریہ ادا کر کے جانے لگی تھیں جب پیچھے سے آواز آئی۔

''آپ تین لڑکیاں ایک کمرے میں رہیں گی ایک اور لڑکی بھی ایک دو روز تک آجائے گی۔''

وہ دونوں سر ہلاتے ہوئے سامان گھسیٹتے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تیسری منزل پر آ گئی تھیں جہاں کمرہ نمبر ا کہتران کا منتظر تھا۔

ساون کی پھوار گیلریوں سے اڑ اڑ کر ان کے چہروں پر بکھرنے لگی۔ سامنے ہی دھریک کے درخت تھے۔

دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ دونوں گیلری میں ڈھیر ہو گئی تھیں۔

''اللہ معاف کرے، میں تو بے ہوش ہونے والی ہوں۔'' تمکین کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

''کچھ دیر ٹھہر جاتے ہیں۔'' کنیزاں کے بھی حواس سلامت نہیں لگ رہے تھے۔

''تم کس ڈیپارٹمنٹ سے ہو؟''

''کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ سے.....'' کنیزاں نے چادر کو اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لیا تھا۔

''میں کمیونیکیشن سے ہوں۔''

وہ دونوں اتنی تھک گئی تھیں کہ گیلری میں ہی باتیں کرنے لگی تھیں۔ کمرہ سامنے تھا، منزل پر پہنچ گئی تھیں بس تالا ہی تو کھولنا تھا مگر باتوں سے باتیں نکلتی گئیں۔

''ابا تو بار بار پلٹ کر دیکھتے رہے۔ جانتی ہوں کہ بہت پریشان ہوں گے اگر کچھ دیر اور رکتے تو شاید مجھے ساتھ ہی واپس لے جاتے۔ جانے میرے بغیر اکیلے کیسے رہیں گے۔'' تمکین جمال کا لہجہ رند سا گیا تھا۔

ارد گرد لڑکیوں کے ہنسی ٹھٹھول کرتے ہوئے غول گزرتے رہے۔

''ہم لڑکیوں کے لیے تو پھر بھی گھر چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے، میری آنکھوں سے بختاور اور اماں کا چہرہ ہٹ ہی نہیں رہا۔'' وہ واقعی میں کسی لمحے کی زد میں آ گئی تھی۔

سب سے مختلف نظر آنے، زندگی کی دوڑ میں سرپٹ دوڑنے والوں کے لیے پھر مشکلات بھی اسی طرح کی سامنے آتی ہیں۔ حوصلے کی مقدار سے کہیں زیادہ یا برابر ہی ہو جائیں۔

"چلیں، پھر سب کچھ چھوڑنا تو پڑتا ہی ہے۔ اب کمرے کی خبر لیتے ہیں۔" تمکین نے مسکرا کر کہا۔

کنیزاں نے تالے میں چابی گھمائی اور دھیرے سے دروازہ کھولا۔ اور دروازے کے کھلتے ہی جیسے پرانے کھنڈرات کی ساری بوسیدگی اور باس باہر کی جانب بے تاب ہو کر نکلی تھی۔ سامنے ہی کمرے کے کارپٹ سے کچھ مردہ چھپکلیاں چپکی ہوئی تھیں، کچھ پرانے برتن، ایک ٹوٹا ہوا آئینہ جوان کا اپنا ہی منہ چڑا رہا تھا۔ دیواروں کا رنگ چار مختلف رنگوں میں تھا۔ وہ ایک مناسب کمرہ تھا جو کافی عرصہ بند رہنے کی وجہ سے گرد آلود سا ہو گیا تھا۔ تین چار پائیوں جتنی جگہ تھی اور دو لمبے پٹ والی الماریاں تھیں۔ ایک بالکونی کی طرف کھلتا ہوا دروازہ بھی تھا جو تمکین نے کھانستے ہوئے کھولنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دونوں کھانس کھانس کر بے ہوش ہونے لگی تھیں اور گلے میں بھی خارش ہونے لگی تھی۔

ہاسٹل میں کئی جگہوں پر فلٹر لگے تھے۔ وہ تیسری منزل کے فلٹر سے پانی پی کر سانس بحال کر رہی تھیں۔

"ہائے اللہ! مجھے لگتا ہے ہمیں کوئی سزا دی گئی ہے۔ اس کو کیسے صاف کریں گے؟" کنیزاں کے ہوش پرواز کر گئے تھے۔

تمکین لمبے لمبے گھونٹ لے رہی تھی کہ ذرا دماغ ٹھکانے لگے۔

"فکر مت کرو بس، ہم مل کر کر لیں گے۔"

"جتنا گرد و غبار ہے نا اگر دمے سے بچ گئے تو.....!"

"کوئی بات نہیں۔ آج کے دن صفائی تو ہونی ہی ہے، اوپر سے رات ہو گئی ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ آس پڑوس کے کمرے والیوں سے برش اور جھاڑو ادھار مانگ کر صفائی میں جت گئی تھیں۔ کارپٹ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا، جانے کتنی صدیوں سے استعمال ہو رہا تھا۔

"کارپٹ بھی بابا آدم کے زمانے کا لگ رہا ہے۔"

دوپٹے سے چہرہ ڈھانپے کنیزاں سخت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔ ایک پل کو بار بار بختاور کی بات

یاد آجاتی تھی۔

''شکر کی عادت ڈالو، دیکھو تمہارے حصے میں کیا آیا ہے اور میرے ہاتھ خالی ہیں مگر پھر بھی میں راضی اور پرسکون ہوں۔''

پانی والا ٹب بھی کمرہ نمبر پچھتر سے ادھار مانگ کر انہوں نے رات کے وقت فرش دھوڈالا تھا۔ کارپٹ کو پھینک دیا گیا اور یہی طے پایا کہ تیسری روم میٹ کے آنے کے بعد پیسے جمع کر کے کمرے کی چیزیں لی جائیں گی۔

فرش پانی سے صاف ہو گیا۔ پنکھا فل تیز چلا دیا گیا اور الماریوں کی جھاڑ پونچھ کے بعد نیوز کاؤنٹر سے اخبار اٹھا کر وقتی طور پر بندوبست کر لیا۔ موسم اب قدرے صاف ہو گیا تھا مگر ٹھنڈی ہوا اب بھی چل رہی تھی۔

سب کچھ ٹھکانے لگا کر وہ میس ہال لرزتی کانپتی ٹانگوں سے آئی تھیں جہاں منشی جی دانت نکالے کھڑے تھے۔

''انکل! کیا پکا ہے؟''

''بریانی پکی تھی۔''

لفظ ''تھی'' پر زور ڈال کر منشی جی پراسرار ہنسی ہنسنے لگے تھے۔

''کیا مطلب؟'' تمکین کو واقعی میں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''مطلب اب ختم ہو گئی۔''

ان دونوں نے بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ یوں لگا منوں وزن سر پر آپڑا ہو۔ ایک تو تیسری منزل تک سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر ان کا خون جل گیا تھا، اوپر سے آثار قدیمہ جیسا کمرہ جس کی صفائی ستھرائی نے ان کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہاسٹل کی کینٹین پر بیٹھی سینڈوچ اور چائے زہر مار کر رہی تھیں۔

''بندہ اتنی خواری کے بعد چاہتا ہے کہ کچھ اچھا سا کھالے مگر شاید آج ہمارا ہاسٹل کا پہلا دن ایسا

http://kitaabghar.com

ہی قدرت کو منظور تھا۔'' سینڈوچ کھاتے ہوئے تمکین کو دلی دکھ سا ہوا تھا۔

کنیزاں سینڈوچ کھانے کے بعد چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔

''مجھے تو بختاور کا بونٹ پلاؤ یاد آ رہا ہے۔''

وہ اپنے کھانے پینے کے بعد وہیں لان میں ٹہلنے لگی تھیں۔ انہوں نے ٹھنڈی ہوا اور روشن آسمان کی چادر تلے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ گھر کے بارے میں، رشتہ داروں کی، محلے داروں کی، اپنی تعلیمی اسناد و انعامات کی، خوابوں کی، پنجاب یونیورسٹی کے سفر تک کی.....

سب کچھ ایک چند گھنٹوں کی ملاقات میں سمٹ آیا تھا۔

''تم بہت اچھی ہو تمکین کہ تم نے اپنے ابو کا اتنا ساتھ دیا ورنہ آج کل تو میں نے کوئی اتنا میچور نہیں دیکھا جتنی تم ہو۔ میرے پاس ابا ہیں، اماں ہیں، بختاور ہے میں ان سے غصے بھی ہو جاتی ہوں اپنی منوا بھی لیتی ہوں۔ میرا لاڈ کا رشتہ ہے مگر تمہارے پاس ایک ہی رشتہ ہے اپنے ابا کا۔''

کنیزاں فاطمہ نے رشک سے اس سانولی سلونی لڑکی کو بغور دیکھا تھا جس کی پیشانی پر ایک بھی سلوٹ نہیں تھی۔

تمکین جمال کے سامنے جیسے پھر سے وہی شام زندہ ہو گئی تھی۔

وہ ہوم اکنامکس کی کلاس کا پہلا سبق اور پھر اس کا پریکٹیکل جو اس نے کر کے ابا کے سامنے رکھا تھا۔ یہ بھی ایسی ہی شام تھی جو بارشوں کے ساتھ اتری تھی۔ مینہ کے پانی میں بھیگے ہوئے جب وہ تمکین کے اکیلے گھر ہونے کے خیال سے فکر مند ہو کر گھر میں داخل ہوئے تھے تو وہ اپنی ماں کے جہیز کے برتنوں میں چائے تیار کیے بیٹھی تھی۔ چینی کی پرچ، پیالیاں، نمک دانیاں، کالی مرچ چھڑکے ہوئے ابلے ہوئے انڈے.....!

کنیزاں فاطمہ اس قصے پر دم بخود رہ گئی تھی۔

''میں نے اس شام ابا کو بہت خوش دیکھا کنیز..... بہت خوش نظر آ رہے تھے وہ..... بار بار مجھے سینے سے لگا کر کہتے تھے کہ میں آج جیت گیا تمکو.....''

مالٹے کے پھولوں کی خوشبو حاوی ہوتی گئی، کنیزاں کو ساگ میں گھوٹنا چلاتی ہوئی بختاور یاد آئی

تھی۔ کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ یہ بھی محنت ہے، کوئی مرتبہ ہے جسے تعریف کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ وہ اکثر بختاور سے کہتی تھی۔

''بختاور بس کر دیا کرو کبھی تو..... مشین بن جاتی ہو۔''

بختاور دودھ کی بالائی محفوظ کرتی ہوئی اپنی چھوٹی بہن کو دیکھتی تھی۔

''تم پڑھے لکھوں کی اور باتیں ہیں کنیزے..... ہماری اور ہیں۔ تم لوگوں کا پڑھائی سے دل ہٹا تو نمبر کم آئیں گے، شاید پوزیشن نہ بنے..... میں نے اگر رزق بے دلی سے پکایا تو میرا سکون بھی نہیں رہے گا۔ جس دن تمہیں میرے پکے ہوئے کھانے سے سواد نہ ملے تو سمجھ جانا کہ بختاور ڈنڈی مار گئی ہے۔ دل ہٹ گیا ہے۔''

پھر کنیزاں فاطمہ نے ہر بار بختاور کے کھانے سے سواد کی کمی یا موجودگی کے غائب ہونے کو کھوجا تھا مگر ہر بار وہ ناکام ہوئی تھی۔ بختاور کا دل نہیں ہٹا تھا۔ اس کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا کھا کر سواد آ جاتا تھا۔

مگر وہ آخری شام کا ساگ کنیزاں کی زبان کے ذائقے پر اب ابھرا تھا۔

بے ذائقہ..... بھوک مار دینے والا۔

آخری شام چپکے سے بختاور کا دل ہٹ گیا تھا۔ وہ رزق کو توجہ نہیں دے سکی تھی۔

رزق بھی توجہ چاہتا ہے، پھر سواد دیتا ہے، برکت کو آنے کا راستہ دیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

آنکھوں کا خوف سارے وجود کی خوب صورتی پر حاوی ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے والدین کے ساتھ ہی ان کے پاس آیا کرتی تھی۔ مگر آج وہ اکیلی ان کے سامنے موجود تھی۔ چہرے پر ڈھیروں ڈھیر حیرانیاں لیے..... جیسے ڈاکٹر طلال اس کے ہر سوال کا جواب دے دیں گے۔

''میں تھکنے لگی ہوں۔'' ہاتھ مسلتے ہوئے وہ انہیں بہت انتشار کا شکار لگ رہی تھی۔

''تھک کر کیا کریں گی؟'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

کمرے میں ٹہلتے ہوئے مریض سے گفتگو کرنے میں انہیں ہمیشہ سے ہی مزا آیا کرتا تھا۔

http://kitaabghar.com

''آپ کیا چاہتے ہیں، میرے پاس کیا آپشنز ہیں۔'' وہ جیسے دھیرے دھیرے سانس لینے کی تگ ودو میں مصروف سی نظر آتی تھی جیسے کوئی استھما کا مریض سانس کے لیے سر توڑ کوششیں کرتا ہے۔

''زندہ رہنا آپشن نہیں ہوتا۔'' وہ خفا نظر آئے تھے۔

سامنے میز پر ڈھیروں جرنل پڑے تھے، وہ ان دبیز کاغذوں کو دیکھتی رہی تھی۔

''آپ مجھے ایک منزل پر چھوڑ دیں..... میں تھک گئی ہوں، کسی کنارے لگنا چاہتی ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔''

''خود کو مت تھکائیں۔''

''کوشش کر چکی ہوں۔''

''ترک کر دیں..... زندگی کو اس کی رفتار کے ساتھ جیتے ہیں فردوس! اصل رفتار سے..... ایک بار اس کو پکڑ لیا تو پھر سب ٹھیک ہوتا جائے گا۔''

لانبی مسکارے سے سجی ہوئی خوب صورت پلکوں میں مقید ان گہری آنکھوں نے انہیں دیکھا تھا۔

''میں آپ سے کبھی بھی تسلی یا دلاسا نہیں چاہوں گی۔ صرف علاج چاہتی ہوں کہ شور ختم ہو جائے..... سکون آجائے..... تکیے پر سر رکھوں تو نیند آجائے۔''

بالکل غیر محسوس سے انداز میں کمرے کی فضا میں ایک نمی سی چھانے لگی تھی۔

''لوگ مجھے دیکھتے ہیں، انہیں میں مکمل اور پوری نظر آتی ہوں۔ قریب ہونا چاہتے ہیں، مجھے جاننا چاہتے ہیں۔ کھوج لگاتے ہیں مگر میں ڈرتی ہوں خوف میرا پیچھا کرتے ہیں کہ اگر کبھی زندگی میں کسی موڑ پر انہیں خبر ہو کہ فردوس گوہر تو.....'' وہ شاید اب رو رہی تھی ہولے ہولے..... سسکیوں کا ساز کھڑکیوں سے باہر کود گیا۔

''میں نے کل انہیں پھر دیکھا۔ مجھے وہ نظر آجاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں مجھ پر ہوتی ہیں، جیسے میں بھی انہیں پتا ہو..... کہ.....'' بس یہیں تک وہ کہہ سکی تھی۔ اس کے بعد وہ ٹشو باکس سے ٹشو کھینچ کر چہرہ صاف کر رہی تھی۔

ڈاکٹر طلال نے اسے رونے دیا تھا۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ شیشے کی بوتل میں منی پلانٹ ہرا بھرا تھا شاید اس کا پانی بدلنے والا تھا۔ وہ اپنی چہل قدمی مکمل کر کے سامنے میز پر بیٹھ گئے تھے۔

''فردوس! اپنے آپ کو اپنی آنکھ سے دیکھو..... اللہ نے ہر ہر شے بہترین اور مکمل پیدا کی ہے۔ اس کی تخلیق میں کھوٹ نہیں ہے..... ایک مصنف کے لفظ کھوٹے ہو سکتے ہیں، کوئی موسیقار دھن سے خالی ہو سکتا ہے۔ کوئی فلاسفر سوچ سے عاری ہو سکتا ہے..... کوئی مصور رنگوں سے انجان ہو سکتا ہے..... مگر وہ اوپر والا ہے ناں..... اس کی تخلیق مکمل ہے فردوس.....! جسے ہم پرفیکٹ کہتے ہیں۔ تم بھی اس کی تخلیق ہو..... خود کو ویلیو دو۔ زندگی کی رفتار کو دیکھو کہ کس طرف جاتی ہے، کیسے جاتی ہے اور تمہیں کہاں پہنچاتی ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ اپنی اپنی بیماریوں سے لڑ رہے ہیں کہ اور زندہ رہ لیں۔ کچھ لمحے..... مگر زندگی کی رفتار سے پیچھے رہ گئے ہیں..... رفتار نہیں چھوڑتے فردوس!''

وہ آنکھوں کی دھند کے پار منی پلانٹ کی ہری بھری بیل کو دیکھتی رہی تھی۔

''شاید اس منی پلانٹ کو واقعی پانی بدلنے کی ضرورت ہے۔'' وہ ہینڈ بیگ اٹھا کر کھڑی ہوئی تھی جیسے جانے کو پر تول رہی ہو۔

''مجھے..... مجھے جانا چاہیے۔''

فردوس نے یہ نہیں دیکھا کہ ڈاکٹر طلال نے اسے سنا تھا یا نہیں، مگر وہ چپ چاپ آہستہ آہستہ کمرے سے نکل آئی تھی۔

سیڑھیوں پر اس کے اترنے کی چاپ کافی دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ انگلش بلیٹن کی پریکٹس کرنے کے بعد اب اردو بلیٹن کی پریکٹس کر رہی تھی۔

''آرٹس کونسل کے زیر اہتمام چار روزہ تصویری نمائش اختتام پذیر ہو گئی۔''

کاغذوں کا ایک ڈھیر تھا جو وہ پڑھ پڑھ کر نتاشا کو سناتی تھی اور نتاشا ہر بار نقص نکال کر سامنے

لے آتی تھی۔

''آواز کو فلیٹ رکھیں.....نرم ہو..... بھاری پن نہ ہو۔''

وہ آنکھیں بند کیے سارے وجود کی موجودگی کو آواز میں ڈھال لیتی تھی۔ وائس ریکارڈ آن کر کے نتاشا کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیتی تھی۔

انگلش اردو بلیٹن کے ساتھ ساتھ شاعری اور مکالمے کی پریکٹس نے فردوس گوہر کی آواز میں اداکاری بھر دی تھی۔

مجھے معلوم ہے کہ کسی روز
وہ ستارہ ٹوٹ جائے گا
جسے ہم قطب نما کہتے ہیں
رستے بوجھ لیتے ہیں
گر جو وہ ستارہ ٹوٹ بھی جائے
تو بتاؤ رستہ کیسے بوجھو گے
کیسے مجھ تک آؤ گے؟

نتاشا ابراہیم نے فردوس گوہر کو صحیح معنوں میں گھڑنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے پنسل کے سکے کو گھڑتے ہیں۔ نوک برابر کرتے ہیں۔

پائن ایپل جوس کا گلاس فردوس نے نتاشا کو تھما دیا تھا۔

''نتاشا! تمہیں کیا لگتا ہے میں زندگی میں اپنا حصہ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گی ناں؟''

حسین آنکھیں سوالوں سے سجی ہوئی نتاشا کو تکے جاتی تھیں۔

''میں جانتی ہوں اگر اس وقت دنیا میں کسی ایک شخص کو میں اپنے تجربے اور نظر سے کامیاب ہوتا ہوا دیکھ سکتی ہوں تو وہ صرف آپ ہیں۔''

وہ دونوں برابر بیٹھی تھیں۔ فردوس نے کبھی نتاشا کو پرایا نہیں کیا تھا۔ وہ تو سب کو برملا کہا کرتی تھی۔

''نتاشا ابراہیم میرا قطب نما ہے جس کے ذریعے میں رستے دیکھتی ہوں کہ کہاں چلنا ہے کہاں ٹھہرنا ہے۔''

نتاشا کو عقیدت تھی، فردوس گوہر سے.....اس کے وجود سے.....اس کے عیب سے.....اس کے نامکمل ہونے سے۔

''میں آپ کو بار بار یاد دلاتی ہوں آواز پہ قابو پانا مشکل نہیں ہوتا..... جذبات اور دل پر نظر رکھیے گا، یہ اچانک کھسک جاتے ہیں۔ آپ کی آواز پر میری نظر ہے مگر میں آپ کا دل نہیں دیکھ سکتی۔''

پائن ایپل کا سپ لیتے ہوئے فردوس کو اچانک سے ہنسی آئی تھی۔

''تم سب دیکھ سکتی ہو نتاشا.....تمہارے پاس وہ آنکھ ہے جو دل کو بھی کھوج سکتی ہے۔''

کانچ کا گلاس وزنی ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''ہر روز آپ کو سب سے پہلے یہی سمجھاتی ہوں کہ اعتبار مت کیجیے گا۔ امید سے بھی فاصلے پر رہیے گا۔''

وہ ناراض ہو رہی تھی۔ وہ ہو سکتی تھی جب تک وہ اس کی گرومنگ ٹیچر تھی، مگر وہ صرف یہ نہیں تھی۔

''تمہارا اعتبار مجھے کبھی تکلیف نہیں دے گا نتاشا.....''

وہ کتنے یقین سے کہہ رہی تھی۔ نتاشا کو پھر سے اپنا آپ تھکا ہوا لگنے لگا تھا۔ یہیں آ کر وہ سارے پر پانی پھیر دیتی تھی۔

''میرا بھی اعتبار مت کیجیے گا گوہر! وقت بدل جاتا ہے، حالات بدل جاتے ہیں.....دل بدل جاتے ہیں، انسان بدل جاتے ہیں۔''

وہ فردوس گوہر کے اعتبار، امید، توقعات کے سارے کھیتوں کی زمین بنجر کرنے پر محنت کر رہی تھی کہ اس کے بنا کوئی چارہ نہیں، گزارا نہیں.....

جب کوئی چارہ نہ ہو.....گزارا بھی نہ ہو رہا ہو تو پھر کرنا ہی پڑتا ہے۔

''مجھے مشین مت بناؤ نتاشا.....!'' وہ جوس کا گلاس آدھا وہیں چھوڑ کر خفگی سے کھڑکی میں جا

کھڑی ہوئی تھی۔

''اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔'' وہ نرمی سے گویا ہوئی تھی۔

''ڈاکٹر طلال کہتے ہیں زندگی کو رفتار کے ساتھ گزارتے ہیں کہ نہ پیچھے رہیں اور نہ آگے چلیں۔ مگر ڈاکٹر طلال کو کون سمجھائے جس کے پیر ہی نہ ہوں، جو چلنا ہی نہ جانتا ہو..... جو کسی بھی مقابلے کا حصہ نہ ہو تو وہ کیسے رفتار کے ردھم کو پکڑے۔''

نتاشا نے اس کے ذہن میں پنپنے والی جنگ کی بازگشت سن لی تھی۔ وہ جو آج جلدی گھر جانے کا سوچ رہی تھی، وہ کندھے پر اٹکا بیگ وہیں رکھ کر فردوس کے پاس آ گئی تھی۔

''سچ کہتے ہیں وہ..... ان کی بات ٹھیک ہے گوہر..... کچھ لوگ سمجھتے ہیں وہ آزمائش میں ہیں اور وہ ہوتے بھی ہیں۔ مگر وہ آزمائش کا بھی رستہ ہوتے ہیں، جن سے گزر کر کئی گزر جاتے ہیں۔ آپ مسافر نہ بھی ہوں تو آپ سڑک ضرور ہیں کہ مسافر گزر جائیں..... منزل کو پہنچ جائیں۔''

شیشے اور لکڑی سے بنے اس گھر میں خاموشی گھس آئی تھی۔

فردوس پام دیکھتی رہی یہاں تک کہ نتاشا کی طرف پلٹی تھی۔

''مسافر منزل پالیں، سڑک کچھ بھی نہیں نتاشا؟ سب کو اپنا حصہ مل جائے اور مجھے کچھ نہ ملے۔ میرا کیا.....؟ میرا کیا نتاشا؟''

جانے کیسے مچھلیوں کے شیشے میں دراڑ آئی تھی اور سارا پانی بہہ گیا تھا۔ شیشے کی دیواروں سے مچھلیاں بے جان آنکھوں کے ساتھ دم توڑ گئیں۔

☆.....☆.....☆

کھانے کی میز پر اس رات برتنوں کا شور نہیں تھا۔ وہ حیران ہوئی تھیں۔ وہ دونوں باپ بیٹی باتوں میں مگن تھے جیسے ان کا روز کا معمول ہو کہ وہ دنیا کے ہر موضوع پر بات چیت کرتے رہتے ہوں۔ وہ بس چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی تھی۔ سب کچھ کتنا خلاف معمول تھا۔ وہ جبار اور عدن کو نوٹ کر رہی تھیں۔

''مام! آپ آنٹی سندس کی گیدرنگ میں جائیں گی؟''

عدن نے اچانک انہیں متوجہ کیا تھا۔ وہ جو کانٹے میں نوڈلز پھنسانے کی تگ و دو میں تھیں، چونک گئیں۔

''نہیں۔ میں اب کسی گیدرنگ اور پارٹی میں نہیں جاؤں گی۔''

حتمی لہجہ تھا۔ کچھ جتاتا ہوا سا.....

جبار نے گڑبڑا کر عدن کو دیکھا تھا۔

''چلی جانا.....سنا ہے، بہت اچھی پارٹی ہے بلکہ تم تیار رہنا، میں بھی ساتھ جاؤں گا۔''

وہ ہنس دی تھیں.....

جیسے سب جانتی ہوں.....جیسے آئینہ دکھا رہی ہوں۔

''آپ کے ساتھ.....چھوڑیں.....رہنے دیں۔'' یہ کہہ کر وہ میز سے اٹھ گئی تھیں۔

وہ سارا دن انہوں نے برتنوں کے شوکیس سیٹ کیے تھے۔ پرانی قد آدم پینٹنگز کو گھر کے مختلف کونوں میں آویزاں کروا دیا تھا۔ لان کے پودوں کی کانٹ چھانٹ کے سلسلے میں مالی کو ہدایات دینے کے بعد وہ کچن میں آ گئی تھیں۔ آج کافی مدت بعد دل جیسے سکون میں آیا تھا۔ کچن کے مختلف کیبنٹس کھول کھول کر وہ دیکھ رہی تھیں۔

ملازمہ نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

''کیا چاہیے آپ کو؟''

اچانک وہ کیبنٹ کھولتے کھولتے رک سی گئیں۔ انہیں ملکوں والی حویلی میں اپنی ماں کی کہی گئی بات یاد آ گئی تھی۔

''بیٹا! عورت اپنے گھر کا خود خیال رکھتے ہوئے ہی اچھی لگتی ہے۔ باہر کے لوگ تو بس قبضے جمانے آتے ہیں۔ اپنا گھر ہو تو چاکری بھی خود کرو۔ دوسروں کے حوالے کرو گی تو دوسروں جیسا سلوک ہی ملے گا۔''

وہ جانے کیسے راستے سے ہٹ گئی تھیں۔ وہ ان کا اپنا گھر تھا جہاں کی وہ مالکن تھیں۔ وہ سوال کر سکتی تھیں، کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں تھیں۔

http://kitaabghar.com

انہوں نے ملازمہ کو مخاطب کیا تھا۔

''زرینہ! مجھے ماش کی دال منگوادو۔''

''مگر ماش کی دال تو گھر میں کوئی بھی نہیں کھاتا۔''

''جو کہا ہے، اتنا ہی کرو۔''

زرینہ باہر نکل گئی تھی۔ وہ پانی کا گلاس پکڑے گھونٹ گھونٹ پانی پیتی رہیں۔

''گھر ہی تو عورت کی پناہ گاہ ہوتا ہے جہاں وہ راج کر سکتی ہے ورنہ ساری دنیا پرائی ہے۔''

وہ شام جیسے ذائقوں بھری شام تھی۔ سارے گھر میں ماش کی دال کے تڑکے کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ساتھ ساتھ اچار اور دیسی گھی کی خوشبو نے بھوک بڑھادی تھی۔ عدن جبار اور خلیل نے کھانے کی میز پر وہ کھانا خوب سیر ہو کر کھایا تھا۔ وہ انہیں کھانا سرو کر رہی تھیں۔

دیسی گھی لہسن کے تڑکے کے ساتھ ماش کی دال، بیسن کا حلوہ اور تازہ روٹی وہ دونوں سیر ہو کر کھا رہے تھے۔ وہ عدن کو رغبت سے کھاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ وہ جو ہر کھانے پینے کی چیز میں نخرے کرنے کی عادی تھی۔

انہوں نے سرگوشی کے سے انداز میں عدن سے پوچھ لیا۔

''تمہیں کھانا پسند آیا؟''

''ماما! یہ بہت بہت لذیذ ہے۔ آپ زرینہ سے کہیں روز بنایا کرے۔''

''یہ زرینہ نے نہیں بنایا۔''

''تو پھر کس نے بنایا ہے؟'' عدن اور خلیل کے سر کھانے سے اوپر اٹھے تھے۔

''میں نے بنایا ہے۔''

خلیل نے ستائشی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''آنٹی! آپ نے تو سچ میں حیران کر دیا ہے۔ سچ میں..... میں تو ترس گیا تھا اس ذائقے کے لیے۔ اب تو ہر ویک اینڈ پہ میں ڈنر آپ کے ساتھ ہی کروں گا۔''

وہ مسکراتے ہوئے انہیں کھانے کے ساتھ تعریفوں کے پل باندھنے میں مصروف دیکھتی رہیں۔

اماں کتنا سچ کہتی تھیں، عورت کا سکون اس کے گھر اور رزق میں ہوتا ہے، باقی دنیا تو بس بہلاوا ہے۔

''تو عدن کو ماش کی..... دیسی گھی کے لہسن تڑکے کی دال پسند ہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلایا شاید میں نے کبھی کوشش نہیں کی جاننے کی۔''

سوچنے کو بہت کچھ تھا اور ڈھلنے کو رات تھوڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

اندرون کی گلیوں میں تاریکی اور شور کا عجیب امتزاج تھا۔ کندھے پر بیگ ڈالے آس پاس کے لوگوں کو دیکھتے ہوئے اور ان کی زندگیوں کے بارے میں اندازے قیافے لگانے کے بعد جب وہ گھر میں داخل ہوئی تھی تو نیلم سخت بھڑکی ہوئی تھی۔

''یہ کیا کہ آئے، کھایا پیا، اچھا خاصا ٹھونسا اور چل دیے کہ لڑکی پسند نہیں آئی۔ یہ بھلا کہاں کا انصاف ہوا اور اماں..... آپ ایسے ویسوں کو کیوں بلا لیتی ہیں؟''

نتاشا کو اب یاد آیا تھا کہ آج تو ماہین کے رشتے والے آ رہے تھے اور اب آگے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں بچتی تھی جہاں نیلم سب کچھ خود ہی سنا رہی تھی۔

''اور ہاں اماں! جو اتنا کچھ ان لوگوں کو ٹھنسواتی ہیں، وہ ماہی باجی کو ہی کھلا دیا کریں۔ یہ جو دو ٹکے کے لوگ ہر ہفتے پاؤ بھر خون جلانے کو آ جاتے ہیں کم از کم ان کا تو خون بنے گا۔''

کچھ دیر زلزلے کی کیفیت رہی۔

جیسے ہی کہیں سے شور اٹھتا تھا اندرون کی کھڑکیاں کھل جایا کرتی تھیں۔ جانے کیسے سینسر لگے ہوئے تھے۔ اب کی بار نیلم ان ہی کھڑکیوں کی طرف منہ کر کے غصے سے دھاڑی تھی۔

''آؤ آؤ..... زہر بٹ رہا ہے، بھر کر لے جاؤ۔''

ماہین ایک کنارے پر بیٹھ کر بس آنسو بہا رہی تھیں۔ اماں کو عرصہ ہوا نیلم کے ساتھ جنگ و جدل میں حصہ لینے کا ارادہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وہ بیگ ٹیبل پر پھینکتے ہوئے ماہین کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''آپ پریشان مت ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند نتاشا کے گلے آن لگی تھیں۔

http://kitaabghar.com

''اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے ناں.....بس میں ہی کسی کو پسند نہیں آتی۔''

''ارے جانے دیں لوگوں کو.....وقت آئے گا.....بہتر وقت آئے گا۔''

نیلم بپھری ہوئی ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔

''وقت سے پہلے موت نہ آجائے۔''

''تم اپنی زبان سنبھال کر بات کیا کرو۔اگلے کو تسلی دینے کے بجائے تم اور پریشان کر دیتی ہو۔''

نتاشا نے اسے ڈپٹا تھا اور ماہین کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں اکٹھے بیٹھے ہوئے سموسے کھا رہی تھیں۔یہی ہوتا تھا کہ وہ اندرون کے لوگ ڈپریشن جیسی بیماریاں نہیں پالتے تھے۔بس وہ راستے نکال لیتے تھے کہ اس حالت سے نکل جائیں۔

''پریشان نہیں ہوتے.....قدرت کی اسی میں بہتری ہوگی اور ویسے بھی جوڑ سے جوڑ مل کر ہی رہتا ہے۔''

لاہور کا آسمان مٹیالا ہو گیا تھا۔چاند بھی چھپن چھپائی کھیلنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

☆.....☆.....☆

پنجاب یونیورسٹی ہاسٹلز میں صبح کا آغاز ہمیشہ ہی پرندوں کی آوازوں سے ہوتا تھا۔

وہ دونوں رات بھر کی تھکی ہاری خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھیں۔جب کمرہ نمبر اکہتر کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا تھا۔وہ دونوں ایک ساتھ اٹھی تھیں۔

''ہائے اللہ! کیا ہو گیا؟''

پہلے تو یہ تک نہیں سمجھ میں آیا تھا کہ اس وقت کہاں ہیں۔جب تمکین نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی تھوڑے سے سامان اور بے تحاشا تھکن کے احساس کے ساتھ تیسری روم میٹ کھڑی تھی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! آپ کون؟''

سامنے والی نے اس کی نیند بھری آنکھوں کو پہچان لیا تھا۔

''میں سیرت امتیاز ہوں۔''

تمکین کے سوال و جواب کے سیشن کے دوران ہی کنیزاں بھی اٹھ کر دروازے پر آ گئی تھی۔

''مجھے کلرک نے بھیجا ہے۔''

''آ جاؤ بہن.....! ہم دونوں بھی کل شام ہی آئی تھیں۔ ویسے تو یہ کمرہ تمہارے شایان شان نہیں مگر پھر بھی ہمیں اسی میں مل جل کر گزارا کرنا پڑے گا۔''

وہ تینوں مل جل کر گزارا کرنے والیاں کچھ ہی دیر بعد کینٹین میں آلو کے پراٹھوں کا ناشتا اڑا رہی تھیں اور ساتھ سیرت کا انٹرویو بھی جاری و ساری تھا۔

''میرے ابو باہر ہوتے ہیں.....امی اور ہم بچے یہیں ہوتے ہیں۔''

سیرت امتیاز کو پتا بھی نہیں تھا کہ جن رشتوں کو وہ کبھی اہمیت ہی نہیں دیتی تھی آج وہ چپکے سے ان سب رشتوں کا تعارف کرا گئی تھی۔

زندگی یہی کرتی ہے کہ ہمارے فارمولے کا جواب اپنی مرضی کا ہی نکال کر سامنے رکھتی ہے۔

ابھی تین دن بعد کلاسز کا آغاز ہونا تھا مگر اس سے پہلے ہاسٹل کا چالان بینک میں جمع کروانا مسئلہ عظیم تھا۔

پنجاب یونیورسٹی اپنے رقبے میں اتنی بڑی ہے کہ آپ پیدل چل چل کر تھک جاتے ہیں مگر اس کا رقبہ ختم نہیں ہوتا۔ وہ تینوں بھی جب ہانپتی کانپتی فیصل آڈیٹوریم کے پاس بینک فیس چالان جمع کروانے پہنچیں تو سارے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک طرف لڑکوں اور دوسری طرف لڑکیوں کی لمبی قطاریں تھیں جو اپنی اپنی باری کے منتظر تھے۔ وہ تینوں بھی قطار میں لگ گئیں۔ وہ جو منٹوں کی بات نظر آتی تھی وہ کئی گھنٹوں پر محیط نظر آنے لگی تھی۔

دوپہر سے سہ پہر ہو گئی مگر شیطان کی آنت کی مانند لمبی قطار ان کا منہ چڑاتی رہی یہاں تک کہ بھوک سے برا حال ہو گیا۔ ایک دوسرے کی باری کی حفاظت کرتے ہوئے انہوں نے سیرت کو برگر لینے بھیجا۔ ساتھ ہی مین کیفے تھا۔ جب تک وہ برگر کھا کر سیر ہوئیں تو قطار کم ہو چکی تھی۔

بالآخر فیس جمع کروانے کے بعد وہ یونیورسٹی کی سڑکوں پر مٹر گشت کرتی رہیں تا کہ جان پہچان ہو جائے۔ ایس ٹی سی، مین کیفے، وی سی گراؤنڈ اور ہیلے کالج بھی دیکھ لیا گیا۔ ایس ٹی سی طویل کوریڈور تھا

http://kitaabghar.com

جہاں سے پنجاب یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس خریداری کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی تین کپ، کاسمیٹکس، رجسٹرز خریدے اور جب انہوں نے ہاسٹل واپسی کی راہ لی تو شام سر پہ آ چکی تھی۔

ٹی وی لاؤنج سے جھانکی لگا کر، لان میں ٹینس کھیلتی لڑکیوں کو کچھ دیر دلچسپی سے دیکھ کر اور ہاسٹل کے کوریڈورز میں ٹہلتی ہوئی بلیوں کو خوامخواہ ڈراوے دے کر جب وہ تینوں تیسری منزل کمرہ نمبر ا کہتر کے پاس پہنچیں تو سامنے نظر آنے والے منظر نے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

لیلیٰ نے چھوڑا دشت تیری آس پر
نہ تو ملا، نہ راہ گزر اور دشت ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول **لا** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

نایاب جیلانی کا بہت خوبصورت نیا ناول

سلسبیل

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

سحر ساجد کا بہت خوبصورت نیا ناول

میرا بخت

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

چھٹا باب

گیتی آرا

وارث شاہ تیرے دل دا جانی وکدا
راوی دا سبھ پانی وکدا
اکھادے سبھ اتھرو وکدے
شاماں وکدیاں، دوپہراں وکدیاں
ایتھے شکر دوپہری وکدی
ایتھے لکھاں روندیاں دھیاں وکدیاں
ایتھے بندتے، بوہے، وکے
ایتھے میرا کمرا وکیا
اوہدے میرے ہاسے وکے
اوہدے میرے اتھرو وکے
ایش ٹرے توں سانبھے ہوئے
سگریٹ دے اوہ ٹوٹے وکے
اوہ کوئل دی کوکاں وکیاں
میریاں ساریاں ہوکاں وکیاں
آ ویکھ ذرا او وارث شاہ
ایتھے میرا کلی دا
اکلاپا وکیا، او یکھتاں سئی
اک گلی وکی، اوتداں اکلاپا وکیا

http://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.comhttp://kitaabghar.com

گیتی آرا سبب بن جاتی تھی شام کے حسین ترین ہونے کی کہ ساری ہاسٹل کی لڑکیاں جھرمٹ ڈالے اس کے گرد جمع ہو جاتی تھیں جیسے وہ کوئی پہنچی ہوئی، دیوداسی تھی، جوگن تھی یا پھر قیس کی عذرا۔ بات بس اتنی تھی کہ وہ گیتی آرا تھی اور وہ اپنے آپ کو بس یہی کہلوانا پسند کرتی تھی۔

وہ ایسی شخصیت کی مالک تھی جس کی ہر ادا با کمال تھی۔ وہ بولتی تھی تو جھرنے پھوٹ پڑتے تھے۔ وہ ہنستی تھی تو ''راگ درباری'' ہو جاتی تھی۔ اور جب وہ شعر پڑھتی تھی وہ ''راگ پہاڑی'' ہوتی تھی۔ سننے والے دونوں کان حاضر کر کے وجود کو مکمل سماعت میں رکھ کر اسے سنتے تھے۔ پورے ہاسٹل میں اس کے پہننے اوڑھنے چلنے پھرنے کے چرچے تھے۔ وہ سیاہ اور سفید پہنتی تھی۔ وہ عود کا عطر لگا کر ہاسٹل کی راہداریوں میں پھرا کرتی تھی کہ لڑکیاں اس پراسرار اپسرا کر ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھیں۔

فیض کی نسخہ ہائے وفا کی پرانی جلد تھامے لمبے گھنے ناگن بالوں میں کوئی سوکھا گلاب اٹھائے ہوئے جب وہ کامن روم میں اتنی بڑی تعداد میں لڑکیوں کے سامنے شعر پڑھتی تھی تو ان کے کنوارے دل دھڑک دھڑک جاتے تھے۔

ایک سحر طاری ہو جایا کرتا تھا کہ ہر فون خاموشی کی حالت میں ہوتا تھا، ہر کوئی سانس روک لیتا تھا کہ خلل نہ پڑ جائے۔ وہ کسی بدمزگی کا شکار نہ ہو۔

لڑکیاں اسے تحائف دینے کے لیے مرے جاتی تھیں کہ وہ قبول کر لے مگر وہ اپنی ہیر جیسی مدھر اور دلکش مسکراہٹ سے پرے کر دیتی تھی کیونکہ وہ دینے والوں میں سے تھی، دیالو تھی۔ لوگوں میں اپنا وقت اور لفظ بانٹتی تھی۔

ہر بدھ کی شام وہ سب کامن روم میں اکٹھے ہو کر اس کی منتظر ہوتی تھیں اور وہ شیشے کے دروازے سے سج سج کر کولہاپوری کھسے میں سفید پاؤں جکڑے ہوئے، کالے لباس میں وہی بالوں میں خشک لال گلاب اٹکائے اندر داخل ہوتی تھی۔ سارے کامن روم میں عود کی مہک پھیل جایا کرتی تھی۔ وہ گیتی آرا کا سحر تھا کہ وہ اکیسویں صدی کے ان انسانوں کو پتھر کے زمانے میں لے جایا کرتی تھی۔

وہ بات کا آغاز اس جملے سے کرتی تھی۔

''سنو لوگو! میں ایک عشق زادی ہوں کہ جسے دنیا گیتی آرا کہتی ہے۔''

☆.....☆.....☆

وہ تینوں ہکا بکا سامنے دیکھ رہی تھیں، ان تینوں کا سامان باہر فرش پر نظر آ رہا تھا۔ اسپورٹس ڈپارٹمنٹ کی لڑکیاں اپنا سامان ان کے کمرے میں شفٹ کر چکی تھیں۔ تینوں کو ایک ساتھ ہی رونا آیا تھا۔

''یہ آپ نے کیا کہا؟''

دل کیا ان ہٹی کٹی لڑکیوں کو ہاسٹل کی آخری منزل سے نیچے اچھال دیں ورنہ نہر میں ہی غوطے دے کر مار دیں۔

''کیا کیا ہے؟ یہ ہمارا کمرہ ہے آپ کلرک سے جا کر پوچھیں کہ اس نے آپ کو یہ کیوں دیا ہے۔ یہ اسپورٹس ڈپارٹمنٹ والوں کا ہے۔''

وہ تینوں غصے میں بھری ہوئی کھڑی بالوں والے کلرک کے سامنے تھیں۔

آج پھر پرنٹر کا ٹونر ختم تھا اور پرنٹ مٹے مٹے سے نکل رہے تھے۔

''جی کیا مسئلہ ہے؟'' اتنا مطمئن انداز تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

تمکین نے غصے سے انہیں دیکھا۔

''انہوں نے ہمارا سامان باہر پھینک دیا ہے۔''

آنکھیں چندھی کر کے تمکین کو دیکھا گیا تھا۔ وہ دونوں بھی نکل کر سامنے آئی تھیں۔

''آپ؟'' کھڑی بالوں میں بال پین ٹھنسا ہوا تھا اور سوالیہ نظریں اب سیرت پر تھیں۔

''سیرت امتیاز۔'' اس نے مری مری آواز میں جواب دیا تھا۔

''آپ کے ابو کا نام یقیناً امتیاز ہوگا''

کنیزاں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

''سر! آپ اگر جازت دیں تو ہم لان میں ایک خیمہ لگا لیں؟''

پرنٹ کی گھر رگھر رمیں کلرک صاحب محفوظ ہوتے نظر آئے تھے۔

''بہت شرارتی ہو تم'' رکو میں ایک اور چابی دیتا ہوں یہ کمرہ اب تم تینوں کا ہے اور کوئی بھی تم سے نہیں چھین سکتا۔''

وہ چابی چھیننے کے سے انداز میں لے کر کمرا ڈھونڈنے کی مہم پر نکلی تھیں اور چوتھی منزل پر پہنچ کر چودہ طبق روشن ہوئے تھے۔

''اس سے اچھا تھا ہمیں مریخ پر کوئی کمرا دے دیتے۔''

تمکین کی ٹانگوں میں درد ہو رہا تھا سیرت نے ڈرتے ڈرتے ہوئے وہ زنگ آلود تالا کھولا تھا اور ایک خطرناک سی بو بے تاب ہو کر باہر نکلی تھی۔ وہ تینوں ڈرتے ڈرتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھیں۔

کمرے کا قالین بوسیدگی کی ہر حالت پار کر چکا تھا۔ بالکونی کے دروازے کے ٹوٹے ہوئے پٹ لہرا رہے تھے سامنے ہی چوہوں کے کترے ہوئے ڈھیروں کا کاغذوں کا ڈھیر تھا۔ الماریوں میں دیمک نے سب چاٹ لیا تھا۔ وہ کھنڈر نما کمرہ انہیں رونے پر مجبور کر دیا تھا۔

''یہ کیسا مذاق کر رہے ہیں ہمارے ساتھ، ہم نے تو پیسے بھرے ہیں۔''

''یہ مری ہوئی چھپکلیوں اور چوہوں کی بو سے تو الٹیاں آ رہی ہیں۔''

مرتے کیا نہ کرتے جب سارے ہاسٹل کی عوام خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی وہ تینوں تیسری منزل سے اپنا سامان چوتھی منزل پر ڈھو رہی تھیں۔

وہیں درختوں کی بہتات کی وجہ سے چند جنگلی موٹی تازی چمگادڑیں بھی ان کے سروں سے فراٹے بھرتی گزر رہی تھیں۔

''یہ پنجاب یونیورسٹی ہے یا کوئی جنگل ہے۔''

''میں نے تو فیس بک پر ہاسٹل کی اتنی خواب صورت تصویریں دیکھی تھیں کہ دل ہی آ گیا تھا کہ تصریروں سے سجے ہوئے کمرے، لٹکتے ہوئے قالین اور انڈور پلانٹس سے سجی بالکونیاں۔''

سیرت کا قلق سے برا حال تھا۔ کنیزاں اور تمکین بکسے اندر رکھ رہی تھیں۔

''بہن، تم سمجھ لو تم نے کوئی خواب دیکھا تھا۔''

''کسی سے پانی والا ٹب اور جھاڑو مانگو کیونکہ سارا فرش دھونا پڑے گا۔''

نیند سے جھولتے ہوئے وہ تینوں ادھر ادھر پھر سے ضروریات کی چیزیں مانگ کر اگلیوں کو واسطے تسلیاں دے کر کہ وہ سچ میں واپس کر دیں گی اب کمرے کا فرش دھو رہی تھیں۔

سیرت نیوز کاؤنٹر سے پرانے اخبار اٹھا لائی تھی جن کو تہہ کر کے الماریوں میں لگا دیا تھا برش سے مرے ہوئے چوہے چھپکلیوں کو نیچے پھینک دیا تھا۔ تینوں نے اپنے اپنے باڈی پرفیوم کمرے میں چھڑکے تھے۔

آدھی رات گزر گئی تھی اور وہ تھک ہار کر گہری نیند میں سو گئی تھیں۔ باقی کام کل کے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹلز میں یونہی زندگی پہلے پہل چھوٹے چھوٹے چیلنج لے کر آتی ہے اور پھر آپ سب چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں.....!

اگلے دن وہ دوپہر دن چڑھے تک سوتی رہی تھیں جب کمرے میں اچانک روشنی کا احساس ہوا تھا تو آنکھیں کھلیں اور معلوم پڑا کہ یہ گھر نہیں ہے یہ لاہور کا آسمان ہے جہاں اب وہ سانس لے رہی تھیں۔

ایک دوسرے کو جگاتے ہوئے صابن ٹوتھ برش اٹھا کر وہ واش رومز کی طرف بھاگی تھیں۔ یہ شکر تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹلز میں واش رومز کثیر تعداد میں ہیں اور صاف ستھرے بھی ہیں۔

''کتنا زبردست قسم کا شور ہے ناں یہاں۔'' ابلے ہوئے انڈے پر کالی مرچ چھڑکتی سیرت نے کہا۔

بھاگتی دوڑتی لڑکیاں جو اپنی کمپین کے پوسٹر اٹھائے ہوئے تھیں۔

کچھ فیشن کی دلدادہ کینٹین میں بھی ٹھنڈا ناشتہ رکھے اپنے بناؤ سنگار میں لگی ہوئی تھیں جیسے دنیا میں اس کے علاوہ کوئی بھی ضروری کام نہیں تھا۔

''چائے کتنی عجیب سی ہے۔'' کنیزاں نے برا سا منہ بنایا تھا تمکین کو اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آ گئی تھی۔

''اپنے گھر کے پانی اور علاقہ کے پانی میں بڑا فرق ہوتا ہے اور دوسرا یہاں ڈبے والا دودھ استعمال ہوتا ہے تقریباً۔''

سیرت آملیٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔

''یہ کیسا مریل سا آملیٹ ہے گھی تو نظر ہی نہیں آرہا بس پیاز انڈیل دیے ہیں۔''

''میں تو کہتی ہوں کہ ہم اپنا کھانا خود بنایا کریں گے۔''

وہ کھانا خود بنانے کے نقصان وفوائد پر بحث کرنے لگی تھیں۔کل سے ان کی کلاسز بھی شروع ہونے والی تھیں۔کل کے لیے پہنے جانے والے کپڑوں کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا تھا۔

جب دوپہر ڈھل رہی تھی اور سورج کی تپش کم ہوگئی تھی تو انہوں نے ہاسٹل کے سامنے ہی رکشا پکڑ کر اچھرہ بازار کا رخ کیا تھا کہ ضرورت کی مزید چیزیں لی جائیں تاکہ آنے والے دنوں میں کسی قسم کی غیر ضروری مصروفیت گلے نہ پڑ جائے کیونکہ کلاسز کے بعد کی روٹین مکمل ہی تبدیل ہو جانی تھی۔

اچھرہ بازار لاہور کا مشہور بازار تھا جہاں سے سب کچھ مل جاتا تھا۔لوگوں کا جم غفیر تھا، یوں لگتا تھا جیسے بڑے شہروں کے ہجوم بھی انسان کو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہوں۔کوئی خوف تھا جو ان تینوں کے چہروں کو سفیدی میں ڈھال گیا تھا۔

دکانداروں کی بھانت بھانت کی آوازیں، لہنگے، چوڑیاں، کراکری ہر چیز کی بہتات تھی۔

ان تینوں نے اس عرصے میں ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا وہ تینوں پردیسی تھیں اور پردیس کا اپنا رنگ ہوتا ہے جو انجان روحوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر رکھ دیتا ہے وہ بھی غیر محسوس طریقے سے جڑ گئی تھیں۔

انہوں نے ایک مناسب پیسوں کا قالین خریدا تھا۔تمکین نے کچھ استعمال کی گئی اچھی حالت میں پڑی پینٹنگز اور گلدان لے لیے تھے۔شام ہو رہی تھی جب وہ تینوں رکشے پر سامان سے لدی پھندی ہاسٹل پہنچی تھیں۔

ہاسٹل گیٹ سے داخلے کے بعد کوریڈور میں چلتی پھرتی عوام کو قالین کی قیمت بتاتا کروہ بمشکل چوتھی منزل کمرہ نمبر چورانوے پہنچی تھیں۔

''میں نے زندگی میں پہلے کبھی اتنی تھکن محسوس نہیں کی، لگتا ہے ہڈیاں بھی اپنے جسم سے کھسک گئی ہیں۔''

تمکین دیوار پر کیل ٹھونک کر تصویریں ٹانگ کران کی پلیسمنٹ دیکھ رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں آج کی خواری آگے سکون سے دن گزارنے میں مدد دے گی۔''

کنیزاں قالین کے کونے کمرے کے فرش پر ماپ رہی تھی۔

''شکر ہے پورا پڑ رہا ہے ورنہ چھوٹا پڑ جاتا تو ایک نئی مصیبت گلے پڑ جانی تھی۔''

ایک تشکر بھرا سانس خارج کر کے اس نے سیرت کو دیکھا تھا جو دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا؟''

اس کا سر گھوم رہا تھا۔

''چائے پینے کو دل ہے۔''

''دل میرا بھی کر رہا ہے۔ میرے پاس راڈ اور چھوٹی دیگچی ہے سامان میں۔ ابا نے مجھے لے کر دی تھی بس پتی اور دودھ نیچے اسٹور سے لانا پڑے گا۔''

سیرت اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ''ٹھیک ہے میں چائے کا سامان لے آتی ہوں تب تک تم لوگ یہ کام نبٹاؤ۔''

وہ کمرے سے نکل کر باہر آ گئی تھی۔ دل جیسے ایک اداسی کی لپیٹ میں آ رہا تھا ایک دم ہی پوپلی بوا کی یاد آ گئی تھی۔ وہ کتنا کٹھور دل لے کر آئی تھی کہ یہ زندگی اب اسے مصروف کر دے گی اور یاد میں کسی کا حصہ بھی نہیں رہے گا، مگر وہ غلط تھی کہ یادوں کو حصوں کی تو ضرورت ہی نہیں ہوتی یہ تو بڑے دھڑلے سے آپ کو پورے دل کو قابو کر لیتی ہیں۔ جکڑ لیتی ہیں.....!

ٹینس کورٹ سے لڑکیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ کچھ لڑکیاں موبائل کانوں سے لگائے کھسر پھسر میں مشغول تھیں۔ جنگلی کبوتر کامن روم کے روشن دان میں بیٹھے غٹرغوں کرتے ہوئے نظر آتے تھے وہیں چند پڑھاکو چشما ٹوڈان کے ایڈیٹوریل پر بحث کر رہی تھیں۔

سیرت امتیاز اپنے دھیان میں تھی جب اس نے اپنے سامنے کوریڈور میں اس لڑکی کی پشت دیکھی تھی۔

اونچا سرو قد، سفید لباس میں ملبوس، پشت پر گھنے سیاہ بال اور دھیرے دھیرے پھیلتی ہوئی عود کی خوشبو، وہ دم بخود رہ گئی تھی۔ ایک رعب تھا جس نے سیرت کو جکڑ لیا تھا اس کا شدت سے دل چاہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کا چہرہ دیکھ سکے مگر وہ جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

کمرے کی چائے کی خوشبو دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی اور یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی ہوں۔ تمکین راڈ کو سوئچ بورڈ پر لگائے چائے بنانے کی ذمہ داری لے چکی تھی۔

سیرت ابھی بھی کہیں کوریڈور میں عود کی خوشبو میں الجھی ہوئی تھی۔

''وہ بہت خوب صورت لگی مجھے جیسے کوئی شہزادی راستے سے بھٹک کر اکیسویں صدی میں آ گئی ہو۔''

کنیزاں نے دلچسپی سے وہ داستان سنی تھی۔ ویسے بھی اسے حسن بہت جلد متاثر کرتا تھا تبھی وہ سیرت سے سوال و جواب کر رہی تھی۔ تمکین ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی چائے کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

''اس کے بال کتنے لمبے تھے؟''

''گھٹنوں تک آ رہے تھے اور اس نے سفید لمبی قمیض پہنی ہوئی تھی اور چوڑی دار پاجامہ کے ساتھ وہ بہت حسین لگ رہی تھی مگر افسوس میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی۔'' اس کا اسے نہ دیکھ سکنے کا قلق ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔

''چلو کوئی بات نہیں اسی ہاسٹل میں ہے تو کبھی نہ کبھی اسے دیکھ ہی لو گی تم۔''

''اگر تب وہ اتنی اچھی نہ لگ رہی ہوئی تو؟''

تمکین کو سیرت کے اس بے تکے سوال پر ہنسی آ گئی تھی۔

''بس کر دو تم۔ چائے پیو تم دونوں اور مجھے دا دو۔''

وہ تینوں اپنے اپنے کپ لے کر بالکونی میں کھڑی ہو گئی تھیں اور ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ کبھی سیرت کا فون بج اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا اور گہری سانس لی تھی۔

''کس کا فون ہے؟'' چائے کی چسکی لیتی ہوئی کنیزاں نے پوچھا۔

''آیت کا ہے۔'' سیرت چائے کا کپ اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔ اب وہ دونوں ہاسٹل کی بلڈنگ کی قدامت پر گفتگو کر رہی تھیں۔

سیرت کھلے آسمان تلے چھت پر چلی آئی تھی۔

دوسری طرف آیت کی آواز ابھر رہی تھی۔

''کیسی ہو؟'' کتنا غیر ضروری سا سوال تھا جو ان دونوں کو کرنا پڑ رہا تھا۔

''زندہ ہوں۔'' سیرت نے کپ کی حرارت اپنی انگلی کی پوروں میں جذب ہوتی ہوئی محسوس کی تھی۔

''ہاسٹل میس والے آج کل تمہیں زہر کھلا رہے ہیں کیا؟''

''زہر کھانے کے بعد کون زندہ رہ سکتا ہے۔'' سیرت کو بے طرح کی ہنسی آئی تھی۔ نیلا آسمان کسی کینوس کی طرح سر پر پھیلا ہوا تھا جہاں چند پرندے گزرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''تم رہ سکتی ہو۔ تمہاری گھٹی میں بھی تو زہر کی ملاوٹ ہے ناں۔ خیر، پوپلی بوا تمہارے بارے میں خاصی فکر مند تھیں تو میں نے سوچا تمہاری بات کروا دوں۔'' آیت فون پر پوپلی بوا کو دے کر شاید وہاں سے جا چکی تھی۔

سیرت نے کوشش کی تھی کہ وہ اپنی آواز پر قابو پا سکے مگر سب تدبیریں ناکام ہو گئی تھیں۔ سب کچھ زندہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''بوا کیسی ہیں؟'' دل نے دوسری طرف تار جوڑ دیئے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری فکر رہی ہے، برے برے خواب آتے رہے کہ تمہیں ایک گھنے جنگل میں اکیلا بھاگتے ہوئے دیکھتی ہوں اور آنکھ کھل جاتی ہے تبھی فکر مند ہو رہی تھی کہ جانے تم کس حال میں ہو گی۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں بوا۔ آپ پریشان مت ہوں۔''

پوپلی بوا نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھی تھیں۔ گلدان سے پرانے پھول نکال کر پھینکتے ہوئے آیت نے بوا کے لہجے کی اداسی کی شدت کو محسوس کیا تھا۔

''میں نے امتیاز کو کہا ہے کہ وقتاً فوقتاً تمہاری خبر کو فون کرتا رہے۔ اب تو اس کا فرض بنتا ہے

جوان اولاد گھر سے باہر ہے۔"

سیرت سر جھکائے ہاسٹل کی چھت کی ٹائلیں گنتی رہی۔ وہ جو کب سے چائے کا شور مچاتی رہی تھی اب چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور تھکن پھر سے بڑھ گئی تھی۔

"آپ انہیں مت کہیے گا۔ یہ بھیک میں مانگی ہوئی محبت میں ڈیزرو نہیں کرتی بوا۔"

وہ آنسو پونچھنے لگی تھی جب دوسری طرف سے اچانک آیت کی آواز ابھری تھی۔

"اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہو سیرت امتیاز؟"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔"

وہ غصے سے کہہ کو فون بند کرتی مڑی تھی، اس کے ہاتھ میں ٹھنڈی چائے کا کپ تھا جب اچانک ہی وہ سامنے آئی تھی۔ وہی سفید لباس میں ملبوس فیض احمد فیض کی نسخہ ہائے وفا ہاتھوں میں تھامے ہوئے۔ کتنا روشن چہرہ تھا، جس پر جگنو سی آنکھیں سجی ہوئی تھیں۔

"کس کو بھاڑ میں جھونک رہی ہو لڑکی؟"

وہ سیرت کی طرف بس سوال اچھال کر سیڑھیاں اتر گئی تھی اور سیرت کمرے کی طرف بھاگی تھی۔

"ان کو چاہیے کچھ تو بلڈنگ میں تبدیلی کریں اور سہولیات میں اضافہ ہو۔"

وہ دونوں اپنی چائے ختم کر کے وہی ہاسٹل کی عمارت کے طرز تعمیر پر بحث کر رہی تھیں جب کھلے دروازے سے سیرت ہانپتی کانپتی ہوئی اندر آئی تھی۔

"میں نے اسے دیکھ لیا۔" انہوں نے اچنبھے سے دیکھا تھا۔

"کس کی بات کر رہی ہو؟"

"اسی لڑکی کی۔"

تمکین ان دونوں سے خالی کپ لے کر دھونے کے لیے باہر جا رہی تھی۔

"تم دونوں کا تو دماغ ہی چل گیا ہے بعد میں پتا چلے کہ ہاسٹل میں کوئی بدروح گھومتی رہتی ہے جو بس کچھ لڑکیوں کو ہی نظر آتی ہے بس۔ تم دونوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

☆.....☆.....☆

عصر کے وقت مشرق سے اٹھنے والی آندھی ہمیشہ ہی سے تھل واسیوں کو سخت پریشان کرتی تھی کہ ہر طرف ریت کی چادر چھا جاتی تھی۔ مویشی الگ ڈکارنے لگتے تھے اور ہر کھانے کا برتن مٹی مٹی ہو جاتا تھا اور گھر کا سارا سامان دھلنے میں ہفتوں گزر جاتے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی آندھی گزر کر گئی تھی اور اب بس ہوا سے درختوں کا شور ہی تھا۔

بختاور فون کان سے لگائے کنیزاں سے بات کرنے میں مصروف تھی جو اسے تمکین اور سیرت کی اچھائی کے بارے میں بتا رہی تھی جسے بختاور مسکراتے ہوئے دلچسپی سے سن رہی تھی۔

''بس پھر مت پوچھو کہ ہمارے ساتھ ہاتھ ہو گیا اور ہمیں آدمی رات تک کمرے کی صفائی کر کے رہنے کے لائق بنانا پڑا۔ ابھی بھی ہلکی سی بو باقی ہے مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''چلو اچھا ہوا، کمرہ تو مل گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ تم لوگ ٹھیک کرتی رہنا۔ میں نے جو چادر دی تھی کیا وہ بچھائی تم نے؟'' بختاور کو اپنی دی ہوئی چادر کا مصرف جاننے کی جلدی تھی۔

''ہاں ہاں میں نے وہی ڈالی ہوئی ہے سیرت تو کہہ رہی ہے ایسی ہی چادر وہ اپنے جہیز کے لیے تمسے لازمی بنوائے گی۔''

بختاور ہنس دی تھی۔

''ضرور میں بنا دوں گی اسے۔ یہ بھی بھلا کہنے کی بات ہے کوئی۔ کیا اس کا کہیں رشتہ طے ہو چکا ہے؟''

بختاور کے سوال پر استری کرنے کو کپڑے پھیلائے بیٹھی سیرت سے کنیزاں نے پوچھا تھا۔

''بختاور پوچھ رہی ہے کہ کیا تمہارا کہیں رشتہ طے ہو چکا ہے۔''

سیرت نے استری کی سطح پر انگلی رکھ کر حرارت چیک کی تھی۔

''نہیں..... اسے کہو میں تو محبت کی شادی کروں گی۔''

بختاور کی طرف اس کا جواب پہنچ گیا تھا، اسے دوبارہ سے ہنسی آ گئی تھی۔

تبھی سیرت نے اچانک فون سنتی کنیزاں سے پوچھ لیا تھا۔

''کنیز! تمہارا رشتہ ہو چکا ہے کیا؟''

''نہیں۔''

کنیزاں کے جواب نے بختاور کو ٹھٹکا دیا تھا۔ وہ چند لمحے کو جیسے کسی سناٹے کی زد میں آئی تھی۔ اسے اونٹوں کے ٹولے کی ماریں تھامے ہوئے وہ مہر پوش شخص یاد آ گیا تھا۔

''اماں کیسی ہیں۔'' موضوع بدلنے کی اشد ضرورت پیش آ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے وہ بھی، تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔''

''میں بھی تم لوگوں کو بہت یاد کرتی ہوں۔ پہلے پہل تو دل ہی نہیں لگتا تھا مگر اب کچھ کچھ دل لگ گیا ہے۔ بس شام کے وقت اداسی ہو جاتی ہے۔''

بختاور نے سر پر تنی شام کو دیکھا تھا۔ اداسی ریت کے ٹیلوں سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔

''کنیزاں! کیا وہاں آندھیاں آتی ہیں؟''

تھل واسیوں کے لیے آندھیاں چھوٹی قیامت جیسی ہوتی ہیں۔ سب نکل جاتی ہیں۔ فصل، تھگل اور گھر..... ریت کے ٹیلے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تھے۔

وہ سوال بہت اہم تھا۔ بختاور کو جواب نے کھڑے قد سے گرایا تھا۔

''نہیں، بختاور یہاں ویسی آندھیاں نہیں چلتیں۔ یہاں ریت کے ٹیلے نہیں ہیں۔''

کنیزاں فاطمہ کتنی خوش قسمت تھی کہ ریت سے دور دور رہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

چنگیر میں کھانا رکھے اور پانی کا گلاس تھامے ہوئے وہ اپنی سارے دن کی بھوک بھول گئے تھے کہ وہ تمکو کی کال سن رہے تھے جو اپنے باپ کی نصیحت کے بارے میں فکر مند ہو رہی تھی کہ وہ اس کے پیچھے اپنا خیال رکھ بھی رہے تھے یا نہیں۔

''میں ٹھیک ہوں تمکو! بس تم پریشان نہ ہو اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔''

وہ گیلری میں چہل قدمی کرتے ہوئے باقی سب لڑکیوں کی طرح گھر بات کر رہی تھی۔ ہاسٹل کی پیلی اور سفید روشنیاں جل اٹھی تھیں، یہاں رات بھی دن کا سماں پیش کرتی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کو پریشان ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ میری سہیلیاں بہت اچھی ہیں ابا.....''

''پیسے کم پڑیں تو مجھے وقت سے بتا دینا تمکو۔''

انہیں کتنی فکر تھی اپنی اولاد کی وہ چاہ کر بھی اس محبت کا قرض نہیں اتار سکتی تھی۔ انہوں نے کبھی بھی اسے ماں کی کمی کا احساس نہیں دلایا تھا۔

''ابا! آپ فکر مت کریں ابھی مجھے آئے ہوئے دو تین دن ہی تو ہوئے ہیں۔''

''پتر! جو کچھ بھی کھانے کو تیرا دل کرے کھا لیا کر، سب تیرا ہی تو ہے۔''

وہ اپنے بوڑھے باپ سے باتیں کرتی رہی، انہیں چھوٹی سی چھوٹی بات بھی بتا رہی کہ وہ بھی تمکین کی آنکھ سے سب جان لیں۔ سب دیکھ لیں۔

''اچھا تمکو! تم آرام کرو پتر، میں کل شام اسی وقت پھر فون کروں گا۔''

وہ فون بند کرتی ہوئی اندر آ گئی تھی اور اس شام انہوں نے اپنے گھر والوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں کی تھیں۔

''پوپلی بوا کا تو پوچھو مت، مجھے ذرا سی چھینک ہی آ جائے ایسے ایسے کاڑھے بنا کر پلائیں گی کہ بس۔''

کنیزاں نے انہیں بختاور کی بابت بتایا تھا۔

''بختاور کو پتا بھی ہے کہ میں دیسی گھی کھانے کے بارے میں ڈنڈی مار جاتی ہوں مگر ہمیشہ اس نے مجھے مکھن اور دیسی گھی ہی کھلانا ہوتا ہے۔''

تمکین دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھی تھی۔

''مجھے اور ابا کو تو چیچہ وطنی کے نان کباب پسند ہیں اور وہی مزے لے لے کر ہم دونوں کھاتے ہیں۔''

☆.....☆.....☆

''میرا نام فردوس گوہر ہے۔''

پنجاب یونیورسٹی شعبہ ابلاغیات کے حمید نظامی ہال میں ہونے والی وہ تعارفی کلاس تھی۔ جس

میں روسٹرم پر کھڑی فردوست گوہر کی ٹھہری ہوئی آواز نے عدن جبار کو سر اٹھانے پر اچانک مجبور کیا تھا۔

تعارفی کلاس کا اصول تھا کہ سب سے پہلے ہر بندہ روسٹرم پر کھڑا ہو کر اپنا تعارف کرواتا تھا یہاں تک کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں جتنا کچھ بتانا چاہے وہ بتا سکتا تھا۔ ہر طالب علم نے تقریباً پانچ پانچ منٹ اپنے بارے میں کافی بور تقریریں کی تھیں اور سامنے والے سامعین نے سونے سے خود کو بمشکل روکا تھا۔ اور وہیں روسٹرم پر کھڑے ہو کر تعارفی کلاس کا حصہ بننے کی باری فردوس گوہر کی آئی تھی تو وہ بس ایک ہی لائن کے اس جملے سے سب کو حیران کر گئی تھی کہ کوئی اتنے نپے تلے انداز میں کیسے اپنا تعارف کروا سکتا تھا۔

جو جو لوگ اپنے تعارف میں پانچ منٹ کی بور تقریریں کر کے گئے تھے انہیں اچانک اپنے سارے الفاظ کے ضائع ہونے کا یقین ہوا تھا۔

میڈم زریں نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا تھا انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا تھا جس کو کوئی بھی نام دینے سے وہ انجان ہی رہی تھیں۔

''آپ کچھ اور بتانا چاہیں گی؟'' انہوں نے خود فردوس کو وقت دیا تھا کہ شاید وہ کچھ کہے۔

مگر ان کے سوال پر بس وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

''میرے پاس بتانے کو اور کچھ بھی نہیں۔''

''میڈم زریں نے پوری کلاس کی طرف دیکھا تھا کہ یہ پہلا تعارف تھا جب وہ اتنے خاموش ہو کر اسے سن رہے تھے۔''

''اگر آپ میں سے کوئی فردوس گوہر سے کوئی سوال پوچھنا چاہے تو؟''

کلاس میں چار ہاتھ کھڑے ہوئے تھے۔ پہلی بار ان چار لوگوں کی آنکھوں سے فردوس کو خوف آیا تھا جیسے وہ مرکز نگاہ تھی، اور لوگ خوردبین لے کر پھر رہے تھے۔ لوگوں نے سب راز پا لیے تو؟ وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔

نتاشا کی آواز جیسے کہیں دور سے مدد کو آئی تھی۔

''خود کو اکیلا سمجھیں گی تو دنیا بھی اکیلا ہی کہے گی۔ خود کو کائنات سمجھیں گی تو دنیا کو بھی کائنات ہی دکھائی دیں گی۔ دنیا کو اپنی طرف آنے کا رستہ دیں گی تو وہ آئیں گے ورنہ کسی کے پاس ہمیں کھوجنے کی مکمل صلاحیتیں نہیں ہوتیں۔ گوہر بس ہم ہوتے ہیں جو خود کو پیش کر دیتے ہیں۔ بس آپ نے کسی کے سامنے خود کو پیش نہیں کرنا کہ کھوجی کھوج کر آئیں۔ آپ بہت باہمت ہیں دنیا میں کسی بھی دوسرے یا تیسرے شخص کہیں زیادہ۔ روسٹرم پر کھڑے ہو کر سامنے بیٹھے لوگوں میں بنچوں کی آخری قطار میں مجھے محسوس کیجیے گا میں وہیں ہوں گی۔ آپ کی مدد کے لیے آپ کو ہر مشکل سے بچانے کے لیے۔''

وہ اپنے پیروں پر کھڑی تھی نتاشا ابراہیم نے دن رات محنت کر کے اسے تراشا تھا۔ وہ نتاشا ابراہیم کا ماسٹر پیس تھی۔ وہ سوال سن رہی تھی جن کے جواب دینے اشد ضروری تھے۔ وہ لوگوں میں تجسس جگا چکی تھی لوگ اسے کھوجنے کو بے تاب تھے۔

''کیا آپ انگیجڈ ہیں؟'' وہ سوال ایک مشہور سیاست دان کے بیٹے جعفر کی طرف سے آیا تھا۔ کلاس میں فلرٹ فلرٹ کی ہوٹنگ ہونے لگی تھی۔

فردوس گوہر کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔ عدن جبار نے وہ رنگ پکڑ لیا تھا۔ وہ اب بہت دلچسپی سے اس کا جواب سننے کو تیار تھی۔

''ہاں میں نے محبت کی ہے۔''

فردوس گوہر کے منہ سے الفاظ کسی قصہ گو کی طرح پھیلے تھے۔

سب نے خود کو غیر آرام دہ محسوس کیا تھا شاید وہ سوال نہیں سمجھی تھی۔

عدن جبار نے فردوس گوہر کو خود کو دیکھتا ہوا پایا تھا۔ نرم آنکھوں سے جیسے کوئی کسی شریر بچے کو دیکھتا ہے کہ کوئی بات نہیں شرارت کر لو تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔

''آپ اتنی خوب صورت کیوں ہیں؟'' جعفر نے اسے پزل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اب کی بار پھر سے مسکرائی تھی۔

''میں خوب صورت نہیں ہوں مسٹر جعفر۔''

اس نے جعفر کا نام یاد رکھا تھا وہاں بیٹھے ہر انسان کو لگا تھا جیسے وہ سب کو جانتی ہو کہ کون کیسا ہے۔

عدن جبار کی زبان سے ایک سوال سلپ ہوا تھا۔

''آپ کی زندگی میں سب سے اہم کیا ہے؟ کوئی چیز، رشتہ یا انسان؟''

وہ عدن جبار سے سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی مگر وہی ہوا تھا، وہ سامنے تھی۔

''میری اپنی ذات کے علاوہ سب کچھ۔''

وہ نرگسیت پسند نہیں تھی وہ جھوٹی بھی نہیں تھی وہ جو بھی کہتی تھی اس پر سب کو یقین آ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔

سیرت نے اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔

''آپ ہمارے گروپ کو جوائن کریں گی؟'' سوال سیرت کی طرف سے آیا تھا مگر جواب کی بے تابی تمکین کے حصے میں آئی تھی۔

''یس۔''

وہ چھوٹا سا انگریزی لفظ آج سے پہلے اتنا خوب صورت بھی نہیں رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

''میں عدن جبار ہوں اور میرا تعلق ایک بیوروکریٹ فیملی سے ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں مجھے ٹریولنگ کا بہت شوق ہے اور میں ورلڈ ٹور بھی پلان کر رہی ہوں۔ باقی میری خوبی یہ ہے کہ میں ایک اچھی دوست ہوں اور میری خامی یہ ہے کہ میں اپنی پسندیدہ چیز کبھی بھی شیئر نہیں کرتی۔ میں اپنی چیزوں اور رشتوں کے بارے میں بہت پوزیسیو ہوں۔''

وہ اپر کلاس گھرانے کی کانفیڈنٹ اور بہترین ڈبیٹر تھی جس کی بات کو نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا۔ اس نے پانچ منٹ کی اپنی موجودگی میں کسی کا بھی دھیان بھٹکنے نہیں دیا تھا۔

فر دوست گوہر کو اس کے نام نے ہانٹ کیا تھا کتنا خوب صورت نام تھا۔

''کاش میں عدن جبار ہوتی۔'' لمحے میں کوئی سوچ آ کر گزر گئی تھی۔

سیرت اور تمکین نے بھی چند لفظوں میں اپنا تعارف کروا کر اس سیشن سے جان چھڑائی تھی۔

ساری کلاس کا تین گھنٹے وہ تعارف چلتا رہا تھا۔ بعد میں روسٹرم میڈم زریں نے سنبھال لیا تھا وہ ایک سوپر شخصیت کی مالک تھیں جن کی وضع قطع بہت متاثر کن تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ سب مختلف علاقوں سے سفر کر کے آئے ہیں کہ ہر کسی کو اپنے خوابوں کے لیے سفر کرنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ کو خواب مل جاتے ہیں، کچھ کو صرف سفر ملتا ہے۔ میں آپ سب کی امیدیں توڑنا نہیں چاہتی مگر میں چاہتی ہوں کہ زندگی کے اس موڑ پر آپ سب ایک بات جان لیں کہ کبھی بھی کچھ بھی عین آپ کی مرضی کے بغیر نہیں ملے گا۔ زندگی کچھ بھی پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کرتی۔ یہی وہ وقت ہے جب آپ ابھی اپنے کیریئر کی داغ بیل ڈالیں گے۔ خواب دیکھیں۔ ضرور دیکھیں، مگر پلیز زمینی خواب دیکھیں جو پورے ہو سکیں۔ آسمانی خوابوں کے لیے سیڑھیاں نہیں ہوتیں۔"

حمید نظامی ہال میں پن ڈراپ سائیلنس تھا میڈم نے چند لمحوں کا وقفہ لیا تھا۔

"آپ سب اینکر نہیں بنیں گے کہ آپ یہاں سے گریجویٹ ہو کر نکلیں تو چینلز آپ کے پیچھے پیچھے ہوں کہ وہ آپ کو ہائیر کرنے کو بے تاب ہیں۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا آپ کی یونیورسٹی لائف بہت پرسکون اور حسین ہے مگر جب آپ گریجویٹ ہو کر باہر مارکیٹ کا سامنا کریں گے تو آپ پر کچھ حقائق کھلیں گے۔ سب بدل چکا ہوگا۔ آپ کو اس بات کا غرور ہوگا کہ آپ ایک مشہور ادارے سے پڑھ کر نکلے ہیں تو آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ یہی خواب اور سفر کا فرق ہے کہ کچھ لوگ اس سفر تک تھک ہار جاتے ہیں۔ کچھ لوگ دوڑ میں رہتے ہیں۔ پریکٹیکل لائف کا بھوت بہت خوف ناک ہوتا ہے کئی بار جان بھی لے لیتا ہے مگر اس سب کے باوجود پر امید بات یہ ہے کہ....."

وہ پھر رک کر منرل واٹر کی بوتل سے پانی پینے لگی تھیں۔ سامنے بیٹھے چہروں پر کئی رنگ آ جا رہے تھے۔

"آپ نے گرنا نہیں ہے۔ اپنی ورتھ پہچانیں، ہمت کریں۔ مارکیٹ کے مطابق اپنی ویلیو بنائیں۔ کچھ لوگ پیسے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ حلال کمانا برا نہیں۔ مگر پیسے کی چاہت انسان کا سکون چھین لیتی ہے۔ تو میرے بچو، یہ آپ کی زندگی ہے خواب دیکھیں، ان کے لیے سفر کریں۔ اور منزل تک

جائیں۔ پھر زندگی مزا دینے لگے گی۔ سب آسان ہوتا جائے گا۔"

تالیاں گونجتی رہیں وہ سب تعارفی سیشن کے بعد کینٹین کی طرف آ گئے تھے جہاں سب اپنے پیٹ میں دوڑتے چوہوں کا علاج ڈھونڈنے آئے تھے۔

تمکین، سیرت اور فردوس نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا تھا۔

سینئرز کا گروپ گٹار تھامے سوچ بیڈ کے والیم پیش کر رہا تھا۔

کچھ پرنٹ میڈیا کے لوگ خبر کی صحیح تعریف کو ڈسکس کر رہے تھے۔ زرد صحافت پر بھی کوئی گروپ چھڑا ہوا تھا۔

وہ تینوں ادھر ادھر کی باتوں کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی کولڈ ڈرنکس کے سپ لے رہی تھیں۔ جب عدن جباران کی میز کی طرف آئی تھی۔

"ہیلو کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" اس نے اجازت طلب کی تھی۔ تینوں نے ایک ساتھ سر ہلایا تھا۔

"سوری مجھے لگا مجھے سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔" عدن نے فردوس کو مخاطب کیا تھا جو اپنے کرل کیے ہوئے بالوں کو بار بار پیچھے کر رہی تھی۔

"مجھے آپ کے سوال نے خوف زدہ نہیں کیا۔" وہ مسکرائی تھی تب تک ویٹر عدن کی کافی ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔

تمکین کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔

"کیوں نہ ہم چاروں ہی اپنا گروپ بنالیں۔"

وہ چاروں ہی ایک ساتھ ہنس دی تھیں۔ وہ ہنسی کا لمحہ ہی انہیں جوڑ گیا تھا بس، پھر انہوں نے ایک دوسرے سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ میڈم زریں کی باتوں کو بھی ڈسکس کیا تھا۔

تمکین نے اداسی سے خالی گلاس کے کنارے پر انگلی پھیری تھی۔

"مجھے لگا تھا واقعی آگے سب آسان ہو جائے گا پریکٹیکل لائف میں۔"

"تم یہ سوچو کہ ہمیں ڈپارٹمنٹ نے دھوکے میں نہیں رکھا۔ کوئی سبز باغ نہیں دکھائے ورنہ کچھ

سال بعد ہمیں زیادہ اذیت اٹھانا پڑتی۔"

"عدن جبار اور فردوست گوہر کی گفتگو، لباس، بول چال نے ان دونوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ سوچنے لگی تھیں کہ آئندہ دنوں میں وہ خود میں کون کون سی تبدیلی لائیں گی۔"

آپ گھر سے کبھی بھی سارے سبق لے کر نہیں آتے۔ کچھ سبق آپ کو اپنے اردگرد کے لوگوں سے لینے پڑتے ہیں۔ بس آپ سبق لینے کی چاہ رکھتے ہوں۔ بس آپ کو کورے کاغذ پر رنگ بھرنے آتے ہوں.....!

فردوس گوہر ذرا کی ذرا آنکھ اٹھا کر عدن جبار کے ہنستے ہوئے چمک دار سفید موتیوں جیسے دانت دیکھ لیتی تھی۔ قدرت نے انہیں اکٹھا کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پنجاب یونیورسٹی کا شمار پاکستان کی قدیم ترین درسگاہوں میں ہوتا ہے جو اپنے طرز علم، فن تعمیر اور ثقافتی ورثے کی وجہ سے بہت عظیم درسگاہ سمجھی جاتی ہے۔ جہاں پاکستان کے مختلف علاقوں کے ساتھ ساتھ بیرون ممالک سے بھی کافی طالب علم حصول علم کی تلاش میں آتے ہیں۔ وسیع و عریض رقبے پر مشتمل پنجاب یونیورسٹی میں پیدل چلنا محال ہی ہوتا تھا۔

اسی وجہ سے یونیورسٹی کے ہاسٹل ایریا اور اکیڈمک ایریا کو جوڑنے کے لیے یونیورسٹی میں انڈر پاسز اور برج تعمیر کیے گئے جو سہولت کے ساتھ ساتھ خوب صورتی میں اضافے کا سبب بھی ہیں۔ وہیں اونچے برج کے نیچے سے لاہور کی قدیم نہر گزرتی ہے جس کے مٹیالے پانیوں کے کنارے اب بھی پیپل اور ہار سنگھار کے درخت نظر آتے ہیں۔ وہیں کبھی کبھی کچھ کشتیاں بھی نظر آتی ہیں جن پر کچھ جوڑے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ لاہور ویسے بھی عشق و محبت کا شہر ہے کہ جس کے گلی کوچوں اور جھروکوں سے محبت دیوانہ وار جھانکتی ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔

وہ دونوں ہانپتی کانپتی ہوئی ہاسٹل پہنچی تھیں اور کپڑے تبدیل کر کے اب استراحت فرما تھیں جب دروازہ دھڑام سے کھول کر کنیزاں اندر کی طرف گری تھی۔

"ہائے مر گئی۔"

''کیا ہوا؟''

''اتنا چل چل کر میری ہمت ہی جواب دے گئی ہے۔ کاش میں بھی تمہاری طرح ماس کمیونیکیشن کر کے جرنلسٹ ہی بن جاتی مگر مجھے ہی کیمسٹ بننے کا شوق چرایا تھا۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔ پہلا دن ہے ناں جلد عادی ہو جاؤ گی۔'' تمکین نے پانی کی بوتل اسے پیش کی تھی جو وہ غٹا غٹ چڑھا گئی تھی۔

جب تک وہ کپڑے بدل کر آئی تھی تو سیرت آج کی تعارفی کلاس کا ذکر چھیڑے ہوئی تھی۔

''کتنی خوب صورت ہے ناں فردوس..... ہے ناں۔'' سیرت نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

تمکین نے تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا تھا۔

''ایک تو میں تم دونوں کی اس حسن پرستی سے سخت عاجز ہوں۔ اچھے بھلے انسان کو بھی احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہو۔''

''یار! ہم لوگوں نے تو جیسے جنگل میں زندگی گزاری ہے۔'' کنیزاں نے سیرت کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ایک نیا انکشاف کیا تھا۔

''یار! ہماری کلاس میں اتنی اپر کلاس کی لڑکیاں ہیں اور اتنے نخرے والی کہ بس اور سچ پوچھو تو ساری کلاس میں میرے ہی زیادہ نمبر ہیں اور پہلا میرٹ بھی میرا ہے مگر پھر بھی میں خود کو ان سب کے سامنے بڑا عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا میں یونی ہو گئی ہوں۔''

وہ تینوں اپنی اپنی جگہ ایک کیفیت کا شکار ہوئی تھیں۔ یہ ایک فطری عمل تھا کہ جب انسان مختلف قسم کے ماحول میں اٹھتا بیٹھتا ہے تو ماحول کی تبدیلی اس کے مزاج پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہونے لگتی ہے۔

تمکین کو خوب غصہ آیا تھا ان دونوں پر۔

''آخری وارننگ ہے یہ تم دونوں کو۔ ادھر بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے اور تم دونوں کے سیاپے ہی ختم نہیں ہو رہے۔ اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں اور نہیں ہے ہمارا تعلق کسی جنگل کے زمانے سے کہ کیلے کے پتوں سے ستر پوشی کرتے پھریں اور پتھر رگڑ رگڑ کر چنگاریوں سے آگ جلائیں۔''

وہ ان دونوں کو ان کی اوقات اچھے سے حفظ کروا کر میس ہال میں لے آئی تھی۔ جہاں مسور کی

دال اور چاول ان کے منتظر تھے۔ کنیزاں نے غور سے مسور کی دال کو دیکھا تھا جو ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ سامنے رکھی تھی۔

''یہ کالی دال ہم نے تو کبھی نہیں پکائی اور نہ ہی کھائی۔''

تمکین نے خشمگیں نظروں سے دونوں کو پھر سے دیکھا تھا۔

''یہ بھی نئی چیز ہے اسے بھی اب قبول کرو۔ اب میں تم دونوں کا کوئی اور لیکچر نہ سنوں۔''

تمکین نے سکون سے مسور چاول کھائے تھے جبکہ وہ دونوں عادت سے مجبور اپنی کھسر پھسر میں مشغول رہی تھیں۔

میس ہال سے نکلتے ہی وہ دوڑ کر کینٹین کی طرف بھاگ اٹھی تھیں۔

تمکین ہکا بکا پیچھے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ جب وہ واپس آئیں تو فروٹ کیک اور چپس کے پیکٹس سے لدی ہوئی تھیں۔

''تم دونوں لاعلاج ہو۔''

وہ اخبار کاؤنٹر پر کھڑی ہو کر میڈم زریں کی ہدایت کے مطابق اخبار کی سرخیوں کے ساتھ ساتھ اداریہ پڑھنے لگی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد کافی لڑکیاں میس ہال میں پڑے سونف والے باؤل سے مٹھی بھر سونٹ اچک کر کھاتے ہوئے اب ادھر ادھر چہل قدمی کرتی پھر رہی تھیں۔ سیرت اور کنیزاں ابھی بھی آنے جانے والی لڑکیوں پر تبصرے کر رہی تھیں۔

سیرت کے ہاتھ کوئی بلی کا بچہ آ گیا تھا جو اس نے جاوید چودھری کا کالم پڑھتی تمکین کے سامنے کیا تھا۔ تمکین ڈر کر پیچھے ہٹی تھی۔ کوریڈور میں لڑکیوں کے کورس میں قہقہے گونجے تھے جیسے وہ اس کی حالت سے محظوظ ہوئی تھیں۔ تبھی ایک کھنکتا ہوا قہقہہ تمکین کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا وہ بے ساختہ مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔

ہنسی روکنے کو منہ پر ہاتھ رکھتی، ایک ہاتھ میں پروین شاکر کی خوشبو تھامے ہوئے عود میں مہکی ہوئی وہ گیتی آرا تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ رات کے پچھلے پہر جب بالکونی میں کھڑی دن بھر کی کارگزاری پر بات کر رہی تھیں تو یوں لگا تھا جیسے ہواؤں نے سارے پر ایک مہربانی کر دی ہو اور کچھ حسین لفظ ہوائیں ادھر ادھر لڑھکاتی پھر رہی ہوں۔ وہ تینوں پل بھر کو کچھ بھی نہ سمجھی تھیں اور پھر انہوں نے بند کمروں کے دروازوں کو کھلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دروازے بھی جو پورے دن میں بس کبھی کبھی ہی کھلتے تھے کیونکہ بقول ان کے وہاں ست روحیں قیام پذیر تھیں۔ گیلری، کوریڈور آوازوں سے گونج رہا تھا۔ بہت سے قدم چلنے کی آوازیں تھیں۔

وہ تینوں بھی کمرے سے باہر نکل کر سیڑھیاں اترنے لگی تھیں، جانے کیا معمہ تھا کیسا ماجرا تھا کہ ہر کوئی اس کی کھوج کو نکلا اور پھر وہیں انہوں نے دیکھ لیا ہاں وہ وہی تھی۔

سیاہ لباس میں ملبوس جس کے لمبے کالے بالوں کی گنیں دونوں طرف کر رہی تھیں۔ کامن روم کے روشندانوں کے کبوتروں کی غٹرغوں بھی بند ہو گئی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ بس وہ تینوں اپنا اپنا سوال لے کر پوچھتی پھر رہی تھیں۔

''یہ کون ہے، یہاں سب کیوں جمع ہیں۔''

تبھی ایک لڑکی کو ترس آیا تھا کہ ان کے تجسس کو ختم کر دے۔

''یہ گیتی آرا ہے۔''

''کون گیتی آرا؟''

''تم گیتی آرا کو نہیں جانتیں افسوس۔''

''مجھے بتاؤ کون ہے یہ۔''

''یہ چولستان کی شاعرہ ہے جو بدھ کی شام کو محفل لگاتی ہے اور شعر سناتی ہے۔ سنا ہے اسے کسی امیر لڑکے سے محبت ہو گئی ہے۔''

تمکین جمال نے، سیرت امتیاز نے، کنیز فاطمہ نے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ واقعی وہ عشق گزیدہ لگتی تھی کہ عشق کی مار جس کو پڑ جائے وہ لاکھوں میں بھی پہچانا جاتا ہے اس کی پیشانی اور آنکھیں چیخ چیخ کر اعلان کرتی ہیں۔ گیتی آرا کا سراپا گواہی دیتا تھا کہ اسے کوئی روگ لگا ہوا ہے۔ وہ

ویسے ہی دکھائی دیتی تھی۔ کہنے والیوں نے کہا تھا۔ وہ چولستان کی شہزادی تھی۔ اس کے اپنے اونٹ تھے۔ وہ موروں کی مالک تھی۔ کئی بار وہ اپنے بالوں میں خشک لال گلاب کے بجائے مور پنکھ لگائے پھرتی تھی۔ جانے یونیورسٹی کے کتنے لڑکے راستوں میں کھڑے اس کی دید کو ترستے تھے، مگر وہ قیس کی عذر تھی کہ قیس کی کہلائے گی تو جانی جائے گی۔ ہیر بنے گی تو رانجھا پہچان دے گا۔

کامن روم کی پیلی پھٹک روشنی میں وہ سامنے کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے سامنے رکھی دیار کی لکڑی کی میز پر کچھ صفحے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ ساری لڑکیوں کو دیکھ کر مسکرائی تھی معمول کی طرح جو وہ ہر بدھ کی رات اپنایا کرتی تھی۔

''میں گیتی آرا ہوں ایک عشق زادی۔''

لوگ عشق کا نام لیتے ہیں تو بے کار لگتا ہے۔ گناہ لگتا ہے۔ وہ نام لیتی تھی تو دعا لگتا تھا، کرنے کو جی چاہتا تھا۔

سارے میں عود کی خوشبو تھی۔ روشن دانوں کے جنگلی کبوتروں نے پَر پھڑ پھڑائے اور گیتی آرا نے شعر پڑھا تھا۔

ہم وہ دیوار تازہ رنگ، جہاں
بے خیالی میں لگ گئے ترے ہاتھ
ہم جو لوگوں پہ ہنس رہے تھے، ہمیں
کس سہولت سے ٹھگ گئے ترے ہاتھ

ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا اور وہ تینوں جیسے کسی سحر میں آ گئی تھیں۔ جیسے وہ ہر دل کو اپنے نرم ہاتھوں سے سہلانے آئی ہو۔

مکرر مکرر کی آوازیں گونجتی رہیں۔ وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی جیسے محفل ختم کر دی ہو۔ ہال میں شور بڑھنے لگا تھا۔

''گیتی رک جائیں۔'' وہ رک گئی تھی۔

''مجھے جانے دیں۔''

''گیتی آپ کو آپ کی محبت ملی؟''

وہ ایک جملہ نہیں انگارہ تھا۔ تبھی وہ سیاہ لباس میں ملبوس پریم ناری سسک اٹھی تھی۔

غم، وہ سفاک سم کا قطرہ ہے
جو رگوں میں اتر کے بس جائے
''زندگی'' وہ اداس ''جوگن'' ہے
جس کو ساون میں سانپ ڈس جائے

☆.....☆.....☆

وہ تینوں گیتی آرا کی کھوج میں لگ گئی تھیں انہوں نے ہر کسی سے پوچھا تھا معلوم ہوا تھا وہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں اردو کی طالبہ تھی اور اسے کسی امیر کبیر لڑکے سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ شاعرہ تھی شعر کہتی تھی اور جب بھی وہ کسی مشاعرے میں جاتی تھی تو ہمیشہ اسٹیج پر ننگے پاؤں ہی جایا کرتی تھی۔ مشاعروں میں کئی ادیب اسے شادی کا پیغام دیتے تھے مگر وہ سب کچھ ٹھکرا دیتی تھی کہ جس کی چاہ ہے وہ میسر نہیں تو باقی دنیا میں کیا رکھا تھا؟

کہنے والوں نے اس کی محبت کو ناکام رکھا تھا مگر وہ ہمیشہ ایک ہی بات کہا کرتی تھی۔

''محبتوں میں زبردستی کے سودے نہیں ہوتے۔''

معلوم پڑا تھا کہ گیتی آرا دل لے کر گئی تھی اور سامنے والے کو جسم ضروری تھا۔ تب سے گیتی آرا دل لیے پھرتی ہے کہ دل سے بڑھ کر کیا ہوتا ہے؟

ہاسٹل کی سڑکوں پر اسے چپ چاپ ٹہلتے ہوئے دیکھا جاتا تھا لڑکیاں ٹولوں کی صورت میں اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں۔ ہاسٹل کے سامنے بہت سارے درختوں کا جھرمٹ تھا جہاں جامن، سفیدے، دھریک کی بہتات تھی۔ کچھ آم کے صدیوں پرانے درختوں کے علاوہ بوہڑ بھی تھے۔ وہیں کچنار کے گلابی پھولوں کا جھنڈ تھا۔ اسی جھنڈ کے نیچے گیتی آرا بیٹھی ہوئی نظر آیا کرتی تھی۔ اپنے لمبے بالوں کے بل

کھولتے ہوئے پاس ہی فیض کی شاعری کی کتاب رکھے ہوئے۔ کبھی کبھی تو وہ اس دنیا کی ہی نہیں لگتی تھی۔

وہ ایک بدھ کی ہی شام تھی جب آسمان کو بادلوں نے گھیر لیا تھا۔ آسمانی بجلیاں کڑکتی تھیں۔ ہاسٹل کا وقت ختم ہو چکا تھا، ساری باہر رہنے والی لڑکیاں واپس آ چکی تھیں۔ وہ بدھ کی غم ناک سی شام تھی جب گیتی آرا کی محفل ہوتی تھی۔ جہاں وہ سب لڑکیاں اکٹھی ہوا کرتی تھیں۔ شام ہوگئی تھی اور آسمان نے برسنا شروع کر دیا تھا۔ تیز بارش نے درختوں تک کو جڑوں سے اکھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ تبھی کامن روم کے سامنے سب جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ معلوم ہوا اس شام گیتی آرا ہاسٹل واپس نہیں آئی تھی۔ موت جیسا سناٹا چھا گیا تھا لڑکیوں کے غول کے غول گیتی آرا کو ڈھونڈنے نکلے تھے کہ کہیں سراغ ملے۔

"گیتی آرا کہاں ہے؟"

برستی بارش میں لڑکیاں چھتریاں لے کر نکل کھڑی ہوئی تھیں۔ نہر کنارے، برج، ہاسٹل کی سڑکوں پر ہر جگہ دیکھ لیا گیا تھا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

درختوں کے جھنڈ میں بوہڑ کے پاس کچنار کے تنے کے ساتھ لگی ہوئی وہ مل گئی تھی۔ سیاہ لباس جسم سے چپک گیا تھا وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بالوں کے لمبے بلوں میں کچنار کے گلابی پھول پھنسے ہوئے تھے۔

وہ رات بھاری تھی۔ گیتی آرا پر۔ سب پر.....! گیتی آرا کی روم میٹس اسے کمرے میں لے گئی تھیں۔ وہ بار بار غنودگی میں جاتی تھی۔

"اس نے کہا وہ عشق کو سمجھ گیا ہے۔ روح کو مان گیا ہے۔ میں نے یقین کر لیا، مگر وہ تو جس جسم م م....."

☆.....☆.....☆

چوں شمع سوزاں، چوں ذرہ حیراں
ہمیشہ گریاں، بہ عشق آں ما
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں

نہ آپ آویں، نہ بھیجیں پتیاں

آداب.....!

میں گیتی آرا ہوں ایک عشق زادی۔

ان تمام کو جو عشق کی راہ میں روح کے لیے دل لے کر نکلتے ہیں اور انہیں جسم سے واسطہ ہو جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آج رات کے کسی بھی پہر میری روح میرے جسم کو چھوڑ کر دور چلی جائے گی اور میرے پیچھے بہت سے فسانے جنم لیں گے کیونکہ یہ عشق کا شہر ہے اور عشق والوں کو داستانیں بھی ضروری ہوتی ہیں۔ میری موت کو کوئی خودکشی کا رنگ نہ دے کیونکہ مجھے لگ رہا ہے کہ کسی بھی وقت میری سانسوں کا تارا کھڑ جائیں گے۔ ہاں میں کچھ کہوں گا وہ سب جو میں محفل میں آپ سب کو کہہ دینا چاہتی تھی مگر مجھے جرأت نہیں کہ آپ سب کے سامنے معاملہ رکھتی مگر اب جب کہ صبح کے اجالے میں میرے مردہ وجود کو آپ دیکھیں گے اور میرے بالوں کی چوٹی سے کچنار کے گلابی پھول کھولے جائیں گے تو پہلی بار آپ کو عود کی خوشبو نہیں ملے گی۔ روشن دان کے جنگلی کبوتروں کو سب علم ہے۔ میں چولستان کی شہزادی ہوں کہ مجھے اپنے باپ کے گھر کے اونٹ اور مور کافی تھے مگر دل حریص ہے یہ کچھ بھی مانگ سکتا ہے۔ مجھے خسرو نے عشق کا سبق پڑھایا تھا تبھی میں دل لے کر پھرا کرتی تھی کہ جہاں دام ملے وہیں بیچوں گی، مگر بیوپاری جسم کے ہیں۔ دل نہیں چاہتے جسم چاہتے ہیں۔

میری لاڈلیو.....!

خون کے رشتوں سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں..... کہ باقی سب دکھاوے ہیں..... اور یہ عشق وشق لغو چیزیں ہیں جو آنکھوں کو اندھا کر دیں۔ گھر کا پھاٹک ہی عزت کا دروازہ ہوتا ہے ساری دنیا فریبی ہے۔ آسمان لفظوں میں کہوں تو آدم اور حوا کے درمیان شر کا رستہ ہے۔ تعلق حلال نہ ہو تو وہ تعلق نہیں ہوتا۔ حرام کشش رکھتا ہے، کھینچ لیتا ہے، جھپٹ لیتا ہے۔ میں نے چولستان کو بددعائیں دی تھیں۔ میں نے اونٹ کو حرام کہا تھا۔ میں نے موروں پر طیش کھایا تھا..... اور میں نے صرف ایک انسان کو سب کے مقابل لا کھڑا کر دیا اور وہ میرا سب کچھ لے گیا۔ اس نے کہا اسے میرا دل قبول ہے۔ میں نے یقین کر لیا لاڈلیو۔

کہا تھا ناں حرام کھینچ لیتا ہے۔ کوئی بھی ہو۔ جو بھی لے کر آئے پرکھ لینا اکثر دل لے کر نہیں آتے۔ لمحے خطاوار ہوتے ہیں۔ انسان پھر سزائیں بھوگتے ہیں۔ میں خوب صورت باتیں کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے مگر مجھ پر بدصورتی کے سارے رنگ عیاں ہیں۔ میں نے عود کی خوشبو کھودی ہے۔ میرے بالوں میں کچنار کھل کر بدبودار مردار کی طرح ہو جائیں گے۔ لوگ مجھ پر تھوکیں گے۔ میری یہ جسم کی بھینٹ چڑھی لاش چولستان جائے گی۔ رونے والوں میں صرف اونٹ اور مور ہوں گے کہ میں نے حرام کھایا ہے.....!

جاؤ لاڈلیو..... رات سر پر کھڑی ہے بس یہی کہنا تھا تمہارے گھر کا پھاٹک ہی سبھی کچھ ہے۔ تمہارے گھر کے مور اونٹ ہی دنیا ہیں۔ باقی سب مردار.....

کوئی دل لے کر آئے تو پرکھ لینا..... کہ ہر کوئی دل نہیں لاتا۔

عشق زادی گیتی آرا۔

پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹلز کی دیواروں پر گیتی آرا کا لکھا گیا وہ خط چسپاں تھا۔ وہ کہہ کر گئی تھی کہ اس کے الفاظ دیواروں کی زینت بنائے جائیں.....!

وہ جو ایک گیتی آرا تھی.....!

لاڈلیوں نے چپ سادھ لی تھی..... گھر چوکھٹ ہیں۔ مائیں دل ہیں۔ بہنیں ساون اور بھائی بہار۔ باقی سب دھوکا۔

راہب مقام آبرو سے گر گیا
محبتوں کی کھوج میں سر دشت ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

باب ہفتم

اخبار زندگی

نکے نکے گھر چڑیاں دے
وڈے وڈے ڈر چڑیاں دے
ڈھیم ماریاں اڈدیاں کیوں نہیں
کھلدے کیوں نہیں پر چڑیاں دے
شکرے باز مگروں کیہہ لتھے
پے گئے کاگ مگر چڑیاں دے
جتھوں تیک زمین دی حداے
حد، بے حد سفر چڑیاں دے
پنجرہ کھول، چڑیاں وچ بہہ کے
چوگا اے دھڑ چڑیاں دے
ست اسمان نگر چڑیاں دے
رب دے گھر وچ گھر چڑیاں دے

اخبار زندگی کے صفحے پلٹ جاتے ہیں۔کل کا واقعہ پرانا ہو جاتا ہے۔سب کچھ جیسے کسی گڑھے میں دفن کر دیا جاتا ہے جیسے گیتی آرا کو چولستان کے ریتلے قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ہر کوئی ایک بار پھر سے اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ہاسٹل کے در و دیوار کے لیے گیتی آرا کا ذکر ممنوع تھا جیسے آسانی سے کندھے اچکا کر کہہ دیا جاتا ہے لو دیکھو رات گئی، بات گئی.....!

http://kitaabghar.com

سب نے ابھی یونیورسٹی کے ماحول کو سمجھنا ہی شروع کیا تھا کہ اسائنمنٹ کا انبار سر پر آن پڑا تھا۔ مسلسل لگا تار کلاسز کے ساتھ ساتھ کام میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا مگر لڑکیوں کے پاس کئی طریقے نکل آتے تھے کہ وہ اپنی گوسپس کی عادات سے سیر ہو جاتی تھیں۔

کوریڈور میں کھڑے ہو کر مس ڈیزی کی پونی ٹیل کو زیر بحث لایا جاتا تھا۔ وہیں گرلز کامن روم میں بال سیٹ کرنے کے بہانے بھی کئی موضوعات کو نمٹا لیا جاتا تھا۔ جس میں سب سے خاص بات یہی ہوتی تھی کہ سبھی کو اپنے بارے میں یہی خوش فہمی تھی کہ گروپ میں کام کا سارا بوجھ ہی اسی کے ناتواں کندھوں پر ہے۔ یہی حال کیمسٹری ڈپارٹمنٹ میں کنیز فاطمہ کا ہوا تھا۔ افلاطون قسم کا گروپ اس کے نصیب میں آیا تھا جنہیں ہر بات پر نروس ہونے اور کرکرے کے ڈھیروں پیکٹ کھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا، اوپر سے پروفیسر گردیزی ہر بار کنیز کی طرف خاص اشارہ کر کے پوری کلاس کے سامنے اسے ہیرو بنانے سے کبھی بھی باز نہیں آتے تھے۔

''مجھے معلوم ہے کہ کیمیا کی دنیا میں یہ لڑکی ضرور کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دے گی۔''

لڑکی زمین میں غرق ہو جاتی تھی، پسینے سے ہتھیلیاں بھیگ جاتی تھیں اور پھر کلاس کے ہر بندے کی اس کی طرف اٹھتی ہوئی ستائش اور حسد کی نظر اسے اور کسی اندھے کھوہ میں پھینک دیتی تھی۔

اس دن تو مانو وہ بختاور کے سامنے رو ہی دی تھی۔

''سر کو ذرا خیال نہیں کہ میری تعریفوں سے باز آ جائیں۔''

''تو تعریف ہی کرتے ہیں ناں جیسے بھی تم اتنی لائق ہو۔''

''میں تھک گئی ہوں بختاور، ریس میں بھاگتے بھاگتے..... کلاس میں پوزیشن لو، بورڈ میں پوزیشن لو اور اب یونیورسٹی گلے پڑ گئی ہے۔''

بختاور نے پھلیوں کے ڈھیر کو سامنے پھیلا کر صاف کرنا شروع کر دیا تھا، عصر ڈھل رہی تھی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں کنیزاں، مگر کوئی بات نہیں ہے۔ انسان کو کسی کے اعتماد کی ٹیگ لگی ہو تو سمجھو وہ گہرے سے گہرا سمندر بھی پار کر جاتا ہے۔''

وہ ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور میں ٹہلتی پھر رہی تھی جہاں کچھ لیبز کے دروازے کھلے ہونے کی وجہ سے محلولوں کی بو سارے کوریڈور میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔

''تم کیا کر رہی ہو؟''

''پھلیاں صاف کرنے میں لگی ہوئی ہوں۔''

''میرا اتنا دل ہے گھر کا کچھ کھانے کو یہاں تو جیسے ذائقے بھی مصنوعی سے ہیں۔'' پھلیوں کا سن کر ہی اس کے منہ میں جیسے بختاور کے ہاتھوں کی پکی ہوئی پھلیوں کا ذائقہ آ گیا تھا۔ خیر اس کے ہاتھوں کی پکی ہر شے کا ذائقہ سارے تھل میں مشہور تھا۔

بختاور اس کے روہانسے سے انداز پر دھیرے سے ہنسی تھی۔ عصر کی ہوا میں مکئی کے کھیتوں کی مخصوص مہک بھری ہوئی تھی۔

''لاہور جا کر لگتا ہے تمہیں کافی ساری چیزوں سے شکایت ہو گئی ہے۔''

''تو کیا کروں۔ ابھی تک اپنے اپارٹمنٹ میں کوئی ڈھنگ کی دوست نہیں بنا پائی ہوں کہ ذرا میں بھی اس کے ساتھ مل کر دوسرے ڈپارٹمنٹس کی سیر کر سکوں۔'' وہ برے برے منہ بنا رہی تھی۔

سامنے سے رجسٹر تھامے سرگردیزی لیب کے سامنے سے گزرے تھے تو وہ ہولے سے رخ موڑ گئی تھی۔

''یہ ڈپارٹمنٹ کیا ہوتے ہیں؟'' بختاور کو ابھی یونیورسٹی کی عمارت کا علم نہیں تھا وہ سارے سوال کنیزاں سے کرتی رہتی تھی۔

''یوں سمجھ لو ہر مضمون کی اپنی عمارت ہوتی ہے۔ گھر ہوتا ہے جہاں کمرے ہوتے ہیں اور وہاں صرف وہی مضمون پڑھایا جاتا ہے۔''

ابھی وہ بات کر رہی تھی کہ فائر الارم شروع ہو گئے۔ کلریکل اسٹاف کی دوڑیں لگ گئی تھیں اور مس ڈیزی ہانپتی کانپتی ہوئی اسٹوڈنٹس کے جم غفیر کے ساتھ کوریڈور میں دوڑ رہی تھیں۔ سارے چہرے حواس باختہ تھے۔

کنیزاں فاطمہ کے چہرے پر ایک حقیقی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی جو بعد میں ایک قہقہے میں ڈھل گئی تھی۔
یہ ہفتے میں چوتھی بار ہو رہا تھا کہ مس ڈیزی کا تجربہ ناکام ہوا تھا اور لیب میں آگ لگ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''کتا انسان کو کاٹے تو یہ خبر نہیں ہے، انسان کتے کو کاٹے تو یہ خبر ہوگی۔''
گوندل صاحب خبر کی تعریف کر رہے تھے اور سامنے بیٹھے اسٹوڈنٹس ہکا بکا کتے اور انسان کی خبر سے تعلق ماپ رہے تھے وہ چاروں بھی اپنے اپنے پوائنٹر منہ میں دبائے حیران تھیں۔
''یہ بھلا کیا تعریف ہوئی خبر کی؟'' سیرت کو جانے کیوں اپنے مضمون میں خبر کی یہ تعریف پا کر شرمندگی سی ہو رہی تھی۔
گوندل صاحب نے سب سوالیہ نظروں کو دیکھا تھا اور پھر وائٹ بورڈ پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔
''یہ صرف سمجھنے کے لیے ہے کہ خبر کیا ہوتی ہے، کوئی ایسا واقعہ جو ڈر معمول سے ہٹ کر ہے، مگر ہر واقعہ بھی خبر نہیں ہوتا۔''
ڈیڑھ گھنٹے کی کلاس میں خبر کی تعریف پر بحث ہوتی رہی تھی اور اس عرصے میں فردوس گوہر نے اپنے چہرے پر کسی کی نظریں محسوس کی تھیں۔ آدھا پیریڈ اسے یہی ڈھونڈنے میں لگا تھا کہ ایسا کون ہے جو اسے اپنی نظروں کے حصار سے کھسکنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ چھٹی حس نے الارم دینا شروع کر دیا تھا۔
وہ جب کامن روم سے نکل رہی تھی وہ سامنے آ گیا تھا۔ وہ ڈپارٹمنٹ کا لڑکا تھا جسے وہ کلاس میں کئی بار دیکھ چکی تھی جو ہمیشہ سے ہی لڑکیوں کے جھرمٹ میں ہی نظر آتا تھا۔
''کیسی ہیں آپ؟''
''میں ٹھیک ہوں..... آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے؟''
''آپ، صرف کام کے حوالے سے بات کرتی ہیں کیا؟'' موسیٰ نے اپنی گرم نظروں کو اس کے چہرے پر فوکس کر لیا تھا۔
فردوس نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر ان تینوں کی موجودگی کو کھوجا تھا مگر وہ اسے کامن روم

میں چھوڑ کر خود کیفے کی طرف بھاگ گئی تھیں۔

''سوری.....راستہ چھوڑیں۔'' وہ نرمی سے کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی۔

وہ مقابل تھا جیسے ایک انچ بھی آگے پیچھے ہٹنے نہیں دے گا۔

حمید نظامی کوریڈور میں کھڑی فردوس کے ہاتھوں میں پسینہ آنے لگا تھا۔

''کیا چاہتے ہیں آپ؟'' اس نے لہجہ سخت رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔

''صرف اور صرف آپ کو۔'' موسیٰ کو وہ آنکھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔

وہ پھنورا تھا جو ڈال ڈال منڈلانے کا عادی تھا۔ایک بگڑی ہوئی فیملی کا امیر کبیر لڑکا جس کے نزدیک زندگی میں بس لطف لینے کا نام تھا۔وہ اپنے سرکل میں فلرٹ مشہور تھا۔وہ کبھی بھی لڑکیوں کے بغیر اکیلا نظر نہیں آیا تھا مگر یہ اس ہفتے میں پہلی بار تھا کہ وہ اکیلا پھر رہا تھا۔بہت سوں کو لگا تھا اس کا دماغ چل گیا ہے یا پھر وہ کوئی عشق وشق کا روگ لے بیٹھا ہے، کیونکہ یہ خاموشی ہمیشہ سے ہی طوفان کا پیش خیمہ رہی تھی۔

''آپ کو دیکھتا ہوں تو شاعری کرنے کو جی چاہتا ہے۔مجھ پہ مصرعے اترنے لگتے ہیں۔''

فردوس نے اس کا ہاتھ زور سے پرے کیا تھا اور تیز قدموں سے آگے بڑھی تھی۔دل تھا کہ چال بگاڑ بیٹھا تھا وہ جو سمجھتی تھی کہ آگے سب دریا وہ پار کر لے گی مگر سب وہم اور خام خیالی تھی۔

وہ تینوں فردوس گوہر کے چہرے کو دیکھ کر چونک گئی تھیں۔کرسی گھسیٹ کر وہ بیٹھ تو گئی تھی مگر بریانی کی پلیٹ میں چمچہ گھماتے ہوئے تینوں نے اس کے ہاتھوں میں لرزش نوٹ کی تھی۔عدن جبار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

فردوس کا دل چاہا عدن کو کہے مجھے ہاتھ مت لگایا کرو مگر وہ بس سر ہی ہلا سکی تھی۔

سیرت کورہ رہ کر خبر کی تعریف پر اعتراض اٹھ رہے تھے۔

''مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ اخبار اور ٹی وی کی تعلیم میں بھی ہمیں کتے بلیاں کیوں پڑھائی جا رہی ہیں۔''

''تم بس کانسپٹ سمجھو۔اب تھیوریز اور تعریف کے لیے مثالیں تو ضروری ہوتی ہی ہیں۔''

''تو کوئی توتا چڑیا پکڑ لیں۔''

تمکین نے کوک کی بوتل کا ٹھنڈا سپ لیا تھا۔

''جب تم لیکچرر لگ جانا تو پرندوں کی مثالیں دیتی رہنا۔''

وہ چاروں اپنی اپنی بریانی کی پلیٹیں ختم کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔آدھی عوام نوٹس کے پرنٹ آؤٹ نکلوا کر انہیں اسٹیپل کرنے میں لگی ہوئی تھی ذرا سی ہوا سے پیپر اڑ کر ادھر ادھر اڑنے لگتے تھے۔

''تم نے ہمیں نتاشا سے ملوانا تھا ناں۔'' ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتی فردوس سے عدن نے پوچھا تھا۔

''ہاں..... میں نے اس سے بات کی تھی۔اصل میں وہ ذرا مصروف تھی ایک فلم کے شوٹ کے لیے وہ اور اس کی بہن میک اپ آرٹسٹ کے طور پر کام کر رہی تھیں تو اس وجہ سے وہ کچھ مصروف تھی۔''

''چلو، جب وہ آجائے تو لازمی ملوانا۔''

وہ چاروں اپنے اپنے بیگ اٹھا کر آغا شورش ہال آگئی تھیں جہاں میم فرحت کی اردو جرنلزم کی کلاس تھی۔آغا شورش ہال لکڑی سے بنا ہوا تھا خوب صورت سا ہال تھا جہاں آواز بازگشت کی طرح گونجتی تھی۔

وہ جب ہال میں داخل ہوئی تھیں تو سامنے ہی روسٹرم پر موسیٰ کھڑا تھا جس نے فردوس کے اندر داخل ہونے پر اسے پھر سے اپنی نظروں کا محور بنا لیا تھا۔عدن اپنا موبائل کھولے کوئی ٹیکسٹ ٹائپ کر رہی تھی۔سیرت جنگ کا اداریہ کھول کر بیٹھ گئی تھی جبکہ تمکین نے فراغت سے فی الحال فائدہ اٹھا کر کینڈی کرش کا اگلا لیول کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

زندگی اتنی سیدھی اور آسان کیوں نہیں ہوتی کہ ایک بار سارے مسئلے حل کر کے انسان سستا لے۔وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر نظریں گاڑ کر بیٹھ گئی تھی مگر وہ نظریں اسے ابھی بھی محسوس ہو رہی تھیں۔

موسیٰ کے دل میں عجیب بے چینی کی لہر اٹھی تھی۔فردوس گوہر کی نظر اندازی نے اس کے اندر بھانبھڑ جلائے تھے۔وہ جتنا بچتا تھا اتنا ہی دھواں اٹھ رہا تھا۔وہ آنکھیں اور تراشا ہوا وجود اس کے

اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔

زندگی میں فردوس گوہر نے کبھی کسی سے نفرت نہیں کی تھی، کبھی کسی کے لیے دل میں میل نہیں رکھا تھا مگر اسے نہیں معلوم تھا باقی ساری زندگی موسیٰ سے وہ نفرت ہی کرنے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ شام شہر لاہور میں عجیب رنگ لے کر اتری تھی۔ اداسی اور یاسیت کا رنگ اتنا گہرا اور کامل تھا کہ اس کے پیچھے سب کچھ چھپنے لگا تھا۔

نتاشا ابراہیم پچھلے ایک گھنٹے سے گھر کی چھت پر آسمانوں میں کچھ کھوج رہی تھی..... جیسے کسی کا پتا ڈھونڈ رہی ہو..... جیسے صدیوں سے کوئی گمشدہ ہو۔ آسمان پر بادل کب کے چھٹ چکے تھے اور اب دور تک نیلا آسمان صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ نیلے آسمان کے سینے پر کچھ کبوتروں کی جوڑیاں غٹر غوں کرتی ہوئی سفر میں تھیں۔

ابھی وہ اپنی انہی سوچوں میں غرق تھی کہ اس کا فون بجنے لگا تھا۔

اس نے اسکرین پر نظر دوڑائی تھی تو فردوس گوہر کا نام بلنک کر رہا تھا۔ اپنے آپ کو بمشکل کمپوز کرتے ہوئے کال اٹھالی تھی۔

''گوہر! کیسی ہیں آپ؟''

نتاشا نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کی آواز سے ذرا سی بھی لرزش ظاہر نہ ہو مگر ایک ایسا آنسوؤں کا سمندر تھا جو اسے لے ڈبونے کو تیار تھا مگر وہ اپنے حوصلوں سمیت جمع ہوئی کھڑی تھی۔

فردوس گوہر نے اس کی آواز میں لرزش محسوس کر ہی لی تھی۔ آخر وہ نتاشا ابراہیم کو یونہی تو جاننے کا دعویٰ نہیں کرتی تھی۔

''نتاشا! تم ٹھیک ہو ناں؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ پچھلے ایک ہفتے سے تم غائب ہو اور مجھے لگتا ہے تم نے مجھے لارا ہی لگایا ہوا ہے اگر کوئی پریشانی ہے، کسی چیز کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ؟''

وہ ایک ہی بار میں اتنا کچھ بول گئی تھی۔ نتاشا کے لہجے نے اسے چونکا دیا تھا۔ گود میں رکھا ڈرائی

فروٹس والا باؤل وہ کنارے پر کر چکی تھی۔

نتاشا ابراہیم نے پہلی بار اسے اپنے دل پر جیسے نرم بارش کی پھوار پڑتی ہوئی محسوس کی تھی۔ جیسے کوئی تھا جو اس کی فکر میں حصہ دار تھا۔ جس سے اس کا خون کا رشتہ بھی نہیں تھا کہ غرض کا تعلق ہو کہ غرض کے تعلق بوجھ ہوتے ہیں۔ تھکانے والے۔ اکتانے والے۔ اور کچھ تعلق جیسے جنگلوں میں پھر رہے ہیں اور آپ کو کوئی روشنی نظر آجائے۔ فردوس گوہر ایک ایسی ہی روشنی تھی جو اس کے تمام دکھ درد کو سمیٹ لینا چاہتی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں گا اور آپ فکر مت کریں بس کچھ مسئلوں میں الجھی ہوئی ہوں۔''

''کون سے مسئلے؟ مجھے بھی بتاؤ..... مجھ سے تم یہ سب کیوں چھپا رہی ہو؟''

''میں آپ کو ویسے ہی پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔''

نتاشا نے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی مگر جب وہ کسی ایک بات کو پکڑ لیتی تھی تو اس بات کو کبھی بھی ادھورا نہیں چھوڑا کرتی تھی۔

''میری پریشانی کو چھوڑو، مگر مجھے تم یہ بتاؤ کیوں پریشان ہو؟ کیا وجہ ہے میں کب سے نوٹ کر رہی ہوں جیسے تم مجھے اگنور کر رہی ہو۔ کوئی بھی بات ہے تو مجھے بتاؤ ورنہ میں وہیں اندرون لاہور آجاؤں گی۔''

اسے پتا تھا کہ اگر وہ یہ بات کہہ رہی ہے تو اگلے ہی پل وہ اندرون لاہور پہنچ بھی سکتی ہے۔ اس نے اسے اس مشقت سے بچانے کے لیے گہرا سانس لے کر اسے سب کچھ بتانے کی ٹھان لی تھی۔

نتاشا کی آواز میں جیسے کوئی سوگ آن موجود ہوا تھا۔ نیلا آسمان، کبوتروں کی اڑان، خوانچہ فروشوں کی آوازیں سب کچھ جیسے کہیں پیچھے چلا گیا تھا..... سبھی کچھ.....!

''ہوتا ہے نہ گوہر، کہ کبھی کبھی ہم اتنے صدیوں سالوں کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ رہتے ہوئے آرہے ہوتے ہیں۔ شاید آپ کو یہ تجربہ نہ ہو کیونکہ آپ اکیلی ہیں، مگر میں آپ کو بتاؤں کہ سالوں سے میں، ماہی باجی اور نیلم ساتھ رہتے ہوئے آرہے ہیں، اتنی مدت ہوگئی ہے کوئی پچیس تیس سال لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے کو پوری طرح جان نہیں پائے۔ چاہے آپ کو اور کچھ آنا چاہیے یا نہیں مگر آپ کو اپنے رشتوں کے بارے میں اچھی جانچ پڑتال ضرور آنی چاہیے ورنہ یہ آپ کو ایسے خسارے

میں ڈال دیتے ہیں جس کی بھرپائی کبھی بھی ممکن نہیں ہو پاتی۔ یہی حال ہمارے ساتھ ہوا۔ مجھے لگتا تھا میں ماہی کو جانتی ہوں۔ ماہی باجی کو لگتا تھا وہ نیلم کو جانتی ہیں اور نیلم کو لگتا تھا وہ نتاشا ابراہیم کو جانتی ہے۔ ہم تینوں ایک دوسرے ایک دوسرے کے بارے میں اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ شاید ہم تینوں ایک دوسرے کو اچھے سے جانتی ہیں، اور کبھی بھی اگر ہم تینوں میں سے کسی کے دل میں چور آیا تو دوسری یا تیسرے بندی اسے بوجھ لے گی، پکڑ لے گی۔ ہم غلط فہمی کا شکار رہیں کہ شاید ہمیں پتا چل ہی نہیں سکا کہ میں اور ماہی باجی تو کسی کو جاننے کے علم میں بالکل کوری تھیں۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ نیلم کے دل میں کب کوئی چور آیا اور اس چور نے ہمارے گھر کی ساری عزت چرالی، ہمیں لوٹ لیا گیا۔ اب زندگی بہت عجیب سی ہوگی ہے۔ ہمیں پہلے ہی شک پڑا تھا کہ شاید نیلم نے اب الجھا الجھا نظر آنا شروع کر دیا ہے۔ وہ ہم سے کترانے لگی ہے۔ پہلے گھر میں نیلم کے قہقہے گونجتے تھے تو ہم اسے بات بات پر ہنسنے سے منع کرتی تھیں کو کنواری لڑکیوں کے قہقہے انہیں بہت بیگانہ کر دیتے ہیں، مگر اماں بھی نیلم کو سمجھا بجھا کر پہلے خاموش ہوگئی تھیں اور اماں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی نیلم کے قہقہوں کی عادت ہوگئی تھی۔ ہم نے گزرتے ہوئے دنوں کے معمولات میں، رش بھری زندگی میں کبھی غور ہی نہیں کیا کہ نیلم نے ہنسنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہماری ساری زندگی کا ڈپریشن اکیلا اپنے سر لے رہی تھی۔ جانے اس نے اپنی زندگی کی کون سی کھڑکی باہر کی طرف کھول لی تھی جس کا ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ اس نے ایک نئی دوست بنالی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کون سی دوست ہے، کیا کرتی ہے، لیکن یہ تھا کہ اس کی نئی دوست بہت امیر کبیر گھرانے سے تھی اور نیلم اکثر اس کے ساتھ گاڑی پر آیا جایا کرتی تھی مگر ہم نے اس کو معمولی سمجھ کر سائیڈ پر کر دیا، مگر زندگی میں ہر چیز آپ کنارے پر نہیں کر سکتے۔ یہی ہماری سب سے بڑی غلطی تھی۔ بعد میں اب جا کے ہمیں معلوم ہوا کہ نیلم اسی دوست کے ساتھ افیئر میں تھی۔ وہ کوئی امیر گھر کا لڑکا تھا۔"

نتاشا کی سسکیاں بلند ہو رہی تھیں۔

فردوس گوہر سناٹے میں آ گئی تھی۔

"نیلم بہت آگے چلی گئی گوہر..... بہت آگے کہ سب ختم ہو گیا۔"

اندرون لاہور کے لوگوں نے لپلپاتی ہوئی زبانیں نکال لی تھیں۔

''ابراہیم کی بیٹی بھاگ گئی۔''

اماں اور وہ دونوں چھپنے لگی تھیں۔ ابا چارپائی سے لگ گئے تھے۔ وہ گھر کی تین کھڑکیاں بھی بند ہوگئی تھیں۔

حبس بھری شام تھی جب ہر کوئی دیوار سے لگا ہوا اپنی زہریلی سوچوں کے سیپ کاڑھ رہا تھا تو گھر کے پھاٹک پر شور ہوا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں خوف سے.....دھڑکے سے.....!

☆.....☆.....☆

ہاسٹل میں شام کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد کچھ لڑکیاں لان میں ٹہلتے ہوئے اپنے اپنے وظیفے پڑھ رہی تھیں۔ لڑکیوں میں یہ سب سے زیادہ تھا کہ وہ اپنی حاجات کے لیے نوافل اور وظیفے ادا کیا کرتی تھیں۔

کچھ لڑکیاں جن کو یہی وقت میسر ہوتا تھا پورے دن کی تھکان کے بعد کہ وہ اپنے گھر والوں سے باتوں میں مصروف تھیں۔

کنیزاں فاطمہ ہاسٹل کی چھت پر کھڑی اپنے موبائل پر آنے والی اس فون کال کو دیکھ رہی تھی جو کہ ویڈیو واٹس ایپ کال تھی جو سکندر کے نمبر سے آرہی تھی۔

اسے جانے سوچنے میں کیوں اتنا ٹائم لگ رہا تھا کہ وہ کال ریسیو کرے یا نہ کرے۔ وہ شخص اس کے نام کے ساتھ ایسا نتھی ہوا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی تھی۔

کئی بار اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کے منہ پہ کہہ دے کر وہ کنیز فاطمہ کو ڈیزرو نہیں کرتا لیکن بعد میں اسے خیال آتا تھا کہ وہ شاید اتنا حوصلہ خود میں جمع نہیں کر پاتی تھی کہ کسی دوسرے انسان کو اس طرح ریجیکٹ کرے۔ اور وہ بھی سکندر گوکہ جس کے ہاتھوں میں اونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی مہاریں بھی تھما دی گئی تھیں۔

بالآخر اس نے سارے حوصلے جمع کر کے وہ فون کال ریسیو کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ کیونکہ

اکثر اوقات یہ ہوتا تھا کہ وہ شام کے وقت سکندر اماں ابا کے پاس چلا جاتا تھا اور ویڈیو کال کے ذریعے ان کی اس بات کروادیا کرتا تھا۔ جیسے ہی اس نے کال ریسیو کی تھی سامنے ہی فون کی اسکرین پر غروب ہوتا ہوا سورج نظر آیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی بختاور کے ساتھ مل کر ٹیلے پر کھڑے ہو کر غروب ہوتا ہوا سورج دیکھا کرتی تھی اور آج وہی سورج فون کال کی اسکرین پر ویڈیو کال میں اس کے سامنے تھا۔

کنیزاں کو لگا تھا کہ ہاسٹل کی عمارت، بلیوں کی آوازیں سب کچھ پس منظر میں چلا گیا ہے اور سامنے پیش منظر وہی ہے، دور تک میدان، چنے کے کھیت اور وہ وہیں ٹیلے پہ کھڑی مسحور ہو کر غروب ہوتا ہوا نارنجی سورج دیکھ رہی ہے۔

وہاں کے اور یہاں کے وقت میں بہت فرق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں بہ مغرب ہو چکی تھی اور ادھر ابھی بھی تھل واسیوں کی طرف سورج غروب ہونے کا منظر تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔

تبھی کچھ ثانیے کے بعد اسکرین پر سکندر کی صورت نظر آئی تھی۔

ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی طرف کا کیمرا آف کر دے مگر جانے کیا سوچ کر وہ رک گئی تھی۔

وہ اب بھی ہنستا مسکراتا ہوا کشادہ پیشانی کے ساتھ اور آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت لیے اسے نظر آ رہا تھا۔

''کیسی ہو، تم تو لگتا ہے بھول ہی گئی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں اور بھولنے کی کیا بات ہے، مجھے کیا ضرورت ہے تمہیں بھولنے کی۔''

دوسری طرف سے وہ اس بات پہ ہنسا تھا۔

''ہاں مجھے پتا تھا تم یہی کہو گی ورنہ تم نے کہاں مجھے یاد رکھا ہوا ہے۔'' کنیزاں فاطمہ نے غور سے اسکرین پر اس کے چہرے کے نقوش کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں تو مجھے ضرورت ہی کیا ہے تمہیں یاد رکھنے کی، آخر تم میرے لگتے ہی کیا ہو۔''

کتنا آسان تھا اس کے لیے کہ وہ ایک لمحے میں اسے پرایا کر دیا کرتی تھی۔ شاید سکندر کو یہی اس

کی بات بہت پسند تھی، اور آج تک وہ اس کی نظر اندازی اور بیگانگی کی ادا کے سحر سے باہر نکل نہیں پایا تھا۔ اب بھی جیسے وہ اس کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم تھل میں تھیں تب بھی مرچیں چبائے رکھتی تھیں اب تم لاہور میں ہو تو اب بھی وہی حال ہے، لگتا ہے لاہور شہر نے تم پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا۔ لگتا ہے وہاں بھی اب مرچیں گھول کر پیتی رہی ہو۔''

''تمہیں کیا پروا، میں مرچیں گھول کر پیوں یا زہر کھاؤں۔''

''مجھے نہیں ہوگی پروا تو کیا دنیا کو ہوگی کنیزاں!''

وہ لہجہ، وہ انداز کنیز فاطمہ کو ایک بار پھر سے زمین پہ لگنے پہ مجبور کر گیا تھا۔ جب بھی وہ آسمان کی طرف اپنی سیڑھی کھڑی کرتی تھی اسے زمین کی طرف کھینچ لیتا تھا۔

''تو میں تمہاری شکل مزید نہیں دیکھنا چاہتی اور نہ ہی تمہاری باتیں سننا چاہتی ہوں۔ میری بختاور سے بات کراؤ۔'' وہ جھنجلا کر بولی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بختاور کا چہرہ اسکرین پر ابھرا تھا۔

''ہائے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کنیزاں، تم تو اتنی کمزور لگ رہی ہو۔'' اسکرین پر جیسے اس کا چہرہ دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا تھا۔

''مجھے لگا تھا یہ سوال اماں کی طرف سے آئے گا مگر تم نے یہ سوال کر کے مجھے حیران ہی کر دیا۔ اب اتنے چھوٹے سے موبائل میں اتنی چھوٹی سی اسکرین میں تمہیں اتنی ہی نظر آؤں گی۔ اسکرین میں تو بندہ ایسا ہی نظر آتا۔'' وہ جیسے برا مان گئی تھی ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے اور سب اسے کمزور سمجھنے لگے تھے۔ ابھی تو اتنا وقت باقی تھا۔

''نہیں۔ نہیں۔ پھر بھی دیکھو تو آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں، تم ایسی تو نہیں تھیں!''

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں بس تمہیں ایسے ہی محسوس ہو رہا ہے۔ باقی تم سناؤ کیسی ہو؟ گھر میں سب کیسے ہیں؟'' وہ جلدی جلدی بختاور کا دھیان اس موضوع سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

http://kitaabghar.com

''گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ آج شانو کی مہندی ہے رات کو وہاں جاؤں گی۔ دیکھو میں نے مہندی لگائی ہوئی ہے۔'' بختاور اسے اپنے مہندی والے ہاتھ دکھانے لگ گئی تھی۔

لاہور کی اس مصروف بھاگتی زندگی میں بھی کنیزاں کو بری طرح سے تھل واسیوں کے وہ مہندی کے فنکشن یاد آئے تھے جہاں وہ ٹپے ماہیے گاتی تھیں۔

''یہ مہندی کس نے لگائی ہے؟''

''میں نے خود لگائی ہے۔'' بختاور نے فخر سے بتایا تھا۔

''تم کب سے مہندی لگانا سیکھ گئی ہو؟''

''بس وہی رسالوں سے دیکھ دیکھ کر اتنا تو مجھے اب آ ہی گیا ہے۔''

''چلو اچھا ہے..... میں آؤں گی تو تمہاری خدمات حاصل کروں گی۔ اماں ابا کیا کر رہے ہیں؟''

''ابا جانوروں کا دودھ نکال رہے ہیں اور اماں نماز پڑھنے کی تیاریوں میں ہیں، وضو کر رہی ہیں۔''

''چلو، میری اماں سے بات کروا دو جلدی سے۔''

بختاور اماں کی طرف فون لے کر گئی تھی جو نلکے سے وضو کر کے اب دوپٹے سے چہرہ تھپتھپا رہی تھیں۔

اماں نے موبائل سامنے رکھا تھا اور اپنے سامنے کنیزاں فاطمہ کو دیکھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکتی تھیں۔ انہوں نے موبائل اسکرین کو چوم لیا تھا۔

بختاور اور سکندر ان کی یہ حالت دیکھ کر دھیرے سے مسکرائے تھے۔

''ہائے میں صدقے، میں واری۔ میری دھی کتنی کمزور ہو گی ہے۔''

کنیزاں فاطمہ کو سچ میں اپنے کمزور ہونے کا یقین آنے لگا تھا۔

''ہر ایک ماں ویسے ہی پریشان ہوتی رہتی ہے۔ دیکھیں تو سہی میں بھلی چنگی ہوں اور میری دوست تو یہی کہتی ہیں کہ میں دن بدن موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔''

''اے چل۔ جھلی نہ ہو تو۔ ماں کے دل کو تو کیسے سمجھے گی؟''

''بس ماں فکر نہ کیا کریں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور یہاں کھانا پینا بھی اچھا ہے۔'' وہ انہیں

http://kitaabghar.com

مطمئن کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

''تیری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟'' اماں پوچھ رہی تھیں۔

''میری پڑھائی بالکل ٹھیک جا رہی ہے۔''

''بس پتر! اپنا خیال رکھا کر۔ ہر وقت تیرا چنتا اور فکر لگی رہتی ہے اور دل کو خیال ستائے رہتے ہیں۔''

اماں کے اپنے فلسفے تھے۔ شاید ماؤں کے دلوں کو کبھی بھی چین نہیں پڑتا اور ویسے بھی وہ اتنے میلوں دور تھی تو ان کی فکر بنتی بھی تھی۔

وہ اماں سے محلے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی تھی۔

''تمہارے ابا جانوروں کا دودھ نکال رہے ہیں وہ تھوڑے مصروف ہیں وہ بعد میں تم سے بات کریں گے۔''

کچھ ہی دیر بعد وہ بختاور اور اماں سے باری باری شانوں کی شادی سے لے کر محلے کے ایک ایک گھر کا احوال لے رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''کیسی ہو بیٹا، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

قطر کے ملک سے ہوا کے دوش پر تیرتا ہوا وہ جملہ سیرت امتیاز کو عجیب رنگ میں رونے پر مجبور کر گیا تھا لیکن وہ رونا کچھ اور ہی تھا۔ ایک ایسا رونا جو آپ کی صدیوں کی ریاضت کے بعد، تپسیا کے بعد آپ کے حصے میں آتا ہو۔

وہ جو لڑکپن سے لے کر جوانی تک ایک کونین کی طرح کے زہر سے بھی بھری ہوئی تھی، وہ زہر آہستہ آہستہ کسی شہد کی شکل میں ڈھل گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی ان کی کال کاٹ نہیں سکی تھی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ وہ ان سے بات نہیں کرے گی، ان سے لڑائی کرے گی، وہ ان کی کچھ نہیں لگتی۔ شاید لڑکپن سے لے کر اب تک وہ اگر کسی چیز کی طلب گار رہی ہے تو وہ صرف اور صرف وہی کال تھی، وہی لہجہ جو اس سے اس کا دکھ سکھ بانٹ لے۔ بے شک پوپلی بوا جو اس کے لیے ہر ممکن مدد کو تیار رہتی تھیں، سب کچھ کرتی

تھیں مگر جو خون کا تعلق تھا..... انسان ہمیشہ خون کے تعلق کی طرف کھنچتا ہے..... بھاگتا ہے..... وہ خون کے تعلق کی ڈور یہی بندھا ہوتا ہے..... اور سیرت امتیاز نے ان گزرے سالوں میں صرف اسی تعلق کا انتظار کیا تھا اور جب آج تعلق اسے میسر آ رہا تھا تو وہ عجیب طرح کے محسوسات کا شکار ہوئی تھی۔

وہ جیسے ہنستے ہنستے رونے لگی تھی، روتے روتے ہنسنے لگی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی آواز پر قابو پایا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟''

امتیاز صاحب کو یوں لگا تھا جیسے قطر کی فضاؤں میں کسی نے شیرینی گھول دی ہو۔ وہ جو ہمیشہ تھکے تھکے سے رہتے تھے ان کو لگا تھا ان کی تھکن ایک پل میں گزر گئی ہو، اتر گئی ہو۔ وہ عجیب طرح سے انہیں منمل کر رہی تھی۔ وہ نپلا تلا لہجہ..... سنجیدہ انداز..... وہ ان کا خون تھی۔ وہ آیت اور پوپلی بوا سے اس کی خیر خیریت دریافت کرتے رہتے تھے لیکن اب وہ دور ایک ایسے شہر میں بیٹھی تھی تو انہیں اندازہ ہوا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی دوری پہ تھے۔ وہ اپنے گھر سے..... یہ بھی اپنے گھر سے دور تو انہیں پوپلی بوا کی نصیحتیں یاد آئی تھیں۔

کہ وہ اب جوان ہو چکی ہے اور انہیں اپنے باپ کا فرض ادا کرنے کے ناطے اس کی خیر خیریت خود سے دریافت کرنی چاہیے تو یہی وجہ تھی آج وہ اسے کال کرنے پر مجبور ہو ہی گئے تھے۔

ورنہ جب بھی وہ گھر آیت سے سیرت سے بات کروانے کو کہتے تھے تو وہ کبھی بھی میسر نہیں ہوتی تھی۔

تو ہمیشہ انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا کہ وہ میسر نہیں۔ کبھی وہ گھر پر موجود نہیں ہوتی تھی یا کبھی وہ ٹیوشن سنٹر ہوتی تھی۔ اور زندگی میں اس کے پاس کھیلنے کودنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔

مگر آج انہیں احساس ہوا تھا کہ ان دونوں باپ بیٹی کے درمیان کمیونیکیشن گیپ آیا تھا، وہ ہر چیز پر بھاری تھا۔

''تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' انہوں نے جانے کس مشکل سے یہ سوال کیا تھا۔

سیرت نے اپنے آپ کو بمشکل قابو کیا تھا۔ وہ ٹشو باکس سے ٹشو کھینچ کر آنکھیں صاف کر رہی

تھی۔ وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی اور دیوار سے لگی ہوئی تھی۔

کنیزاں اور تمکین نیچے میس میں ہال میں آج کے مینیو کے بارے خبر لینے گئی ہوئی تھیں۔ جب تک وہ آتیں تب تک اس نے آرام سے کمرے میں ہی بیٹھے رہنا تھا۔

''نہیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

امتیاز صاحب کو لگا تھا جیسے انہوں نے غلط سنا ہو جب بھی ان کی آیت سے بات ہوتی تھی تو آیت نے انہیں ہمیشہ یہی کہا تھا کہ سیرت کو ہر چیز کی ضرورت رہتی تھی۔ کپڑے، جوتے، لتے، جیولری ہر ہر چیز کی۔ اور ہمیشہ وہ ان کی چیزوں کا بھی حق مار لیا کرتی تھی، مگر آج وہ کہہ رہی تھی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

''کیوں تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مجھے پہلے بھی کبھی ضرورت نہیں پڑی اور آئندہ بھی نہیں پڑے گی۔'' اب جیسے وہ پہلے والی کیفیت سے واپس آ چکی تھی اس بار لہجہ بالکل نارمل تھا۔

''پھر بھی اپنا اکاؤنٹ نمبر اور ڈیٹیل سینڈ کر دو میں تمہیں کچھ پیسے بھیج دوں گا۔ مجھے معلوم ہے لاہور بڑا شہر ہے اور تم اب ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہو تو تمہیں ضرورت پڑے گی۔''

وہ چپ کر کے ان سے باتیں سنتی رہی تھی۔

سیرت امتیاز کے لیے وہ شام بہت یادگار ہو گئی تھی۔ تین منٹ اور سینتیس سیکنڈ کی وہ فون کال، وہ آواز..... جیسے اسے دوبارہ زندہ رہنے پر مجبور کر گئی تھی۔ اس شام اس نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ قہقہے لگائے تھے اور اس کے سارے وجود سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کی اس کیفیت کو تمکین اور کنیزاں دونوں نے نوٹ کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پچھلے ایک ہفتے سے ابا اسے مسلسل کہہ رہے تھے کہ وہ پھوپھو سے بات کر لے کیونکہ پھوپھو نے اس سے کوئی ضروری بات کرنا تھی۔ ہمیشہ اسائنمنٹ اور کلاس ورک کے چکر میں وہ ان کی اس بات کو

بھول جایا کرتی تھی کہ جانے پھوپھو نے اس سے ایسی کیا اہم بات کرنا تھی۔ آج جب اسے کچھ فراغت میسر آئی تھی تو اس نے پھوپھو سے کال پہ بات کی تھی اور دوسری طرف سے پھوپھو کی آواز نے اسے کسی چیز میں ڈھال دیا تھا۔

''ارے میں نے تو جمال سے کہا ہے کہ اب تمکین پڑھ رہی ہے، یونیورسٹی والی ہوگئی ہے، خیر سے دو تین سال تک اپنی پڑھائی مکمل کر لے گی تو اس کے لیے اس سے اچھا ہے پہلے رشتہ ڈھونڈ کے رکھو۔ لڑکیوں کا کیا بھروسہ بانس کے موافق تو بڑی ہوتی ہیں۔ کل کو تم اتنی سی تھیں جب تمہیں پالتا پوستا رہا اس نے اتنا بڑا کیا اور اب دیکھو وہ تمہاری شادی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ میں نے تو بھائی سے کہا کہ سیدھا سیدھا وہ خود تم سے رشتے کے بارے میں بات کرے۔ یہ ہے کہ باپ ہے وہ تم سے رشتے کے بارے میں کیسے بات کرے؟ اصل میں بات یہ ہے کہ تمہارے بہت سارے رشتے آرہے ہیں اور خیر سے جب سے تم یہ یونیورسٹی پڑھنے گئی ہو تو لوگوں کو جمال کی تربیت پہ ذرہ برابر بھی شک نہیں رہا۔ اور تمہیں پتا ہے آج کل زمانہ بدل گیا ہے پڑھی لکھی لڑکیوں کے رشتے آسانی سے ہو جاتے ہیں، تو اب کئی لوگ باتوں باتوں میں جمال کو بھی کہہ رہے ہیں اور میرے بھی جاننے والے کہہ رہے ہیں۔ رشتے کی بابت پوچھ رہے ہیں تو جمال کہہ رہا تھا جیسے ہی اس بار تم چھٹیوں پہ آؤ گی تو ایک دو لوگوں کو بلا کر رشتے کی بات کر لیں گے۔ تاکہ بعد میں جب تم لاہور جاؤ تو رشتہ پکا ہوا ہو۔ اور اسے بھی اپنے فرض کی ادائی کے بارے میں آسرار ہے۔ بعد میں شادی کے سو مسئلے مسائل ہوتے ہیں اور تیاریاں ہوتی ہیں۔ تم میری بات سن رہی ہو ناں؟''

پھوپھو کو دوسری طرف سے یوں لگا تھا جیسے وہ خود ہی بولے جا رہی ہیں اور تمکین ان کی کوئی بات نہیں سن رہی تھی۔ مگر نیٹ ورک سب کچھ ٹھیک تھا وہ پھوپھو کی آواز صاف صاف سن سکتی تھی مگر اس کے اندر کچھ پگھلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی ساری زندگی اس نے خواب دیکھے تھے جیسے وہ کسی جنگل میں چلتی جا رہی ہے اور سامنے کوئی شہزادہ گھوڑے کی باگیں تھامے اس کی طرف آرہا ہے۔ اس نے زندگی اپنے باپ کے سہارے گزاری تھی اور اس کے علاوہ اس نے اپنی زندگی کے کئی سال کہانیاں، قصے پڑھنے میں گزار دیئے تھے۔

تمکین جمال کی اپنی ایک تخیلاتی دنیا تھی جہاں اس کا اپنا ایک محل تھا اور اس محل میں ہی اس کا شہزادہ اور محل کے پھاٹک پر بگھیاں ان کی منتظر ہوتی تھیں کہ وہ شاہ بلوط کے جنگلوں کی سیر کو جائیں گے۔ وہی جنگل جہاں کچھ چرواہے اپنی بھیڑوں کے ریوڑ کو بھول کر بانسریاں بجانے چٹانوں بیٹھ جایا کرتے تھے۔

آج لگا تھا کہ اس کا وہ خواب چھناکے سے ٹوٹ گیا ہے کہ وہ اسی دنیا کی باسی ہے۔ وہ کوئی شہزادی نہیں اور نہ ہی اس کے لیے کوئی شہزادہ آئے گا۔

ہاسٹل کے میس کے باورچی خانے سے جیسے زعفران، جائفل اور جاوتری کی خوشبو پھر سے تمکین جمال کے لیے موت ہوگئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ان میں یہ طے پایا تھا کہ جب بھی فارغ وقت میں ویک اینڈ کے موقع پر وہ لاہور کی سیر کو نکلیں گی تو انہوں نے کب کہاں اور کس طرح جانا ہے یہ ساری پلاننگ کنیزاں فاطمہ کرے گی۔ بقول ان کے وہ اس چیز میں بڑی ماہر تھی اور وہ اس کھوج میں رہتی تھی کہ لاہور میں کون کون سی تاریخی عمارتیں ہیں، کون کون سے شاپنگ سنٹرز ہیں اور کون کون سی ایسی جگہیں ہیں جن کو دیکھا جانا ضروری ہے تاکہ وہ خود کو زندہ سمجھیں کہ انہوں نے لاہور دیکھ لیا ہے۔

کنیزاں نے اپنی ڈائری میں ساری چیزیں نوٹ کی ہوئی تھیں۔ تو پھر ایک طویل کانفرنس کے بعد یہ طے پایا کہ لاہور کی ان کی کلاس فیلوز عدن اور گوہر سے بھی کنیزاں کو متعارف کروایا جائے اور ایمپوریم مال کا ہی وزٹ کیا جائے۔ کنیزاں نے بھی اس فیصلے پر مہر ثبت کی تھی اور اگر اس لمحے کی گھات کا اسے ذرہ برابر بھی اندازہ ہوتا تو وہ کبھی ایمپوریم کا رخ نہیں کرتی مگر یہ اس کی تقدیر میں تھا۔

عدن اور فردوس اپنی اپنی گاڑیوں پہ مال پہنچ گئی تھیں اور یہ تینوں بھی یونیورسٹی ہاسٹل کے باہر سے رکشہ لے کر جوہر ٹاؤن ایمپوریم مال پہنچ گئی تھیں۔

اونچے لمبے قد کی عمارت نے کنیزاں کو ہانٹ کیا تھا۔ مسمرائز کر کے رکھ دیا تھا اس نے سر اٹھا کر

اس عمارت کو دیکھا تھا اور اس عمارت میں آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تھا۔ جو برانڈڈ بیگ ملبوسات میں ملبوس اسے بہت عجیب طرح سے متاثر کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی حسین ترین شکلیں جن سے وہ اپنی نظریں ہٹا نہیں پا رہی تھی۔ کوئی قلق سا تھا جو اس کے دل میں بیٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ موازنے کی کیفیت میں رہتی تھی، اب بھی سب کچھ تلنے لگا تھا۔ وہ سب تولنے کو تیار تھی..... خود کو..... تھل کو..... کھگل کو..... تھل واسیوں کو..... یہاں تک کہ نارنجی سورج کو بھی.....!

سامنے وہ شیشوں سے سجی لمبی عمارت آ گئی جس کے سامنے دنیا کی ہر عمارت ہیچ لگنے لگی تھی۔ لوگوں کو گاڑیوں سے اترتے ہوئے دیکھ رہی تھی جو برانڈڈ ملبوسات پہنے ہوئے، مہنگی ترین خوشبو میں بسے ہوئے اور ہنستے مسکراتے نزاکت سے فاسٹ فوڈ بائٹس لیتے ہوئے جیسے اس دنیا کے باسی نہیں لگ رہے تھے۔

وہ بار بار اپنے کپڑوں کی شکنیں درست کرتی تھی کہ وہ اپنا اب تک کا بہترین سوٹ پہن کر آئی تھی، مگر دل کے اندر جیسے اب بھی کسی احساس کمتری نے سر اٹھایا تھا کہ جیسے وہ ان سب سے کمتر ہے۔ وہ جو لوگ جو اپنی زبان میں اردو اور انگریزی کو مکس کر کے بولتے ہیں جن کے وجود سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو بے ساختہ مڑ کر انہیں دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور ان کی ایمپوریل مال کی پارکنگ میں کھڑی ہوئی مہنگی ترین گاڑیوں سے اٹھتا ہوا لاؤڈ میوزک انہیں جیسے کسی اور ہی دنیا کیا باسی بنا رہا تھا۔

وہ گم صم ان چاروں کے ساتھ پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

فردوس گوہر کئی بار شاپنگ مالز کا وزٹ کر چکی تھی تو ان کے لیے یہ نئی چیز نہیں تھی مگر تمکین جمال سیرت امتیاز اور کنیزاں فاطمہ کے لیے وہ واقعی میں نئی جگہ تھی جو انہوں نے ٹی وی ڈراموں میں ہی دیکھی تھی مگر ٹی وی ڈرامے بھی ایک مصنوعی چیز تھے۔ اسکرین پر چیزیں اور نظر آتی ہیں اور اصل میں اب وہ دیکھ رہی تھیں تو اپنے آپ کو تعریف کرنے پر مجبور پا رہی تھیں۔

وہ لوگ، وہ لائف اسٹائل، وہ سب کچھ کتنا مختلف تھا۔ یہ مسکراتے گنگناتے ہوئے چہرے جن کی زندگی جیسے بہت پرسکون تھی کسی جھیل کی مانند کہ اس میں ابھی تک کوئی کنکر نہیں گر سکا تھا۔ لوگوں کے چہرے پہ کتنا اطمینان تھا۔ چھوٹے بچے بڑے سب اپنی اپنی زندگی میں مگن۔

سیکورٹی چیک سے اندر داخل ہو کر وہ اندر داخل ہوئی تھیں۔ موسم بدل چکا تھا، گرمیاں آ چکی تھیں، یخ ٹھنڈے اے سی نے سکون پہنچایا تھا۔ اتنی زیادہ منزلیں، الیکٹرانک سیڑھیاں، بجلی والی سیڑھیاں جو بجلی سے چلتی تھیں کنیز فاطمہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

اور ایک بار پھر اسے جیسے لگا تھا کہ اس کا تھل کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔

''تھل کے باہر دنیا کتنی ترقی کر چکی ہے اور ہمیں معلوم ہی نہیں۔'' ایک آوارہ سی سوچ نے اس کے دماغ میں جگہ بنائی تھی۔

''یہ شہر کے لوگ، یہ تھل کے باہر کے لوگ پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی زندگی میں کتنی سہولتیں ہیں کہ ایک بٹن دبایا اور سب حاضر اور ادھر ہم تھل کی ریت میں جلتے بھنتے رہتے ہیں اور کڑکڑاتی ہوئی گرمی میں ہمارے گھر میں بیٹھی ماں بہنوں کو پتا ہی نہیں کہ یہاں زندگی کتنی پرسکون اور ٹھنڈی ہے۔''

رنگ و نور اور روشنیوں کا ایک سیلاب تھا۔ اندر تھری ڈی گیمز بوتھ پر بچے گیم کھیل رہے تھے۔

جوتوں کی دکان میں چمکتے دمکتے ہوئے جوتے جن کے پرائس ٹیگ اسے آنکھیں چرانے پر مجبور کر رہے تھے۔

ڈیزائنر ویئرز کی دکانیں جہاں وہ مختلف قسم کے برانڈز کی نیو کلیکشن پر بحث کر رہی تھیں۔

زندگی میں پہلی بار یہاں اپنا آپ حقیر ترین لگا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ اس کے پاس ڈھیر سارا پیسہ ہو، گھر، گڑی ہو۔ اور ان شیشے جیسے چمکتے لشکارے مارتے لوگوں کی طرح زندگی گزارے۔

وہ اپنے آپ کو موازنے سے ایک بار پھر سے روک نہیں پائی تھی۔ آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے تھل میں مس فٹ تھی۔ اس کی نظریں عدن اور گوہر کی طرف بھی پڑتی رہیں جو اتنی نازک اسٹائلش تھیں کہ ہر نظر ان کے چہرے پر ٹھہرتی تھیں۔ عدن اور فردوس گوہر انہیں ہر چیز کے بارے میں بتاتی رہیں۔

''یہ اچھا برانڈ ہے۔ ان کا کپڑا اچھا ہوتا ہے۔ ان کی لان کلیکشن بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ ست رنگی والوں کا ہے۔ ان کے لیلن کے پرنٹڈ سوٹ بہت خوب صورت ہیں۔''

روشنیاں، فانوس، خوشبوئیں اور کافی کی مہک ..... جیولری شاپ پر نقلی موتیوں کی چمک نے اصل کا حسن بھی چھین لیا تھا۔

ٹھنڈے یخ اے سی میں بھی تھل واسی کنیزاں فاطمہ کی ہتھیلیوں پر بھنچا ہوا وہ پانچ سو کا اکلوتا نوٹ پسینے میں ڈوب گیا تھا۔

سیکھا ہے جینا زندگی نے ہجر سے
پھر جیسا ایسا کہ ہر ایک ضبط ہو الا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول **لا** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

نایاب جیلانی کا بہت خوبصورت نیا ناول

سلسبیل

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

اُم ایمان قاضی کا بہت خوبصورت نیا ناول

دل کانچ کا گھر

کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
مکمل ناول پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

باب ہشتم

صنم گزیدہ

نیناں بھول بھلیاں
نیناں گھور سمندر ورگے
ہر کوئی ڈبنا چاہوے
بنجاروں کے جیسا اپنا، راجا بھیس وٹاوے
من کے بھانبن تن سلگا دیں، چار چوفیرے چھیاں
نیناں بھول بھلیاں
سلگا دیں نیناں بھول بھلیاں
باورا کر دیں نٹ کھٹ نیناں
ان کی مٹھڑی بولی
جھٹ سے قابو من آجاوے
جوں ہی پٹاری کھولی
عشق کی مرلی پر ناچے من، ہر پل تھا تھا تھیاں
نیناں بھول بھلیاں.....!

صنم گزیدہ سے جب دل پر وار کرتا ہے تو پھر انسان کو سنبھلنے کو رتی بھر بھی وقت نہیں ملتا، وہ بس ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ وجود میں گاڑھے خون میں خالی پن پھیلتا جاتا ہے کہ کچھ تھا جو کھو گیا ہے، کچھ کمی تھی جو پوری ہو گئی ہے۔

http://kitaabghar.com

آدم کو اسی لیے اس نے اچک لیا تھا ساری روشنیاں ہیچ ہو گئی تھیں۔

کنیزاں فاطمہ اس سے لڑ رہی تھی۔ مکئی کے دانوں کے پھٹنے کا شور..... اشتہا انگیز چاکلیٹ کی مہک۔

''میرے اپنے مکئی کے کھیت ہیں۔''

آدم نے ان کالی رات جیسی گھور سیاہ آنکھوں کو غور سے دیکھا تھا۔

''تمہاری آنکھوں میں توریت کے ٹیلے نظر آتے ہیں۔''

وہ ٹھٹک گئی۔ صنم گزیدہ سے نے اس نمانی کو بھی جالیا تھا کہ سے کسی کا نہیں۔ بظاہر وہ ایک جنگ نظر آتی تھی جو کسی دکان دار اور گاہک کے مابین ہو جاتی ہے مگر دور کھڑی تمکین جمال نے سب بھانپ لیا تھا، وہ دور اندیش تھی۔

''تم اوقات میں رہو اپنی۔''

وہ جیسے سارے ایلیٹ کلاس طبقے کا غصہ اس معصوم پر نکالنے کو تیار تھی۔ کشمیری شال میں چہرہ تمتما رہا تھا۔ مٹھی میں پسینے سے بھیگا وہ پانچ سو کا نوٹ آدم نے دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹھنڈا پڑتا گیا جیسے برف ہو گیا ہو۔

پاپ کارن کا پیکٹ خاموشی سے اسے تھما دیا تھا۔

''مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مکئی کے کھیتوں کی مالک ہو۔''

وہ نظر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ عجیب شخص تھا وہ کنیزاں کی آنکھوں میں تھل دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس خوبرو نیلی آنکھوں والے شخص سے خود کو لڑتا جھگڑتا دیکھ رہی تھی۔

''اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے تم، اتنے مہنگے مکئی کے دان کون بیچتا ہے؟''

''میں بیچتا ہوں۔'' کندھے اچکا دیے گئے تھے۔

''بہت مہنگے ہیں۔''

''تو تم مت کھاؤ۔''

''ہمارے گاؤں میں اپنے مکئی کے کھیت ہیں، سمجھے۔'' وہ اسے لتاڑ رہی تھی۔

''تو تم بھی مکئی کے پاپ پارن بیچا کرو، یہاں کیا کر رہی ہو۔''

کنیز فاطمہ نے اس جیسا بدتمیز انسان زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ دونوں بحث میں الجھے رہے۔

ایک منٹ، پانچ منٹ، دس منٹ اور تیرہیں منٹ میں وہ میٹھے پاپ کارن کی کون تھامے شیشیوں میں بند اس عمارت میں گھوم رہی تھی، مگر وہ نیلی آنکھیں کیز فاطمہ کا پیچھا کرتی رہی تھیں اور وہ دونوں اس بات سے بخوبی واقف بھی تھے۔

☆.....☆.....☆

''تم اسے جانتی ہو؟''

وہ جو اطمینان سے اپنی آئسکریم کھانے میں مگن تھی تمکین نے اس کا سکون بڑے اہتمام سے غارت کر دیا تھا۔

''تم.....تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''اسی لڑکے کی جس سے تم پاپ کارن لینے گئی تھیں۔ وہ تم سے کسی بحث میں الجھا ہوا تھا۔''

کنیز اں جیسے گھبرائی تھی۔

''ہاں۔ بس وہ کوئی خبطی تھا، چھوڑو اسے جانے دو۔'' جیسے چھوڑنے سے سب جھوٹ جاتا ہے؟ پیچھے چھوڑ دیتا ہے؟

عدن نے برگر کی بائٹ لیتے ہوئے کنیز اں کو جیسے سراہا تھا۔

''یار! تم تو پھر بڑے کام کی بندی ہو کہ ایسے ماحول سے اٹھ کر آنا۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ ورنہ میں نے تو لوگوں کو بس بھیڑ میں گم ہوتے ہی دیکھا ہے کہ وہ چل سو چل میں ہی لگے رہتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خواب دیکھے جائیں اور پھر ان کی تکمیل کے لیے کوشش بھی کی جائے۔''

کنیز پھر سے جیسے کسی لائم لائٹ میں آ گئی تھی کہ وہ ایلیٹ کلاس کی لڑکیاں اسے سراہ رہی تھیں، اسے تسلیم کیا جا رہا تھا۔ سیرت دوسری طرف فردوس کو پکڑے بیٹھی تھی۔

''نہیں۔ نہیں۔ آج تو میں جان کر ہی رہوں گی کہ تم کون سی بیوٹی پروڈکٹس استعمال کرتی ہو، تمہاری اسکن ٹون اتنی اچھی ہے یہ قدرتی طور پر نہیں لگتی مجھے۔''

ہفتے میں دو چار بار فردوس اور سیرت کی اس موضوع پر بحث لازمی ہوا کرتی تھی جس میں ہمیشہ سیرت فردوس کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی تھی کہ وہ قدرتی بیوٹی نہیں بلکہ حسن کو نکھارنے والی پروڈکٹس کا کمال ہے۔

فردوس کے ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔

''بس کر دو سیرت! مجھ میں اور یہ الزام برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے۔ میں بس تسلیم کر رہی ہوں کہ میں وائٹنگ سوپ اور کریمیں استعمال کرتی ہوں۔''

سارا گروپ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوا پڑا تھا۔

تمکین نے عدن کے خریدے ہوئے پرفیوم کی شیشی کا ڈھکن کھولا تھا اور اسپرنگ کی مسحور کن خوشبو پھیلنے لگی تھی۔ وہ اوپر والی منزل پر بیٹھی تھیں۔ بہت سے لوگ تھے سب اپنی اپنی خریداریوں میں مصروف کہ سب کی اپنی دنیا ہے، سب کے اپنے دھندے ہیں یوں ہی دن رات گزر جاتے ہیں۔

کنیزاں کی نیچے کی طرف نظر اٹھی تھی جہاں وہ کاؤنٹر تھا۔ وہ لمحہ جیسے کسی اتفاق کی ملاقات کا تھا کہ وہ نیلی آنکھوں والا شخص اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر سے جیسے ٹھٹھر گئی تھی کہ اس کی آنکھوں میں ریت آ گئی تھی۔ سراپے سے تھل لپٹا ہوا تھا کہ کوئی بھی اسے بوجھ لے کہ اچھا تو تم وہی ہو..... ہاں ہاں..... وہی..... بات مکمل..... تسلیم میں بے وقعتی ہی میسر تھی۔

☆.....☆.....☆

اولڈ کیمپس کے آرٹ کالج کی وہ قدیم سرخ اینٹوں والی عمارت مدتوں گزرنے کے بعد بھی آج اپنی پرانی شان و شوکت کے ساتھ آسمان کی طرف تنی ہوئی کھڑی تھی۔ طویل و تنگ راہداریاں، سنبل کے لمبے درخت اور اسٹوڈنٹس کے گروہ جو ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے، زندگی کی ہلچل تھی اور وقت وہیں کہیں بیٹھا چوری چھپے اس ہنگامے کو دیکھ رہا تھا کہ ابھی روشن دن ہے، کچھ لمحے بیتیں گے اور کالی رات ہر طرف ٹھہر جائے گی۔

آج رنگوں کا دن تھا۔ وہی جو رنگ جو امن پسند ہوتے ہیں، جو محبت پسند ہوتے ہیں۔ اور وہی

رنگ جو صنم پسند ہوتے ہیں، جو کسی صنم گزیدہ لمحے کی دین ہوتے ہیں۔

وہ پانچوں یونیورسٹی کی بس میں لٹک کر یہاں آئی تھیں کیونکہ آرٹ کالج میں تصویری نمائش منعقد ہو رہی تھی جس میں آرٹ کے اسٹوڈنٹس کے فائنل پروجیکٹس ڈسپلے ہونے تھے۔ اور انہوں نے اس ایونٹ کی مکمل تصویروں کے ساتھ تحریری رپورٹ بنانی تھی۔ وہاں سب فنون لطیفہ سے وابستہ لوگ جمع تھے۔ زمانے سے ہٹے ہوئے، بھیڑ چال سے ہٹے ہوئے..... جو اپنی ایک الگ شناخت بنانے کی چاہ میں جتے ہوتے ہیں۔

کنیزاں نے پہلی بار لمبے بالوں والے وہ لڑکے دیکھے تھے جنہوں نے اپنے بالوں کی پونیاں بنائی ہوئی تھیں اور بالوں کے گھونسلے میں برش ٹھونسے ہوئے تھے۔ لڑکیاں اپنے ایزل اور کینوس اٹھائے یہاں وہاں پھر رہی تھیں۔ کچھ موسیقی کے اسٹوڈنٹس گٹار بجا رہے تھے۔

دیکھ اٹیرن باورا ہویا
لھبدا تن والی نوں۔ کسے نہ دتی کسے نہ منگی
دوجے کئی واج نہ لنگی
امبر ہس کے ویکھن لگا
اس ٹارے چھتن والی نوں
دے سائیں تیرے چرخے نے
کت لیا کتن والی نوں

وہ سلیٹی رنگے بالوں والی لڑکی گنگنا رہی تھی۔ وہ ایک الگ ہی دنیا تھی الگ تھلگ..... بے خود کر دینے والی۔

وہ تو آنے پر تیار ہی نہیں تھی مگر اسے تمکین ہی گھسیٹ لائی تھی۔

''تمہاری کلاس نہیں ہے تو کیا ہوا؟ اب تم ہاسٹل میں ہی بوڑھی روحوں کی طرح وقت گزارو گی؟ ہرگز نہیں تمہیں ہر صورت ہمارے ساتھ آرٹ کالج چلنا ہوگا بس۔''

وہ جو سستی سے بالکونی کا دروازہ کھولے نظارے کر رہی تھی، تمکین کی بات پر اس نے برا منہ بنایا تھا۔

''میں وہاں بور ہو جاؤں گی۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو اور بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

وہ اپنے ساتھ ساتھ کنیزاں کے کپڑے بھی استری کر چکی تھی تو اسے چار و ناچار آنا ہی پڑا تھا اور وہ وہاں موجود تھی۔

''واقعی میں نے اچھا کیا جو تم لوگوں کے ساتھ یہاں چلی آئی، یہاں تو زندگی ہی اور ہے۔''

فردوس نے لمبا گھٹنوں تک آتا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس کے لمبے بال جوڑے کی شکل میں بندھے تھے جن میں اس نے گلاسز اٹھا رکھے تھے۔ عدن جینز کے اوپر آسمانی رنگ کا لانگ کرتا پہنے گھوم رہی تھی۔ سیرت اور فردوس نے اردگرد کے لوگوں کی تصویریں کینچر کرنا شروع کر دی تھیں جو انہوں نے اپنی رپورٹ میں لگانی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں منیزہ ہاشمی صاحبہ تشریف لائی تھیں تو نمائش کا آغاز ہو گیا تھا۔ انہوں نے فنون لطیفہ اور آرٹ کے حوالے سے بات کی تھی۔

''دیکھیں زندگی ہم گزار رہے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ سب پیچھے چھوٹ رہا ہے، یہاں تک کہ کوئی اسپیڈ بریکر نہیں جس کے ذریعے ہم وقت کی سوئیوں کو روک سکیں..... مگر آرٹ ایک ایسی چیز ہے جو خود اسپیڈ بریکر ہے۔ روک دیتا ہے، فریز کر دیتا ہے..... تصویر اپنے اندر عالگیریت رکھتی ہے مدت کو قید کر لیتی ہے کہ جب آپ دیکھیں گے اسی لمحہ میں پہنچ جائیں گے۔''

افتتاح ہو گیا تھا اور رش بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔

امجد اسلام امجد صاحب کے ساتھ ساتھ زلفی بخاری نے بھی ایونٹ کو رونق بخشی تھی۔

تمکین اور عدن اپنی اپنی ڈائریوں میں پوائنٹ نوٹ کر رہی تھیں۔

''یوں لکھو کہ آرٹ کالج میں فائنل ائیر کے اسٹوڈنٹس کے فائنل۔''

''لکھ تو رہی ہوں مگر ابھی بہت سے مہمان باقی ہیں، ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔''

فردوس سیرت کو کیمرے کی تیکنیک سکھا رہی تھی۔

ان چاروں کو اپنے اپنے کاموں میں مصروف دیکھ کر ہی کنیزاں کو ایک جلا بھنا ہوا سا خیال آیا تھا۔

"جانے مجھے کیا شوق چڑھا تھا کیمسٹری کے میدان میں جھنڈے گاڑنے کا، کیمیکلز کی بدبو والی لیب میں اب کتنے سال گزریں گے اور ان لوگوں کو دیکھو، خوب مزے میں ہیں۔"

وہ یہی کچھ سوچتی ہوئی دیواروں پر لگے پینا فلیکس دیکھتی ہوئی گیلری کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں فیتہ کٹنے کے بعد لوگ بڑی تعداد میں تصویریں دیکھ رہے تھے، وہ بھی وہیں آ گئی تھی۔ اونچی چھت سفید پینٹ والی دیواروں والی گیلری میں عجیب سی ٹھنڈک اور رنگوں کی موجودگی کا احساس تھا۔ سفید، آسمانی، زعفرانی..... ہر طرف رنگوں کی حکمرانی تھی۔

وہ ایک ایک تصویر دیکھی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی واٹر کلرز کے ساتھ ساتھ آئل پینٹنگز بھی آویزاں تھیں۔ دائیں دیوار پر کچھ خطاطی کے فن پارے نظر آ رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے جیسے اس ماحول میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ ہر تصویر میں ایک کہانی تھی..... کہیں روشنی غائب تھی اور رات غالب تھی۔ کہیں سیاہ اندھیرے سے چاندنی جھانکتی تھی۔ ایسے ہی اچانک چلتے چلتے وہ سامنے آنے والی تصویر کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی، پھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ تصویر جیسے حقیقت تھی، ساری کی ساری حقیقت۔

کالی گھور سیاہ آنکھیں تھیں جن میں ریت کے ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ وہ اس کا وہم تھا یا کوئی وسوسہ..... اسے وہ چاروں بھول گئی تھیں۔ تصویر میں وہ تھل واسی کنیزاں فاطمہ کی آنکھیں پینٹ کی گئی تھیں جن میں ریت کے ٹیلے نظر آ رہے تھے۔

کہا تھا ناں کہ رنگ صنم پسند بھی ہوتے ہیں.....!

☆.....☆.....☆

آدم کو اس اتفاق نے زنجیر کر لیا تھا۔ وہ سو فیصد وہی تھی جو اپنی آنکھوں کو کھوج رہی تھی، اس بات سے لاعلم کہ انہیں بنانے والا کچھ فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس پیروں میں کھسہ پہنے ہوئے اور آنکھوں میں کاجل کے گہرے ڈوروں کے ساتھ وہ واپس مڑی تھی کہ وہ سامنے آ گیا تھا، وہ ڈر گئی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' لفظ تالے میں بند تھے بڑی مشکل سے بند ٹوٹے تھے۔

''میں تو یہی ہوتا ہوں۔'' وہ ہاتھ باندھے تھا۔ لمبے بال کندھوں پر بکھرے تھے اور کانوں کے پیچھے برش اٹکا ہوا تھا جس پر رنگ سوکھ گئے تھے۔

''یہ۔ یہ۔'' پینٹنگ کی طرف اشارہ کر کے وہ جیسے ہکلائی تھی۔ اب کیسے کہے؟ کیا کہے کہ وہ آنکھیں اس کی آنکھیں جیسی کیوں تھیں؟

''تمہیں برا لگا؟'' اور سوال جیسے چابک کی طرح لگا تھا، گمان یقین میں بدل گیا تھا۔

اسپرے پینٹ کی مہک پھیل رہی تھی تیزی سے۔

''ہاں میرے پاس ریت کے ٹیلے ہیں اور میں تمہیں ان ہی ٹیلوں میں دفن کر دوں گی سمجھے۔''

''مجھے آدم کہتے ہیں۔'' آدم جی کو آرٹ کالج کی راہ داریاں جنت لگنے لگی تھیں۔

''تمہیں شیطان کہنا چاہیے تھا۔'' وہ آگے بڑھنے لگی تھی، دل کا شور بڑھ رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے تمہیں سب پتا ہے۔'' وہ پر یقین تھا جیسے وہ سب سمجھتی ہے۔

''کیا پتا ہے مجھے؟'' بازو باندھ کر وہ مڑی تھی۔ وہ نیلی آنکھیں کشش ثقل سے بھی زیادہ کھینچتی تھی۔

''کہ تمہیں دیکھ کر مجھ پر رنگ اترنے لگتے ہیں۔ کورے صفحے رنگین ہونے لگتے ہیں۔ تمہاری آنکھوں کی صراحیوں میں دنیا قید ہو جاتی ہے۔''

آرٹ کالج کی عوام نے اس سفید لباس میں ملبوس سیدھی سادی لڑکی کے پیچھے آدم جی کو تیز تیز بھاگتے دیکھا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو اپنی ہی ذات میں بس کل کائنات تھا اور آج وہ ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''مجھے لفظوں کے جال میں مت الجھاؤ آدم۔''

ہائے ساری کائنات میں بازگشت گونجی تھی۔ پوری زندگی میں کبھی کسی نے اس ردھم سے اسے نہیں پکارا تھا۔

آدم.....آدم.....آدم.....

''میں شکاری نہیں ہوں۔''

وہ دونوں راہداریوں میں تیز تیز چلنے لگے تھے وہ ادھر ادھر ان چاروں کو ڈھونڈ رہی تھی جیسے میلے میں کھو گئی ہو۔ وقت محبت پسند ہو گیا تھا۔ دل پر انوکھا بار اترنے لگا تھا۔

''جو بھی ہو، جیسے بھی ہو، میرا راستہ چھوڑ دو.....'' آنکھیں ویسے ہی بھر بھر آنے لگیں۔

''اپنا نام بتا دو پلیز..... میں ابھی چلا جاؤں گا۔''

وہ عدن کو دیکھ چکی تھی اس کی طرف بھاگی تھی جیسے ساری دنیا اس کے پیچھے پیچھے ہو اور وہ نہتی بھاگ رہی ہو کہ بچ بچاؤ کر لے۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ کب سے ہم تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ سیرت پیٹر اور کوک لیے کب سے تمہیں ڈھونڈنے کے مشن پر نکلی ہوئی ہے۔''

سیرت اور تمکین کنیزاں کو ہر جگہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اب گیلری سے باہر نکلی تھیں اور وہیں سیڑھیوں کے پاس تمکین نے اس نیلی آنکھوں والے شخص کو دیکھ لیا تھا جس کی نظریں ایک ہی سمت دیکھتی تھیں۔ وارفتگی۔ دیوانہ وار.....!

تمکین نے مرکز کی طرف نگاہ کی تھی اور جیسے کائنات ہی ایک نقطے پر آ گئی تھی۔ کنیزاں فاطمہ کی آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا۔

صنم گزیدہ سمے کا وار چل گیا تھا.....

☆.....☆.....☆

اندرون لاہور کے اس گھر کی چھت تلے وہ نو عورتیں جمع تھیں جن کے اپنے اپنے مسائل تھے اور وہ نو کی نو عورتیں چائے کی پیالیاں تھامے جیسے اپنی زندگی کے چکر میں جکڑی ہوئی تھیں۔ ان کی سوچیں کسی بھی ایک نقطے پر مرتکز نہیں تھیں۔ وہ نو عورتیں جیسے ایک کسی مرکز پہ جمع ہو گئی تھیں جہاں ان کے پاس سوچنے کے لیے اپنے مسئلے تھے۔

ان پانچوں کو اس گھر میں آ کر ایسے لگا تھا جیسے ابھی ابھی وہاں جنگ ہوئی ہو، وہ کوئی مقام جنگ

ہو جہاں سے کوئی مال غنیمت بھی لے گیا ہو۔ بیٹھے بیٹھے جیسے کنیز فاطمہ نے وہاں کے ماحول پر نظر ڈالی تھی۔ وہ لمبی کھڑکیوں والا گھر جس کی کھڑکیاں بند تھیں اندھیرے میں ہلکا ہلکا ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ زرد بلبوں کی روشنی تھی جن میں وہ مشکل سے ایک دوسرے کو دیکھ پا رہی تھیں۔ کچھ وقفے کے بعد ماہی جی جو اسے بالکل سنجیدہ اور سوبر سی لگی تھیں مسکرا کر انہیں دیکھ لیتی تھیں۔

ان پانچوں کے دلوں میں ایک وہم اور وسوسہ بیٹھ گیا تھا کہ وہ ایک ایسا مقام تھا جہاں قیامت گزر چکی تھی اور اس کے اثرات اب بھی باقی تھے۔ انہوں نے آتے ہی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تخت پر نیلم کو کسی لٹے پٹے ہوئے سپاہی کی طرح بیٹھے ہوئے دیکھا تھا جو اپنا سب کچھ ہار چکا تھا، اپنا آپ بھی۔ اور سب سے بڑی بات یوں لگتا تھا، کنیز اں کی نظر نے بھانپا تھا، جیسے وہ صنم گزیدہ لمحے کی زد میں آ گئی تھی۔

جب سب ختم ہو جاتا ہے جہاں سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔

آرٹ کالج میں رپورٹ مکمل کروانے کے بعد فردوس گوہر نے ہی یہ پلان بنایا تھا کہ وہ ان چاروں کو لے کر نتاشا ابراہیم سے ملوانے کے لیے اندرون لاہور آ گئی تھی۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ شاید اتنے ٹینشن زدہ ماحول میں نتاشا مضطرب ہو تو وہاں ان لوگوں کی آمد سے کوئی فرق پڑے گا اور واقعی تھوڑی دیر کے بعد فرق پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ چند لمحوں کی طویل خاموشی کے بعد وہ جیسے ایک دوسرے سے ادھر ادھر کی باتیں کرنا شروع ہو گئی تھیں۔

سب سے پہلے ساون کی آنے والی بارشوں کے بارے میں بات کی گئی تھی حالانکہ ان کا ساون کی آنے والی بارشوں سے دور تک کوئی لین دین نہیں تھا مگر بات شروع کرنے کے لیے کوئی موضوع ضرور درکار تھا۔

جانے اماں نے، موقع کی مناسبت تھی یا نہیں، دریوں اور کھیس کے دھاگوں کی بابت بتانا شروع کر دیا تھا کہ ان کے دور میں کیسے ریشم تیار کیا جاتا تھا اور کپڑے کی کون کون سی قسمیں تھیں لیکن اب سب کچھ بدل گیا تھا۔

ماہی جی انہیں اپنے اسکول کی مشکل روٹین کے بارے میں بتانے لگ گئی تھیں۔

''بس اب تو ایسے لگتا ہے جیسے زندگی بھی اسکول کی بجنے والی پیریڈ کی گھنٹی کی طرح ہوگئی ہے، انسان اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے وہی زندگی جیتا رہتا ہے اور گھنٹی کے مطابق کام ترتیب دیتا رہتا ہے۔

فردوس گوہر نے اپنی اس سکھی سہیلی کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کے تنے ہوئے نقوش، اب آہستہ آہستہ ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سکون میں جا رہی ہو۔ وہ فردوس گوہر کے گلے لگ کر خوب روئی تھی۔ وہ چاروں اس رونے کا مطلب نہیں سمجھی تھیں لیکن انہوں نے اس بات کو کریدنے کی کوشش بھی بالکل نہیں کی تھی۔ کیونکہ انہیں لگا تھا جیسے وہاں کوئی حادثہ ہوا ہو۔ وہاں موت جیسا سناٹا تھا، جیسے کوئی مر گیا ہو۔ پھر فردوس نے ہی نتاشا سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔

چھوٹے سے صحن میں وہ مارننگ گلوری سوکھ گئے تھے، جیسے پانی کو ترس گئے ہوں۔ چھتوں پر سے کبوتروں کی غٹرغوں کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔

''ہاں تو پھر تم کب آ رہی ہو؟ مام بھی تمہیں بہت مس کر رہی ہیں۔''

''بس میں کچھ دنوں تک آؤں گی۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

''جو بھی ہو اب میں تمہاری مزید چھٹیاں برداشت نہیں کر سکتی۔ آخر میں تمہیں کب تک اپنی سہیلی بنا کر رکھ سکتی ہوں..... بھئی میں تمہیں تنخواہ دیتی ہوں۔'' فردوس گوہر نے جیسے معمول کا لہجہ اپنانے کی کوشش کی تھی۔

دم گھٹنے والا ماحول تھا گھٹا گھٹا..... لٹا پٹا ہوا.....!

چھوٹی چھوٹی گفتگو کا وہ سلسلہ تھوڑی دیر بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔

''پتا نہیں لاہور پہلے جیسا نہیں رہا۔ وہ پہلے جیسی ثقافت، رسم و رواج، حویلیاں بھی تو وہ نہیں رہیں۔ وہ پرانے اونچی چھتوں والے گھر ہوتے تھے، پرانے ظروف ہوتے تھے۔ اب سب کچھ وقت کے ساتھ ساتھ بدل گیا ہے۔'' اماں نے جیسے پرانے لاہور کو یاد کرتے ہوئے انہیں پرانے لاہور کی باتیں بتانا شروع کر دی تھیں۔ ''ہم اور ہندو اکٹھے رہتے تھے، آنا جانا تھا، جمنا اور گنگا ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ دونوں بہنیں بہت اچھی سہیلیاں تھیں ہماری، یوں ہی ہم بھی اکٹھے ہوتے تھے۔ اب بھی کبھی

ان دونوں کی بڑی یاد آتی ہے، آخر دوستی کون سا مذہب دیکھتی ہے۔ بس اکٹھے ہم پلے بڑھے تھے، زندگیاں گزری تھیں۔ سب پلٹا کھا گیا اور جانے رشتے کہاں گم ہو گئے۔ کافی عرصہ وہ لوگ یہاں رہے انہیں یہاں لاہور میں کوئی پریشانی نہیں تھی مگر پھر بھی انہیں انڈیا واپس جانا پڑا تو ان کی یاد اب بھی دل میں تازہ سی رہتی ہے۔"

سیرت کو تاریخ اور پرانے رسم و رواج سے دلچسپی تھی تو وہ اب اماں کے ساتھ اپنا چائے کا کپ لے کر بیٹھ گئی تھی اور ان سے پوچھنے لگ گئی تھی۔

"تو آپ کے وقت میں کون کون سے رسم رواج ہوتے تھے جو ادا کیے جاتے تھے۔"

"بس ہمارے وقت میں یہ ہوتا تھا لڑکیاں بالیاں ساری اکٹھی ہو کے بری ٹانگتی تھیں اور پھر ٹاپ لیے جاتے تھے، مہندی منگوائی جاتی تھی بلکہ عرق تو گھر پر ہی تیار کیا جاتا تھا۔"

سیرت نے ان کو باتوں میں لگا لیا تھا۔ گوہر نے نتاشا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اسے کنارے پر لے گئی تھی۔

"تم پریشان مت ہو۔ مجھے معلوم ہے تم اور تمہارا گھر اس وقت پریشانی سے گزر رہا ہے لیکن تم یقین رکھو آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

نتاشا نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گوہر کو دیکھا تھا۔

"دعا کریں گوہر، کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ مگر کچھ بھی بظاہر ٹھیک نہیں لگ رہا۔ نیلم کی حالت تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں وہ کیا گنوا کر آئی ہے بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔"

نتاشا نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اپنے لہجے اور اپنے اوپر قابو پا سکے مگر دونوں چیزیں اس کے بس سے باہر تھیں۔ فردوس نے دوبارہ اسے گلے سے لگا کر تھپکنا شروع کر دیا تھا۔

"انسان کی زندگی میں بہت سے موڑ آتے ہیں جہاں اسے حوصلہ کرنا پڑتا ہے، صبر کرنا پڑتا ہے۔ مسئلے کو گلے سے لگا کر نہیں بیٹھا جاتا۔ جب تک دل سے لگا کر بیٹھو گے اس کا حل نہیں ہو گا۔ نیلم کو حوصلہ دو تم اور ماہی جی۔ یقیناً وہ اس ٹراما سے نکل آئے گی۔"

زندگی بھی کیا چیز تھی۔ تاشا کو فردوس کی زندگی میں جس چیز کے لیے شامل کیا گیا تھا وہی چیز گوہر اس کے لیے کر رہی تھی۔

''آخر کب تک حوصلہ دیں ہم۔ آپ دیکھ رہی ہوں ناں اس کی حالت، اتنے بڑے دھچکے کے بعد وہ مجھے اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس نے کھانا پینا چھوڑا ہوا تھا۔ یہ تو میں نے، اماں اور ماہی جی نے منت ترلے کر کے اسے کچھ کھلایا واسطے دے کر۔ اسے اس چیز سے باز رکھا ہے، تین بار وہ خودکشی کی کوشش کر چکی ہے۔''

گھر کے مکینوں کے لیے ہر بار چھت سائبان نہیں ہوتی یہاں بھی نہیں تھی۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ دیر کے لیے میری نیلم سے اکیلے میں بات کروا دو۔''

اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

''خیریت تو ہے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں اس سے؟''

''بس میں یہی چاہتی ہوں کہ میں اس سے بات کروں کہ وہ میری بات سمجھ لے گی۔''

وہ نیلم کی طرف آئی تھی جہاں کنیز فاطمہ نیلم کے ساتھ بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جانے کیوں کنیزاں فاطمہ کو ایک پل میں خبر ہو گئی تھی کہ اسے بھی صنم گزیدہ مے کی چوٹ نے توڑا تھا۔ شیرازہ بکھر کے رہ گیا تھا اس کی آنکھوں میں بھی۔ کنیز فاطمہ کو جیسے ریت کے ٹیلے نظر آتے تھے۔ اسے پتا چلا تھا کہ آدم جی جیسے آرٹسٹ نے اس کی اور نیلم کی آنکھیں ہی پینٹ کی تھیں، جہاں دور دور تک ویرانی تھی اور خلا تھا اور جہاں آگ بگولے چلتے تھے جن کے درمیان کچھ نہیں ٹھہر پاتا تھا۔

☆.....☆.....☆

نیلم نے بہت خاموشی سے اپنی اداس آنکھیں سامنے کھڑی اس لڑکی پر جما دی تھیں جو بہت حسین دکھتی تھی۔ دودھ جیسی سفید رنگت اور چہرے پر ہلکی مسکراہٹ کی لکیر سی تھی۔ نیلم کو اس پر وہاں اس حالت میں بھی رشک آیا تھا کہ کوئی کیسے اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے۔

وہ کھڑکی جس میں وہ تینوں بہنیں اکٹھی ہو کر دور محلوں کے اوپر اندرون لاہور کے آسمان پر کبوتر

اڑتے ہوئے دیکھتی تھیں، بند تھی۔ وہ فردوس نے آہستہ سے کھول دی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے تمہارا صدمہ سب سے بڑا ہے، تم ہی اپنی زندگی کا سب سے مشکل وقت گزار رہی ہو۔ ایسا نہیں ہوتا نیلم۔ زندگی میں بہت سے لمحے ایسے آتے ہیں جب انسان کو لگتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ گنوا چکا ہے اور اب اس کے پاس گنوانے کو کچھ بھی نہیں رہا، لیکن یہ ہماری خام خیالی ہوتی ہے۔ انسان کو صرف وہی نظر آتا ہے جو اس سے کھو چکا ہوتا ہے۔ انسان کی نظر کبھی اس پر نہیں جاتی جو اس کے پاس موجود ہوتا ہے، تمہیں کیا لگتا ہے ایک محبت کی ناکامی، ایکسپلائٹ ہونا، ایک فلرٹ کو تم اپنی زندگی بھر کا روگ بنالوگی تو یہ تو آسان کام ہے۔ مجھے دیکھو، میری طرف دیکھو مجھ میں تمہیں کیا کمی نظر آتی ہے۔"

نیلم نے جیسے اس کی بات پر غور سے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دی تھیں۔ مکمل کامل دکھتی تھی۔ ہنستی تھی تو کئی ریاستوں کی مالک نظر آتی تھی۔ وہ تو اس دنیا کی نہیں لگتی تھی۔ اب تک اس نے نتاشا سے اس کی تعریفیں سنی تھیں لیکن وہ زندگی میں پہلی بار فردوس گوہر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی لمبی پلکوں والی آنکھوں سے آنسو جھرنے کی مانند بہہ رہے تھے۔ نیلم ابراہیم پر ان آنسوؤں نے عجیب اثر کیا تھا۔

"مجھے دیکھو نیلم، تم ایک مکمل لڑکی ہو اور میں کیا ہوں۔ شاید میں تمہیں بتا بھی نہ پاؤں مگر میں تمہیں صرف اتنا کہوں گی کہ زندگی کے سارے فیصلے ایسے نہیں لے لیے جاتے۔ زندگی اتنی ارزاں نہیں ہوتی۔ ہسپتالوں میں دیکھو، روڈز پہ سوئے ہوئے لوگوں کو دیکھو، تمہیں لگتا ہے تمہاری زندگی سب سے مشکل ہے اور تمہیں خودکشی ہی واحد حل نظر آتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بہت خودغرض ہو رہی ہو۔ اپنی ماں کا سوچو، اپنی بہنوں کا سوچو جو اپنی زندگی کے مسئلوں سے لڑ رہی ہیں تو تم بھاگنا چاہتی ہو، فرار حاصل کرنا چاہتی ہو۔ اگر تمہارا دل چاہ رہا ہے خودکشی کرنے کا تو چلو میں تمہیں موقع دے رہی ہوں، کھڑکی کھلی ہے یہیں سے کود جاؤ۔ ابھی کود جاؤ۔"

نتاشا کچن میں ٹھنڈی چائے گرم کر رہی تھی۔ اماں اب بھی راوی کی تباہی کے قصے سنا رہی تھیں۔ ماہین ابراہیم عدن اور تمکین کو اپنے لیے آنے والے اور ریجیکٹ کر جانے والے رشتوں کے واقعات کسی لطیفے کی طرح سنا رہی تھیں کہ ذرا ہنس لیں..... درد کم ہو جائے..... دل پھٹنے سے بچ

http://kitaabghar.com

جائے.....! نیلم ابھی بھی دھواں دھواں چہرے کے ساتھ فردوس کو دیکھ رہی تھی جو کھلی کھڑکی سے باہر کا راستہ دکھا رہی تھی۔

موت تو اب دکھائی دی تھی۔ اندھی کالی گہری۔ اور عجیب..... فردوس نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔

''میری آنکھوں کو دیکھو نیلم تمہیں کیا نظر آتا ہے۔ میرے ہاتھوں کو دیکھو، میرے وجود کو دیکھو، دنیا ظاہر کو دیکھتی ہے۔ ظاہر کے داغ، ظاہر کا زخم، جس کا مرہم ہوتا ہے مندمل کر دیا جاتا ہے۔ میرے اندر تو ایسا عیب ہے کہ جو میں کسی کو دکھا بھی نہیں سکتی۔ اب تم خود بتاؤ تمہارے پاس زندگی کے اتنے سال ہیں سب مکمل ہے۔ پھر خود کو کیوں سزا دیتی ہو۔'' فردوس کی سسکیاں اندرون لاہور کے گھر میں گونجنے لگی تھیں۔ ''میں تو..... میں تو.....''

فردوس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے نیلم کو پتھر کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جو کامل دکھتی تھی..... جو ہنستی تھی تو نظر ٹھہر جاتی تھی۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ کر رو رہی تھی۔ گھٹنوں تک آتے لمبے سیاہ گھنے بال..... کپکپاتا ہوا وجود.....!

کیا ہو جائے گا اگر وہ سب کو اپنے بارے حقیقت سے باخبر کر دے کہ وہ سبق لیں۔ تو وہ ایک سبق ہے؟ کتاب ہے؟ یا کوئی نامکمل باب؟

وہ لڑکی کیا تھی، یہ نیلم کو آج پتا چلا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔ دونوں کو جیسے درد نے ایک ہی مقام پر اکٹھا کر دیا تھا، جوڑ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کنیز کی نظریں بار بار ماہی باجی کی طرف جا رہی تھیں جنہیں دیکھ کر اسے بے ساختہ بختاور کی یاد آ گئی تھی۔ جانے وہ تھل کے ریت کے ٹیلوں میں کیا کر رہی ہو گی۔ اسے پہلی بار اپنی اس بہن پر بے ساختہ پیار آیا تھا۔

ماہین ابراہیم نے جیسے معذرت کے انداز میں انہیں اپنے گھر کے ماحول سے آگاہ کرنے کی

کوشش کی تھی۔

''انسان کی زندگی میں بہت سے لمحات آتے ہیں۔ حادثات گھیر لیتے ہیں اور انسان کو ان سے نمٹنے کے لیے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا گھر بھی اس وقت ایک حادثے کی زد میں ہے مگر ہمیں خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے ہمارے گھر کو رونق بخشی۔''

وہ گھر، وہ چھت جیسے ان نو عورتوں کے لیے مرہم بن گیا تھا۔ شام ڈھلے کہیں وہ وہاں سے واپس آئی تھیں۔

نتاشا نے انہیں کھانے پر روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر انہوں نے معذرت کر لی تھی۔ کیونکہ ہاسٹل کا وقت ختم ہونے کو تھا اور پھر۔

شام کی روشنیاں جلنے کو تھیں۔ جب انہوں نے ہاسٹل میں قدم رکھا تھا۔

ان کے پاس آج کے دن یہ بات کرنے کو بہت کچھ تھا۔ وہ ابھی ہاسٹل میں آنے کے بعد کوریڈور میں سے گزر رہی تھیں جب تمکین نے اسے متوجہ کیا تھا۔

''سنو! میں نے تمہیں ایک بات بتانی تھی۔''

کنیزاں کا دھیان نیوز کاؤنٹر کے پاس سے گزرتی ہوئی ان دو بلیوں کی لڑائی کی طرف تھا جن کا محبوب مشغلہ دن کے وقت تین چار بار لڑائی کرنا اور بعد میں دوستی کا نعرہ لگا کر اکٹھے کچھ ہڈیاں اور میس سے بچنے والے کھانے کی ضیافت اڑانا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں تھی اور اس کی توجہ اب بھی بلیوں کی ضیافت پر مرکوز تھی۔

''ہاں بولو کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

وہ کوریڈور سے گزر کر پہلے فلور کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔

''آج میں نے اسے دیکھا تھا، مجھے وہ ملا تھا۔''

کنیزاں نے جیسے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''تم کس کی بات کر رہی ہو۔''

''اسی کی بات کر رہی ہوں۔''

''کس کی؟''

کنیزاں نے کندھے اچکا دیے تھے۔ وہ ابھی بھی نہیں سمجھی تھی۔

''اسی نیلی آنکھوں والے کی جو تمہیں ایمپوریم میں ملا تھا۔''

کنیزاں ایک دم سناٹے میں آ گئی تھی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے بات کرنے کی۔''

''میں کیوں کرنے لگی بھلا؟ وہ خود میری طرف آیا تھا، جو بھی تھا اس نے مجھے روک لیا۔''

اس نے تمہیں روک لیا اور تم رک گئیں۔''

کنیزاں کو طیش آیا۔

''تو کیا کرتی اتنا دلکش اور افسانوی سا شخص مجھے روک رہا تھا۔ قسم سے کہانیوں کے ہیروؤں سے بھی زیادہ خوب صورت تھا اوپر سے آرٹسٹ۔''

''بھاڑ میں جائے وہ، بھاڑ میں جاؤ تم۔''

''تو تم کو اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے اگر میں نے اس سے بات کر لی ہے تو۔'' تمکین نے جیسے اسے چڑانے کی کوشش کی تھی۔

''ویسے مجھے کوئی غصہ نہیں آ رہا بس کسی غیر لڑکے سے بات کرنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔''

وہ دونوں مرے مرے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ سیرت تو بھاگ کر کمرے کی طرف جا چکی تھی اور آج کمرے کا تالا کھولنے کی سب سے پہلے ذمہ داری اس کی تھی۔

''اس نے مجھ سے تمہارا نام پوچھا۔''

اس بات پر وہ ایک پل کو ٹھہر گئی تھی جیسے ساری کائنات ٹھہر گئی تھی۔ اس نے رخ موڑ کر تمکین کو دیکھا تھا۔

''اس نے میرا نام پوچھا؟''

''ہاں تمہارا نام پوچھ رہا تھا۔''

''تو تم نے کیا کہا؟''

''میں نے بتا دیا۔'' تمکین نے مطمئن انداز میں کہا تھا جیسے کوئی بڑی بات ہی نہیں تھی۔

''اس کے علاوہ؟'' کنیزاں نے جاننے کی کوشش کی تھی۔

''اس نے تمہارے ڈپارٹمنٹ کا بھی پوچھ لیا۔''

صحیح معنوں میں اب کنیزاں کی روح فنا ہوئی تھی۔

''تو تم نے کیا کیا؟'' اس نے تمکین کو جھنجوڑ دیا۔

''میں نے بتا دیا۔''

اب بھی اس کے چہرے کے سکون میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بڑے اہتمام اور سکون کے ساتھ کنیزاں فاطمہ پر پوری ہاسٹل کی بلڈنگ گرا کر جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت جلدی میں ڈاکٹر کے کمرے سے باہر سیڑھیاں اترتے ہوئے نکل رہی تھی جب گیٹ پر اس کا سامنا خلیل سے ہوا تھا، مگر اس نے اسے نظر انداز کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر خلیل اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

جانے وہ اسے جانتا پہچانتا تھا یا مروت میں اسے سلام کر رہا تھا اور اس کا حال احوال دریافت کر رہا تھا، فردوس یہ اندازہ نہیں لگا پائی تھی۔ اس نے بس بابکل اطمینان سے کھڑے شخص کو دیکھا جو اس کے دل کے تار ہلا دیتا تھا اور اس کے لیے پوری کائنات جیسے کسی موسیقی کے سروں میں اور لے میں آ جاتی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟''

دونوں ایک دوسرے کو جان گئے تھے۔ آتے جاتے وقت ڈاکٹر کے پاس چکر لگاتی تھی تو وہ اسے اکثر نظر آ جاتا تھا اور آج بھی یہی ہوا تھا وہ اسے دیکھ چکا تھا۔

وہ بیڈمنٹن کھیلنے کے بعد اب پسینے میں شرابور ہو کر پورچ میں کھڑا تھا جب وہ پورچ کے ساتھ والی سیڑھیوں سے اوپر بنے ہوئے ڈاکٹر کے کلینک سے نکل کر نیچے آئی تھی۔ باہر ڈرائیور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ موبائل پر ڈرائیور کو بھی ٹیکسٹ کر رہی تھی کہ وہ آ کر اسے لے جائے مگر اب خلیل پاس کھڑا تھا تو وہ اس سے بات کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟'' خلیل کو کوئی اور سوال نہیں سوجھا تو اس نے فردوس سے وہی سوال پوچھ لیا تھا جو اس کے ذہن میں آیا تھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے میں کیا کرتی ہوں گی؟''

خلیل کو جیسے وہ سوال کے بدلے میں سوال بہت دلچسپ لگا تھا۔ سامنے کھڑی لڑکی پر اعتماد انداز میں جیسے اس سے پوچھ رہی تھی۔ خلیل کو بس اس کی آنکھیں نظر آئی تھیں۔ ان آنکھوں میں جیسے عجیب سی بے بسی اور اداسی تھی۔

''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے آ ایک آرٹسٹ ہوں گی۔''

خلیل نے جیسے اس کی آنکھوں اور اس کے سراپے کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ فردوس نے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا تھا جس کو وہ آرٹسٹ لگتی تھی۔

''کوئی اندازہ! آپ کو کیا لگتا ہے میرا آرٹ کے کس شعبے سے تعلق ہو سکتا ہے۔''

''شاید آپ شاعرہ ہو سکتی ہیں۔'' خلیل نے اندازہ لگایا تھا۔

وہ شاعرہ نہیں تھی مگر شاعرہ نظر آتی تھی جیسے مصرعوں سے سجی ہوئی ہو۔ سارے قافیے ردیف مکمل ہوں مگر وہ تو نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کوئی مصنفہ ادیبہ ہوں یا پھر ہو سکتا ہے آپ پینٹ کرتی ہوں۔''

''نہیں۔ میں پینٹ بھی نہیں کرتی۔ میں ادیبہ بھی نہیں ہوں، میں فلاسفر بھی نہیں ہوں۔''

وہ نفی میں سر کو ہلاتے ہوئے مسکرائی تھی۔ اس کی مسکراہٹ ہولے ہولے بڑھتی جا رہی تھی۔

''پھر تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اچھا گنگناتی ہوں گی۔''

جیسے اب وہ اس بات پر پُر یقین تھا خلیل کو ہمیشہ اندازے لگانے کی عادت تھی اور اسے نہیں علم تھا اس بار اس کا واسطہ ایک ایسی لڑکی سے پڑا تھا جس کے لیے اس کے اندازے ہمیشہ کے لیے غلط ثابت ہونے والے تھے۔

''ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ سُر اور تال سے میرا دور دور تک واسطہ نہیں۔ سارنگی، طبلے اور ہارمونیم میں فرق تک کرنا تو مجھے آتا نہیں۔'' موتی دانت ہنس دیے تھے۔ بالوں کی لٹیں اڑنے لگی تھیں جنہیں سنبھالنے میں وہ الجھی ہوئی تھی۔

''آپ کا کیا مسئلہ ہے؟ مجھے لگتا ہے آپ شیزوفرینیا کی مریضہ ہو سکتی ہیں۔'' وہ جیسے اب اسے چھیڑ رہا تھا۔

فردوس اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ پیشانی پہ بکھرے ہوئے بال، پسینے کی بوندیں اب بھی اس کی گردن سے نیچے گر رہی تھیں۔ لمحے کے لیے وہ جیسے اسے دیکھنے لگی تھی، اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اسے کیا کہے۔

''آپ کسی بھی انسان کو کیسے بھانپ سکتے ہیں ایک لمحے میں۔ اس سے ملے بغیر۔ انسانوں کو تو جاننے کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ آپ نے ایک ایسا اندازہ لگا لیا کہ میں کوئی آرٹ کے شعبے کی آرٹسٹ ہو سکتی ہوں۔''

''آپ بہت خوب صورت ہیں۔''

وہ کامپلیمنٹ تھا۔ تعریف کی کون سی قسم تھی وہ یہ سب بعد میں سوچنے والی تھی۔ وہ تعریف۔ وہ انداز گوہر کو دنیا کے باقی تعریفی انداز کی طرح عام سا لگا تھا۔ جیسے وہ یہ سب نہیں چاہتی تھی، اسے تعریف نہیں چاہیے تھی۔ زندگی میں اس نے سب کچھ چاہا تھا بس یہ چیز نہیں۔

''آپ کو شاید اندازے لگانے میں بہت جلدی ہوتی ہے۔ آپ نہیں جانتے مجھے۔ جاننے کی کوشش بھی مت کیجیے گا کیونکہ آپ کے سارے اندازے غلط ہیں۔''

''لیکن میرا ایک اندازہ تو بالکل ٹھیک ہے۔''

وہ بیڈمنٹن کی چڑی لیے جیسے اسے لاجواب کرنا چاہ رہا تھا۔ داد وصول کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ جاتے جاتے پلٹی تھی۔

''کون سا اندازہ؟''

''یہی کہ آپ ایک مکمل شخصیت کی مالک ہیں۔ واٹ اے چارمنگ لیڈی۔''

رونے والی بات پر بھی فردوس گوہر نے خلیل کو ہنس کر دکھایا تھا۔

''اس بار بھی آپ غلط ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ پار کر گئی تھی اور وہ خالی پر سوچ انداز میں اسے پیچھے کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''سکندر نے مکئی کی فصل بوئی ہے۔''

بختاور نے بہت عام سے لہجے میں کنیزاں کو مطلع کیا تھا جیسے معمول کی خبر ہو پہلے جیسی، مگر اگلی کو وہ ڈنک کی مانند لگی تھی۔

''اسے کہو مکئی فصل کو کاشت نہ کرے۔''

صنم گزیدہ لمحوں کی بازگشت نے آلیا تھا، مکئی کے سٹے پھٹنے لگے تھے۔ پٹاخ۔ پٹاخ۔ مکئی بھننے کی مہک نتھنوں میں گھسنے لگی تھی۔ جیسے کوئی دور بہت دور سے ہنس رہا ہو۔

''تمہاری آنکھوں میں توریت کے ٹیلے نظر آتے ہیں۔ تم تو واقعی مکئی کے کھیتوں کی مالک ہو۔''

بختاور کو اچنبھا ہوا تھا۔

''وہ بھلا کیوں نہ اگائے؟''

کنیزاں کے لیے تو جیسے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

''مکئی کی فصل اسے راس نہیں آئے گی بختاور۔''

''ایک بری خبر ہے جو میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی۔'' بختاور نے جیسے حوصلے جمع کرتے ہوئے اسے بتانے کی کوشش کی تھی۔

کنیزاں جو آج کل اپنے حواسوں میں نہیں تھی اور اس کی باتوں کا جواب ہاں ہوں میں دے رہی تھی۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے بختاور اسے تھل میں ہونے والی ایک شادی کا مکمل حال احوال دے چکی تھی، جس میں وہ شادی میں دلہن کے دیے جانے والے جہیز سے لے کر دولہے کی طرف سے آنے والے باراتیوں کے لباس اور کھانے پینے تک کے بارے میں بات چیت کر چکی تھیں۔

وہ ایک دم سے چونکی تھی۔

''کون سی بری خبر ہے؟ خیریت تو ہے نا گھر میں؟ سب ٹھیک ہے نا؟''

وہ جیسے ایک پل کو بے چین ہوئی تھی۔

''ہاں سب ٹھیک ہے۔ خبر کا تعلق سکندر سے ہے۔''

وہ جیسے ایک دم ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

''سکندر کا اونٹ کل رات مر گیا ہے۔''

کنیزاں فاطمہ کو ایک دھکا سا لگا تھا۔ وہ جانتی تھی سکندر کو اونٹوں سے کتنی محبت تھی اور اونٹ کا وہ چھوٹا بچہ جو اس نے کب سے پالا ہوا تھا۔ کسی چیز سے اسے کنیزاں کے سوا محبت تھی تو اپنی زمینوں، کھیتوں، اپنے اونٹ سے محبت تھی۔ اونٹ کے لیے اس کے اندر اس کی محبت بھی دیکھ چکی تھی۔ اس کے اندر جیسے کسی اداسی نے سر اٹھایا تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہوا، دکھ کی بات ہے۔''

''سکندر آیا تو رو رہا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا تم بھی اس سے بات کر لینا۔''

بختاور سے بات کرنے کے بعد اس نے سکندر کے نمبر پر کال ملائی تھی اور دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا تھا۔

''ہیلو۔ بولو۔'' تو وہ جیسے سمجھ گیا تھا کہ دوسری طرف وہ تھی۔

ایک خاموشی کا لمبا وقفہ ان دونوں کے درمیان آیا تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہوا تمہارے اونٹ کے مرنے کا۔''

وہ جیسے اداسی سے بولا تھا۔

''کوئی بات نہیں جس کا رزق تھا اس نے لے لیا۔''

''تم پریشان تو بہت ہو گے، اداس ہو گے، دکھ بھی بہت ہوا ہو گا کہ ایک جانور کو جس کو انسان اپنی اولاد کی طرح پالتا پوستا ہے پھر اسے مرتا ہوا دیکھے تو۔''

''بس کیا کہہ سکتے ہیں اسے ریت کے ٹیلوں میں دفنا کر آیا ہوں۔''

تھل واسی جانور کے مرنے پر بھی کسی خونی رشتے کے مرنے جیسا سوگ مناتے تھے۔ تعلق تو تعلق ہوتا ہے۔

''اب بھی لگتا ہے ریت کے ٹیلوں سے میرے اونٹ کی ٹلی کی آواز گونج رہی ہے اور مجھے دور تک پتا چل جائے گا۔ میں ایک آواز دوں گا اور وہ بھاگتا ہوا میری طرف آجائے گا۔''

سکندر کی آنکھ سے آنسو ٹوٹ کر اس کی قمیض کے کرتے میں جذب ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا گرنا کنیز اں کو بھی محسوس ہوا تھا۔ ایک پل کے لیے وہ صنم گزیدہ لمحے کا سحر بھول گئی تھی۔

''تم پریشان مت ہو۔ اللہ تمہارے رزق میں برکت دے گا۔''

کچھ دیر تک اس سے بات کرنے کے بعد خاموشی سے کال کاٹ گئی تھی، وہاں تو جیسے اداسی پھیل گئی تھی۔

اس رات بھی رات کو دیر تک جب سارے سکون سے سو رہے تھے تو رات کی آندھی نے حملہ کیا تھا اور اس رات کی آندھی میں جانے کیا کیا کچھ شامل تھا کہ بہت سے کھنگل پھر سے ریت میں ڈوب گئے.....!!

راہ فرار نہیں ہے تیرے عشق سے
مبتلا ہوں پیار میں کہ نفس ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

باب نہم

پانچ قالب

جندے نی! کیہ کارے کیتے
آپے آس دے چولے پاڑے
آپے بہہ کے سیتے
جندے نی! تک چیت وساکھاں
توں پھر دی ایں میلی کچیلی
دس تینوں کیہ آکھاں ڈ؟
جندے نی! تینوں کیہڑا دسے
لوں لوں تیرا عیباں بھریا
موت وٹینڈی رسے
جندنی! کیہ ویلے آئے
اک دوجے دی جان دے ویری
اکو ماں دے جائے

پانچ قالب اپنی اپنی رمز میں مختلف ہیں کہ ہر دل کی اپنی رمز ہے۔ ہر دل کا پانا وسوسہ ہے کہ جو اندر بیٹھ جائے تو دل کو باہر نکال دیتا ہے۔ وہ پانچ قالب تھیں..... پانچ دل..... طاق کا ہندسہ..... جو جفت (دو چیزیں..... جوڑ) کی تاک میں ہے۔

http://kitaabghar.com

تمکین جمال کے دل میں خوابوں کی بیجائی کی گئی تھی۔ اس زمین پر خواب ہی خواب اگے ہوئے تھے جن کی کچی پگڈنڈی پر کوئی پگڑی سوار شہزادہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر آنے والا تھا۔

سیرت امتیاز کو قصوں میں جا کر رہنا اچھا لگتا تھا کہ اپنے آس پاس تخیل کی فصیلیں کھڑی کر لیتی تھی کہ شیریں فرہاد جیسی محبت پنپ جائے گی۔ بس یونہی ایک نظر کی مات ہو..... تمام عمر کاٹ لی جائے۔

کنیزاں فاطمہ کا دل اصل سے بھاگتا تھا کہ اصل سے اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ دور بھاگتی تھی، خوف کھاتی تھی، دل شر کی نوک پر تھا جہاں صرف درد تھا کہ اصل سے بھاگو تو وہ بھی پیچھے آتا ہے کہ.....

عدن جبار کے قالب کی دسترس میں سب آ جاتا تھا جگہ، چیزیں اور انسان کہ وہ اسی میں ہلکان رہے کہ ہاتھ سے سب پھسل رہا ہے، کچھ تو ٹھہرے کہ تسلی ہو مگر سب عبث ہے سب ہی کچھ بھاگے گا.....

فردوس گوہر کے دل کا المیہ شناخت تھا کہ وہ بلھے شاہ کے مصرعے کی تصویر تھی، بلھا کی جاناں میں کون۔ اور جب اپنی خبر ملتی ہے تو انسان کو کھرے کھوٹے ہونے کا پیمانہ مل جاتا ہے ورنہ تو دنیا کے پاس پیمانے بہت.....

چیت، وساکھ، کاتک، ساون، بھادوں سارے موسم زہر زہر تھے کہ قالبوں کی بات تھی۔ اور دلوں کے سارے پہر نیلے نیلے..... بات رہی رنگوں کی تو پھر کچھ مدت درکار ہے ہر دل کو اپنا رنگ مل جائے..... بس تھوڑا سا انتظار.....!

☆.....☆.....☆

''پتا نہیں چلا اور وقت اتنی تیزی سے گزر بھی گیا۔''

تمکین اپنے کپڑوں کی تہ لگاتے ہوئے غور سے کنیزاں کی بات بھی سن رہی تھی جو بالکونی کا دروازہ کھول کر سامنے کوریڈورز میں لڑکیوں کی ہلچل کو ملاحظہ کر رہی تھی، واقعی وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے اور وقت کسی ریس کے گھوڑے کی مانند سرپٹ دوڑا تھا کہ ان کا پہلا سمسٹر اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔ سارے لوگ اب پانچ مہینوں کے بعد اپنے اپنے گھروں کو جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ سیرت بھی جانے کیوں خاموشی کے ایک طویل حصار میں تھی کہ دل میں دور تک سناٹا تھا اتنے دنوں بعد گھر جانے کی

کوئی خوشی اندر سانس نہیں لے رہی تھی کہ جسے گھر کہتے ہیں۔ جو انسان کی اپنی چھت ہوتی ہے جہاں انسان کا اپنا سکون دفت ہوتا ہے کہ کبھی بھی کہیں بھی کسی بھی اصول ضابطے کو کنارے کر کے چاہے کھلے آسمان کی چادر تلے بچھی زمین پر لیٹ کر آنکھیں موند کر خود کو لمحہ موجود کے حوالے کر دیا جائے۔

''تو کیا وقت کو رک جانا چاہیے تھا؟''

''وقت رک سکتا بھی نہیں کہ ہر چیز سے بو آنے لگے گی۔''

''تم گھر واپسی پر خوش ہو کیا؟'' تمکین نے پوچھا۔

کنیزاں نے نیلے آسمان کی وسعتوں میں جیسے اس جواب کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔

''شاید میں ہوں۔''

تمکین جوتوں کے ڈبے اٹھا کر جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔

''بختاور کو تو تمہارا بہت انتظار ہوگا ناں؟'' وہ ہولے سے ہنس دی تھی۔

''ہاں وہ تو بہت زیادہ خوش ہے مگر اسے ابھی بھی لگتا ہے کہ پندرہ چھٹیاں کم ہوتی ہیں۔''

''ظاہری بات ہے۔ وہ کبھی اتنا وقت تم سے دور جو نہیں رہی تھی۔''

کنیزاں لڑکیوں کو اپنے کپڑے تاروں سے اتارتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ہر طرف افراتفری سی پھیل گئی تھی، ہر کوئی اپنے گھونسلے کو جانے والا تھا۔

''ہم ہاسٹلوں میں رہنے والے بھی سائبیریا سے آنے والے اڑتے پرندوں کی طرح ہوتے ہیں، سفر ختم ہی نہیں ہوتا، اچھے موسم کی تلاش میں غرق کہ پھر کہیں اور کوچ کر جائیں۔''

جانے کیوں کنیزاں کو لگا تھا کہ وہ دونوں کسی ایک ہی کیفیت کے زیر اثر آ گئی تھیں۔ محسوسات جیسے ایک ہی مرکز پر جمع تھے۔ نیلے آسمان پر ہاسٹل کی فصیلوں سے اڑنے والے جنگلی کبوتروں کے ٹولے نظر آنے لگے تھے۔

''بس کیا کہوں ہم ہاسٹل والوں کا تو جہیز ہی ختم نہیں ہوتا۔ ہر بار سوچتے ہیں کہ اس بار گھر گئے تو زیادہ سامان ساتھ نہیں لائیں گے اور جب گھر چھوڑنے لگو تو چیز ضروری ہونے لگتی ہے کہ یہ بھی ساتھ لے لیں۔ اب

مجھے دیکھ لو سب کچھ پیک کر دیا ہے کہ کہیں کچھ ضرورت نہ پڑ جائے مگر یہ گٹھڑا اٹھانا بھی مجھے ہی ہے۔"

سہ پہر کی مدھم ٹھنڈی دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ وہ تینوں دو دن پہلے مارکیٹ سے گھر والوں کے لیے ضروری خریداری تو کر ہی آئی تھیں۔

کنیزاں نے بختاور کے لیے کاسمیٹکس کی کافی چیزیں خرید لی تھیں۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ بختاور کو زندگی میں غازے کی کبھی ضرورت نہیں رہی تھی مگر یونہی وہ سب کچھ لیتی تھی نیل پینٹ، لپ اسٹکس، بلش آن اور پرفیوم کہ اسے اچھا لگے گا۔

سیرت نے اچھرہ میں دو گھنٹوں کی خواری کے بعد کہیں جا کر پوپلی بوا کے لیے ایک چکن کا دوپٹا خریدا تھا۔

"آیت کے لیے کچھ نہیں خریدو گی؟" تمکین کو اس روش میں بھی آیت یاد رہی تھی۔

"نہیں اسے میری چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔" مختصر سا جواب دے کر وہ کنیزاں کے ساتھ سلک سینٹر گھس گئی تھی۔

تمکین نے ابا کے لیے کرتا لے لیا تھا اور بڑے طریقے اور سلیقے سے وہ کرتا اب سامان میں پیک ہو چکا تھا۔ تمکین کو اسٹیچو بنی کنیزاں کو دیکھ کر تاؤ آیا تھا۔

"آخر تم کب پیکنگ کرو گی کیونکہ کل تو نکلنا ہے۔"

وہ اکتائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ جیسے کوئی میلوں کا سفر منتظر ہو..... دل سناٹے میں تھا بس یونہی بے بس..... بے وجہ خیال پر ایک تصویر ابھری تھی۔

"تمہاری آنکھوں میں توریت کے ٹیلے ہیں۔"

وہ سارے رنگ چپکے سے کنیزاں کی زندگی میں گھول کر خود رفو چکر ہو گیا تھا۔ وہ ہلکان ہوئی پھرتی تھی کہ صنم گزیدہ لمحے کی ایسی مار پڑی تھی کہ جس کا تریاق کہیں بھی نہیں تھا۔

"میرا کون سا اتنا سامان ہے جو پیکنگ پر مدت لگ جائے گی۔ بس رات کو سونے سے پہلے کر لوں گی۔"

سیرت نے کنیزاں کی کلائی کی چوڑیوں کے شور پر سر اٹھایا تھا، وہ کافی دیر سے خاموش ہی بیٹھی تھی، دیوار سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے جیسے کسی سادھو کی طرح مراقبے میں چلی گئی ہو۔

''تم ٹھیک تو ہو کنیز؟'' وہ سوال اچانک حملہ تھا کہ کنیزاں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ ایک دم ہی وہ تھرا گئی تھی۔ جیسے خیال کہیں سے کود کر مجسم ہو گیا ہو۔

''میں..... میں ٹھیک ہوں۔''

تمکین نے نئے پرفیوم کی شیشی کا ڈھکن کھولا تھا اور سارے میں خوشبو پھیل رہی تھی۔

''کتنی خوب صورت خوشبو ہے ناں؟''

سب دھندلانے لگا تھا سینٹ کی مہک نے حاوی ہونا شروع کر دیا تھا کہ چاروں طرف رنگوں کی دنیا تھی، اودی، زعفرانی، نارنجی اور زرد رنگ بھی صنم گزیدہ تھے۔ آرٹ کالج کی سرخ عمارت کے پلز سے اب بھی کوئی ہاتھ باندھے ہوئے نظر آتا تھا۔

''مجھے دنیا آدم جی کہتی ہے مگر تم مجھے صرف آدم پکارا کرو۔''

وہ پلٹ گئی تھی کہ ہجوم میں گم ہو جائے..... کوئی سراغ نہ ملے..... مگر یہ کھیل تو اب شروع ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

''نیلم کیسی ہے اب؟'' گوہر نے نتاشا سے پوچھا تھا۔

''زندگی بہت عجیب ہے گوہر، آہستہ آہستہ انسان کو سب کچھ سکھا دیتی ہیں، یہاں تک کہ انسان بڑے سے بڑا صدمہ بھی برداشت کر جاتا ہے۔''

''میں بھی برداشت کر رہی ہوں کہ یہی ہے ہمارے پاس۔ زندگی زیادہ چوائسز بھی نہیں دیتی۔''

وہ دونوں جب بھی اکٹھی ہوتی تھیں تو زندگی کے موضوع کو ادھیڑنے میں لگی رہتی تھیں۔

''وقت ہے ناں، سب ٹھیک کر دے گا۔ سارے پیوند رفو ہو جائیں گے، سب خلا پر کر دے گا۔''

باہر مالی نے پودوں کی کٹنگ شروع کر دی تھی۔ قینچی کی کٹ کٹ کی آوازیں کبھی کبھی پس منظر میں سنائی دے جاتی تھیں۔ تب ہی فردوس گوہر نے اسے چونکا دیا تھا۔

''اس نے مجھے چارمنگ لیڈی کہا۔''

پانی کا گلاس وہ پینا بھول گئی تھی۔

''کس نے؟''

''اس کے علاوہ کون ہوسکتا ہے۔''

''آپ، ملی تھیں اس سے؟'' نتاشا کو شدت سے احساس ہوا تھا کہ اسے اپنی ڈیوٹی پر واپس آنے کی شدت سے ضرورت تھی۔

''میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی نتاشا، وہ واپسی پر مجھے پورچ میں ملا۔ پہلے کہنے لگا کہ میں اسے کوئی آرٹسٹ لگتی ہوں۔ مجھے بہت ہنسی تھی کہ آرٹ سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں..... نہ تو میں صادقین کی کچھ لگتی ہوں اور نہ ہی شیما کرمانی جیسی لوچ دار رقاصہ ہوں..... میں تو بس.....''

''کسی کی باتوں میں مت آیئے گا گوہر..... سب جال ہے..... الجھ جائیں گے۔''

وہ دھیرے سے اپنے سارے موتی دانتوں سمیت ہنس دی تھی۔

''میں اب سمجھ دار ہوگئی ہوں نتاشا، کہ مجھے تعریف کی چاہ نہیں۔ مجھے اپنا اصل معلوم ہے جہاں سب کچھ زمینی ساتھ ہو تو وہاں خیالی کہانیوں کا حصہ نہیں بنتے ہوتے۔''

نتاشا نے بڑی عجیب سی تبدیلی دیکھی تھی، جیسے گوہر بہت بدل گئی تھی اس عرصے میں.....

''آپ بدلی بدلی لگ رہی ہیں۔''

''انسان کب تک ایک حالت کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے نتاشا..... ہمیں خود کو ہی بچانا پڑتا ہے دنیا کے پاس تو بہتیرے کام ہیں۔''

اب وہ دونوں پیکنگ میں لپٹی ہوئی چیزیں کھول کھول کر دیکھ رہی تھیں..... گوہر کو عادت تھی آن لائن چیزیں خریدنے کی جس میں سے کافی چیزیں ناقص اور بیکار ہی ہوتی تھیں۔

''مت خریدا کریں اتنا کچھ..... بغیر دیکھے ہوئے، چیز کو محسوس کیے ہوئے آپ یقین کر کے خرید لیتی ہیں۔''

وہ غیر محسوس انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''بغیر پرکھے، برتے ہوئے ہم انسانوں پر بھی تو اعتبار کر لیتے ہیں ناں اور پھر اپنی زندگیوں میں شامل بھی کر لیتے ہیں۔''

نتاشا کے ہاتھ سے وہ کانچ کا ٹائم پیس گر کر وہیں فرش پر ٹوٹ گیا تھا۔

''تم مت اٹھانا کانچ کے ٹکڑے، زخمی کر دیں گے۔''

نتاشا نے جو اتنے دنوں سے گھر کے ماحول سے اپنے اندر ابال بھرا ہوا تھا وہ سب جیسے ایک ساتھ باہر آنا شروع ہو گیا تھا۔

''گوہر! انسانوں اور چیزوں میں فرق ہوتا ہے..... چیزوں کے نقصان وقتی ہوتے ہیں برداشت کر لیے جاتے ہیں..... انسانوں کے درد دیرپا ہوتے ہیں، عمریں کھا جاتے ہیں۔'' وہ جیسے بیٹھے بیٹھے پھر سے اپنے اندرون کے گھر پہنچ گئی تھی جہاں ماہی باجی اونچی آواز میں گھر کی خاموشی کو توڑنے کی خاطر اونچے قہقہے لگاتی تھیں، انہوں نے ہی نیلم کے پاس بیٹھ کر سمجھایا تھا۔

''کب تک ایسے رہو گی تم؟''

نیلم نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی بڑی بہن کو دیکھا تھا جس کی پیشانی پر جھریاں بڑھنے لگی تھیں۔

''میں نے غلط کیا ناں باجی..... مجھے پتا بھی نہیں چلا اور سب ہو گیا۔ مرد ذات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ سسک رہی تھی..... ماہی نے اسے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

''چلو جانے دو..... ٹھوکر ایک بار کافی ہوتی ہے..... وقت لگے گا سنبھل جاؤ گی مگر اتنا وقت مت لینا نیلو، کہ تمہارے ساتھ ساتھ ہم بھی تھک جائیں۔''

نیلم نے خود کو حوصلے دینے شروع کر دیئے تھے۔

اماں بس چپ چاپ انہیں دیکھے جاتی تھیں۔ زمانے کے منہ انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے۔

شام کو کوکو پاؤڈر کی مہک پھیلنے لگی تھی۔

''نتاشا! کیک کا سانچہ بڑا ہے؟''

نتاشا لیپ ٹاپ پر جھکی ہوئی کچھ ایڈورٹائزنگ کمپنی کی کمپین دیکھ رہی تھی جب نیلم نے اس کے پاس اچانک آ کر پوچھا تھا۔

''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

وہ انگلیاں چٹخانے لگی تھی۔''وہ.....وہ میں کیک بنانے لگی تھی۔''

ماہی باجی کپڑے استری کر رہی تھیں۔انہوں نے سر نکال کر اسے مخاطب کیا تھا۔

''ذرا بڑا کیک بنانا میرا آج زیادہ میٹھا کھانے کو دل ہے۔''

وہ مسکراتی ہوئی نتاشا کی بنائی ہوئی مطلوبہ جگہ سے سانچہ نکالنے لگی تھی۔

زندگی بھی عجیب ہے.....کتنے شیڈز ہوتے ہیں.....ہر رنگ چڑھتا ہے.....اپنی مدت کے بعد اتر جاتا ہے.....بات بھی شاید مت کی تھی.....صدمے کا وقت بھی گزر گیا تھا.....وجود کا سانچہ پھر سے جڑنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام ہونے سے ذرا پہلے وہ ہاسٹل سے کچھ دیر کے لیے باہر نکل آئی تھیں کہ گھر جانے سے پہلے ان راستوں کو دیکھ لیں جہاں ان کے کئی سال گزرنے تھے۔وہی سکھ چین کے درختوں کی چھتنار چھاؤں تلے سرمئی سڑکیں سانس لے رہی تھیں۔کچھ پھل دار درختوں پر پرندے پھل ٹونگ رہے تھے۔کچھ گروپس اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی بحث میں ملوث تھے۔وہیں کچھ لوگ آج ہی گھروں کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ سامان کا انبار کندھوں پر ڈالے،ٹرالی بیگ گھسیٹتے ہوئے ہر کوئی گھر جانے کو پرجوش نظر آتا تھا۔

''دو ہفتوں کے لیے یہاں کتنا خالی پن پھیل جائے گا ناں۔'' جانے کیوں سیرت کو خیال آیا تھا۔''اں بس یہاں سڑکیں دیواریں اور پیڑ پودے ہی رہ جائیں گے انسانوں سے یہ جگہ خالی ہو جائے گی۔''تمکین کو زور سے ہنسی آ گئی تھی۔

''کچھ آدم بیزار لوگ پھر بھی یہاں موجود رہیں گے تم دونوں بے فکر رہو یاسیت کی کچھ لگتیو۔''

سیرت نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''تم کتنی پتھر دل ہو، کچھ اثر نہیں ہوتا تم پر۔''

''تم بڑا جانتی ہو ناں میرے دل کے بارے میں۔''

دل کی بحث میں دونوں کو الجھا ہوا چھوڑ کر کنیزاں آگے بڑھ آئی تھی۔ وہ اسٹوڈنٹ سینٹر کا طویل کوریڈر تھا جہاں بھانت بھانت کے علاقوں سے آئے اسٹوڈنٹس کے گروہ جمع تھے۔ ہر کسی کے پاس اپنی بات بات تھی جو سنانے کو بے تاب نظر آتے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر سیرت کی بات کو سوچ گئی۔

''تو کچھ دنوں کے لیے یہ آوازیں بھی جیسے گم ہو جائیں گی۔'' ٹھنڈا سانس خارج کیا تھا۔

''تم تو بس رہنے ہی دو۔ ایک ہی تو زندگی ہے بندہ کیوں سستی اور اداسی کی پوٹلی بنا کر گزار دے..... محرومیاں ساری عمر تھوڑی رہتی ہیں۔''

پیچھے سے ہمسائیوں کی بحث جنگ میں بدل رہی تھی کنیزاں کو پتا تھا کچھ دیر بعد دونوں اسے اپنا ثالث بنانے کو آئیں گی۔ کسی خوشبو سے لدی ہوئی ہوا کا جھونکا آیا تھا سب معطر ہو گیا۔ تب ہی وہ ٹھٹکی زنجیر ہو گئی تھی۔

کوریڈور کے پلر سے ٹیک لگائے وہ سراسر وہی تھا، نظر ہر بار دھوکا نہیں دیتی..... کچھ حقیقتیں سچی اور برہنہ ہوتی ہیں۔ وہ سب کچھ بھول بھلا کر نظر انداز کر کے سامنے سے گزرنے لگی تھی۔

''انجان بن رہی ہو؟'' پیچھے سے سوال آیا تھا۔

''میں تمہیں نہیں جانتی۔'' وہ صاف مکر گئی تھی۔

''میں تو جانتا ہوں۔'' کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

وہ طیش سے واپس مڑی تھی۔

''کیا جانتے ہو؟'' جیسے اپنے غضب سے اسے ابھی کے ابھی غرق کر دے گی۔

''کہ تمہیں سب پتا ہے جو ہمارے درمیان ہے۔''

''کیا ہمارے درمیان ہے؟''

کوریڈور میں دور تک قہقہے گونج رہے تھے۔ ہمسائیاں کنیزاں کی سوچ سے برعکس خود ہی صلح

صفائی کر کے آئس کریم کونز اور کریم چاٹ کی طرف بڑھ گئی تھیں، وہ اکیلی کھڑی رہ گئی تھی۔

''کچھ بھی ہمارے درمیان نہیں ہے سوائے محبت کے۔'' وہ اپنی بات میں کھرا تھا..... سارے رنگوں کی زبان سمجھتا تھا تو جذبوں کی پرکھ بھی تھی اسے۔ وہ لٹھے کی طرح سفید ہو گئی تھی۔

''آدم! میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ نڈھال تھکن سے چور لہجہ آدم جی کو ملال میں مبتلا کر گیا۔

''میرے بس میں تھوڑی ہے۔'' جوتے کی نوک سے پلر کو کھرچتا ہوا، لمبے کندھے پر گرے سلکی بال اور ہاتھوں میں موجود ایک ادھوری تصویر کے ساتھ بھی وہ مکمل نظر آ رہا تھا۔ ''میں نے آج تک کسی انسان کی تصویر نہیں بنائی مجھے جب سے رنگوں کی پہچان ہوئی ہے، مگر تمہاری آنکھیں مجھے کھینچ لیتی ہیں، کہ کاغذ پر ڈھال کر بس دیکھتا رہوں..... تم ہی بتاؤ میرا اختیار تھوڑی ہے۔''

وہ سمجھ گئی تھی وقت رکا ہوا تھا۔ ریس کا گھوڑا نہیں تھا۔ کوئی سست رفتار کچھوا تھا جس نے بس رینگنا تھا۔

''میں ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں کہ راستوں میں کھڑا رہوں مگر میں دل سے مجبور ہوں..... میرے دل کی بے بسی کو تو سمجھو..... کھرا ہوں یا کھوٹا ہوں یہ تمہاری سند سے ہوگا، کہو گی تو دوبارہ تمہیں کبھی نظر نہیں آؤں گا۔''

کنیزاں فاطمہ نے بس پل بھر کو سوچا کہ اگر وہ اسے اب کے بعد نظر نہ آیا تو کیا ہوگا؟

ساری سڑکیں رستے بھٹکا دیں گے..... سکھ چین کے درخت ٹنڈ منڈ ہو جائیں گے..... ہاڑ کا سورج بھسم کر دے گا..... پھر خالی پن پھیلے گا..... دور دور تک..... اندر تک.....

وہ بس چپ چاپ مڑ گئی تھی..... کہ اسے سب پتا تھا.....

☆.....☆.....☆

وہ گھر کو جانے والی اس تنگ گلی میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی تھی کہ اس پانچ مہینے کے عرصے میں کیا کچھ اور کتنا کچھ بدلا تھا۔ عمارتیں بدل گئی تھیں، رنگ و روغن نظر آ رہا تھا اور جو چھوٹے درخت گھروں کے اندر تھے ان کی شاخیں گلی میں نکل آئی تھیں۔ نکڑ والی دکان والے نے شاید اپنا کاؤنٹر بھی بدل لیا تھا۔ تبدیلی ہر جگہ کا مقدر تھی، جگہیں بدلی تھیں..... جانے رشتوں کے کیا رنگ تھے..... وہ ٹھنڈی

سانس لے کر رہ گئی تھی۔ بیگ کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اچانک اسے زمین پر گیندے اور گلاب کے خشک مرجھائے ہوئے پھول نظر آئے تھے۔ ایک راستہ سا بن گیا تھا وہ ان ہی پھولوں والے راستے پر چلتی ہوئی اپنے گھر کے دروازے تک آ گئی تھی جیسے اس کے اپنے گھر میں ہی کوئی فنکشن ہوا ہو گا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکی تھی۔ اندر جانے سے پہلے جانے کیا دل میں آئی کہ اس نے دستک دے ڈالی جیسے پانچ مہینوں میں بہت کچھ بدلنے کی امید تھی۔ دوسری طرف خاموشی ہی رہی جیسے کسی کو دور پار سے آئے ہوئے اس گھر کے فرد سے کوئی غرض تک نہیں تھی۔ آنکھوں میں سیلاب آ گیا۔

''کیا انسان کی جگہ اتنی جلدی ختم ہو سکتی ہے؟ کیا پانچ مہینے کافی ہوتے ہیں؟'' وہ چادر سے آنکھیں پونچھتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ ڈرائنگ روم سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سارا گھر انواع و اقسام کے کھانوں کی خوشبو سے مہکا ہوا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اردگرد کے ماحول کو نظر انداز کرتی سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرے کی چابی اس کے پاس تھی۔ کمرا کھلتے ہی یوں لگا جیسے وہ جگہ جہاں زندگی کے اتنے سال گزرے تھے اسے خوش آمدید کہہ رہی ہو..... وہ سکون سے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ تب ہی دور سے قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی سنائی دی تھی اور چوکھٹ پر پوٹلی بوا کا چہرہ ابھرا تھا جو اسے وہاں موجود دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔ وہ بھی بھاگ کر ان کے گلے لگ گئی تھی۔

''بوا، کیسی ہیں آپ؟'' وہ اسے چوم رہی تھیں۔

''ہائے میری بچی..... میری سیرت..... لگتا تھا تجھے دیکھے ہوئے صدیاں گزر گئی ہوں۔''

''میں نے بھی بہت یاد کیا ہے آپ کو بوا۔'' آنکھیں پھر سے بھیگ رہی تھیں۔

''چل تو آرام سے بیٹھ۔ اتنا سفر کر کے آئی ہے، تھک گئی ہو گی اور بھوکی بھی ہو گی۔ میں تیرے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔''

''نہیں بوا! میں ٹھیک ہوں اور مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے نظریں چرائی تھیں۔

بوا نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''تمہاری خود کو پرایا سمجھنے کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔ میں تو سمجھی تھی کہ تو بدل کر آؤ گی بھلا کیا

فائدہ ہوا ہمیں تجھے اتنی دور اتنی بڑی یونیورسٹی بھیجنے کا۔"

وہ بس ہولے سے مسکرا دی تھی۔ بوا باہر نکل گئی تھیں۔ نیچے سے قہقہے اب بھی گونج رہے تھے جانے کون لوگ تھے۔ وہ چاہ کر بھی بوا سے نہیں پوچھ سکی تھی۔

"خیر مجھے کیا ضرورت ہے۔ اب میں نے اپنی ذات سے تجسس ختم کر دیا تھا۔" وہ آنکھیں بند کیے تکیے پر سر رکھے لیٹ گئی تھی۔

انسان چاہے ساری دنیا گھوم پھر لے مگر اسے ہمیشہ سکون کی نیند اپنے گھر کی چھت تلے ہی آتی ہے..... چاہے گھر جیسا بھی ہو.....!

پرفیوم کی تیز مہک حواسوں پر اچانک سوار ہو گئی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ تب ہی دروازے پر وہ دونوں ابھرے تھے۔

آیت ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سامنے سیرت امتیاز موجود ہو گی۔ ساتھ کھڑا وجود بھی ایک نظر سیرت پر ڈال کر اب سوالیہ نظروں سے آیت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ گڑبڑائی تھی۔

"یہ سیرت ہے۔"

جانے اس سے پہلے اس کا تعارف کس انداز میں کرایا گیا تھا وہ اندازہ نہیں لگا پائی تھی مگر اس نے ادب و آداب کے قرینے کی سلامتی کی خاطر سلام کر ڈالا تھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟ آیت نے بتایا تھا کہ آپ نکاح پر نہیں آئیں گی آپ کے ضروری پیپر چل رہے ہیں۔"

سیرت نے زخمی نظروں سے آیت کو دیکھا تھا۔ پانچ مہینوں نے تو تیزی سے سب بدلا تھا۔ تو وہ کوئی بچوں کی شرارت نہیں تھی گلی میں گیندے اور پھولوں کا راستہ صحیح ان کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔

"جی۔ آیت نے ٹھیک کہا۔"

"آؤ طاہر! چلیں میں آپ کو اپنے برڈز دکھاؤں۔"

وہ طاہر کا بازو کھینچتی ہوئی باہر لے گئی تھی۔

سیرت ننگے پاؤں چلتی ہوئی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اب صحن میں نظر آ رہے تھے وہ ان دونوں کو بس دیکھے گئی تھی۔ شاید وہ دونوں ایک ساتھ اچھے لگ رہے تھے۔ آیت تو ویسے ہی نازک کانچ کی گڑیا تھی اور ساتھ کھڑا تھری پیس سوٹ میں ملبوس شخص بھی فی الحال اچھا لگ رہا تھا جسے شاید اونچے قہقہے لگانے کی عادت تھی۔

وہ دھیرے سے کھڑکی سے واپس ہٹ گئی تھی۔ پوپلی بوا کھانے کی ٹرے لیے آ گئی تھیں۔

''یہ دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔ دل بھر کے کھاؤ۔ اتنی کمزور لگ رہی ہو جیسے وہاں کچھ کھاتی ہی نہیں ہو..... قورمہ ہے اور چاول بھی، جو بھی دل کرے کھاؤ۔ یہ سب تم نے ختم کرنا ہے۔''

وہ انہیں دیکھ کر ہنسی تھی۔

''آپ کو پتا ہے ناں میں کھانے پینے کی پہلے بھی اتنی شوقین نہیں تھی، اب بھی نہیں ہوں۔''

بوا اسے سامنے بٹھا کر نوالے بنا کر کھلانے لگی تھیں۔

''آیت کا پرسوں رات نکاح ہو گیا..... تمہارے ابا نے کہا تھا کہ تمہیں بلا لیں مگر آیت نے کہا تمہارے ضروری امتحان چل رہے ہیں اور تم نے آنے سے انکار کر دیا ہے، مگر میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں بلانے کا اس سے بالکل بھی تکلف نہیں کیا ہوگا۔''

وہ بس خاموشی سے کھانا زہر مار کرتی رہی تھی۔ دنیا میں اتنے انسان یں ان کے اتنے رشتے ہیں مگر اس کے نصیب میں کھوٹے سکے ہی تھے ہمیشہ.....

شام جب ہر طرف پھیل گئی تھی اور کمرے میں بلب کی روشنی پھیلی تھی تو اس نے اپنے بیگ میں سے وہ مختلف موتیوں سے سجا ہوا رنگ برنگا بریسلیٹ ادھڑ ڈالا تھا جو وہ آیت کے لیے لاہور سے لائی تھی۔ رنگ برنگے موتی ادھر ادھر اچھلتے ہوئے سارے کمرے میں بکھر گئے تھے.....!

☆.....☆.....☆

اسے گھر آئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور وہ مسلسل بختاور اور اماں کی نظروں میں تھی۔

جنہیں جانے کیوں وہ پہلے سے بالکل کمزور لگ رہی تھی اور وہ بار بار اسے اسی بات کا احساس دلا رہی تھیں۔

''کیا تم وہاں کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو، اپنا حال تو دیکھو کتنی کمزور ہو کر آ گئی ہو۔''

اور وہ بس اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے ان کی باتوں کو مسکراتے ہوئے سنے جاتی تھی کہ اب انہیں کیا جواب دے۔ ابا بھی ادھر ادھر کام کرتے ہوئے بار بار اس کے پاس تھوڑی دیر کو رک کر اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے تھے اور دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ اس دن اسے شیشے کے گلاس میں پانی پیش کیا گیا تھا اور کنیزاں نے اپنے ہاتھ میں تھمے اس شیشے کے گلاس کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ ساری زندگی اپنے گھر میں اسٹیل کے گلاس میں پانی پیتی ہوئی آئی تھی مگر اب جیسے ان مہینوں نے اس کا اسٹیٹس بدل کے رکھ دیا تھا اسے وہ اہمیت مل رہی تھی جو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جانے کون سی چیزیں ہوتی ہیں یا فاصلے جو رشتوں کو ایک دوسرے کے لیے اتنی اہمیت کا حامل کر دیتے ہیں۔

بختاور اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس نے نظریں چرائی تھیں۔ خوب صورت اور ملائم ہاتھ، تراشے ہوئے ناخن، وہ پہلے سے کتنی خوب صورت ہو گئی تھی۔ بختاور بمشکل نظریں ہٹا پائی تھی۔ اور اب بختاور کی نظریں اپنے ہاتھوں پر تھیں جنہیں ساری زندگی لکڑیاں کاٹتے ہوئے، اپلے تھاپتے ہوئے اسے کبھی خیال ہی نہیں رہا تھا کہ خود پر توجہ دے۔ انگلیوں کے ناخن جانے کب سے خراب ہو کر ٹوٹ گئے تھے اور اس نے کبھی ان کی حفاظت کی طرف دھیان بھی نہیں دیا تھا مگر اپنی بہن کو آج اس طرح نک سک سے تیار، صاف ستھرا دیکھ کر جیسے دل کو ایک ملال سا ہوا تھا۔ وہ بالکل بھی کسی مقابلے میں نہیں تھی مگر پھر بھی وہ انسان تھی اور اپنے ساتھ احساسات رکھتی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ کنیزاں کی طرف سے اس کے دل میں کوئی میل آ گیا تھا مگر پھر بھی یہ چیز اس نے محسوس کر لی تھی۔

اس نے دنیا جہاں کی کوئی چیز نہیں چھوڑی تھی جو وہ کنیزاں کے لیے نہ بنائے۔

کنیزاں نے جب دسترخوان لگا دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے بھری رہ گئیں۔

''بختاور! یہ تم نے کیا کچھ بنا ڈالا ہے۔''

''ہاں تو تمہیں واقعی بہت کچھ کھانے کی ضرورت ہے تو تمہارے لیے ہی تو بنایا ہے۔'' اماں نے

http://kitaabghar.com

محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''مگر یہ بہت زیادہ ہے میں تو اتنا نہیں کھاتی۔''

''بس رہنے دو اب تم بھی شہری لوگوں کی طرح ہر چیز بھی نقص مت نکالو چپ کر کے آرام سے رزق کھاؤ۔ انسان کو تو ہمیشہ گھر کا کھایا پیا ہی لگتا ہے باہر والا تو ویسے ہی ہوتا ہے۔ چلو یہ خالص چیزیں تمہیں وہاں کہاں میسر آئیں گی۔''

دیسی مرغی کا قورمہ ساتھ چنوں کا بونٹ پلاؤ بھی تھا جو وہ ہمیشہ شروع سے ہی شوق سے کھاتی تھی۔ بونٹ پلاؤ بنانے میں بختاور کو کمال حاصل تھا اور وہ یہ بات جانتی تھی کہ کنیزاں کو اس کے ہاتھ کا بونٹ پلاؤ کتنا پسند تھا۔

اسے اسٹیشن سے لانے کے لیے ابا نے سکندر کو بھیجا تھا اور وہ اسٹیشن پلیٹ فارم پر سکندر کو کھڑے دیکھ کر چیں بچیں ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اسے لینے ابا اور بختاور آئیں گے۔

''کیسی ہو تم؟''

ہلکی بڑھی ہوئی شیو، تیل لگے سلیقے سے جمے بال اور کسی پرفیوم کی مہک میں معطر وہ سامنے کھڑا اس کے ہاتھ سے سامان لے چکا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو۔''

وہ بھی مختصر سا جواب دے کر چادر برابر کرتی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی وہ اپنی دھن میں چلتی آ رہی تھی۔ جب سکندر نے اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا تھا، وہ ایک دم سے گڑبڑا گئی تھی۔

سکندر کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ لاہور کے پانیوں نے جیسے اس پر عجیب اثر ڈالا تھا وہ کتنی خوب صورت نازک سی ہو گئی تھی۔ خیر، خوب صورت تو وہ پہلے سے ہی تھی مگر لاہور نے جیسے اسے نکھار کر رکھ دیا تھا۔ سکندر کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

''تم تو بہت بدل گئی ہو۔''

وہ جیسے ایک دم کسی خواب سے چونکی تھی۔

''کیا مطلب کیسے بدل گئی ہوں۔''

''بہت خوب صورت ہوگئی ہو۔ مجھے پتا تھا تم میرے یہاں ہونے کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔ جانتا ہوں مگر پھر بھی میرے دل نے کہا پانچ مہینے کی بہت بڑی مدت ہوتی ہے کہ سب سے پہلے میں ہی تمہیں دیکھوں۔''

وہ بات بدل گئی تھی..... آرٹ کالج کی سرخ دیواریں زندہ ہونے لگی تھیں۔

وہ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے گھر پہنچے تھے۔ اماں، ابا اور بختاور نے اسے دیوانہ وار اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ اماں تو جیسے رونے پر آ گئی تھیں اور ابا بار بار اماں کو چھیڑتے تھے۔

''ارے۔ تم تو ہمیشہ کہتی تھیں کہ بختاور میرا پیارا بچہ ہے، کنیزاں اپنے باپ کی ہے اور بختاور ماں کی ہے۔ تو آج تم کنیزاں کے لیے اتنی اداس کیوں ہو۔''

''ارے بس رہنے دو۔ ماں باپ بھی کبھی بچوں میں تفریق کرتے ہیں۔ ایک تو آپ اس طرح کی باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

سکندر بھی اسے اس طرح گھر والوں سے ملتے دیکھ کر کنارے پر کھڑا مسکرا تا رہا تھا۔ تب ہی اس نے جانے کی اجازت مانگی تھی۔

''اچھا۔ میں چلتا ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے، مجھے کچھ کام ہے۔''

''ارے بیٹا! اتنی جلدی جانے کی ضرورت کیا ہے کچھ دیر ٹھہر جاؤ، کھانا کھا پی کر چلے جانا اتنی جلدی بھی کیا ہے۔''

''ہوا کے گھوڑے پر سوار نظر آتے ہو تم تو، چپ کر کے سکون سے کھانا کھاؤ اور پھر چلے جانا۔'' ابا نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

''نہیں، میں رک جاتا مگر واقعی سچ میں مجھے کام ہے۔''

''اچھا چلو کچھ دیر رکو۔ بختاور تمہیں کھانا ساتھ کر دیتی ہے لیتے جاؤ گھر لے جانا وہاں کھا پی لینا۔''

اتنی دیر میں بختاور اور اس کا ٹفن تیار کر کے لے آئی تھی اور وہ جانے لگا تھا اور جاتے جاتے

کنیزاں سے مخاطب ہوا تھا۔

"جب گھر والوں سے تمہیں فرصت مل جائے تو ہمارے گھر بھی ضرور چکر لگانا۔ اماں کہہ رہی تھی تمہاری دعوت کریں گی۔"

بختاور نے غور سے کنیزاں کا چہرہ دیکھا تھا جو اچھا کہہ کر سر کو ہلا گئی تھی۔ اور اس کے چہرے پر سمجھ میں نہ آنے والے تاثرات تھے۔

بختاور کام میں لگ گئی تھی اور انہوں نے کھانے پینے کا انتظام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اماں نے تکیہ چارپائی پر ڈال کر اور پائنتی پر کھیس ڈال کر اسے کچھ دیر آرام کرنے کو کہا تھا۔ وہ پورے گھر پر نظر دوڑا رہی تھی۔ نیم کا وہ بوڑھا درخت جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا اب بھی وہیں کا وہیں تھا۔ ساتھ ہی دھریک کے نیچے سارے مویشی بندھے ہوئے تھے اور بختاور نے ہی فون پر اسے بتایا تھا کہ بھینس نے بچہ دیا ہے۔ وہ بچہ بھی اپنی ماں کے پاس لیٹا ہوا آنکھیں موندے غشی کی حالت میں پڑا تھا۔ جیسے ہی کوئی مکھی یا کیڑا اسے تنگ کرتا تھا تو وہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اپنی ماں کو دیکھا کرتا تھا۔ ساتھ ہی دور تک ٹیلوں کے قافلے نظر آ رہے تھے۔

بختاور نے جو نئے پودے لگائے تھے ان پر بہار آئی تھی اور جیسے ہی ہوا چلتی تھی تو خوشبو سے سارا آنگن بھر جاتا تھا۔ اماں نے سارے میں چھڑکاؤ کر دیا تھا کہ تھل واسیوں کی زندگی میں اچانک آندھیاں آتی ہیں اور آندھی آئے تو کنیزاں کو تکلیف نہ ہو۔

کچھ دیر تو وہ یوں ہی آنکھیں موندے بیٹھی رہی ابھی وہ اپنی ان سوچوں میں ہی تھی کہ دور سے کہیں کوئل کی آواز گونجی تھی۔ کوئل کو بھی شاید کوئی قرار نہیں تھا اور کوئل کی گونج کے ساتھ ہی اسے کوئی پل کے ساتھ ٹکا ہوا نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔

کنیزاں نے ایک پل کے لیے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔

بختاور چولہے میں بیٹھی گڑ والے چاولوں میں گڑ ڈال رہی تھی اور ساتھ ساتھ جیسے ہی اس نے کنیزاں کی آنکھوں کو کھلا دیکھا تھا تو وہ اس سے باتیں کرنا شروع ہو گئی تھی۔

''تم بتاؤ تمہارا سفر کیسا رہا۔''

''سفر تو بہت اچھا تھا مگر بہت طویل تھا اس سے تھکن ہوگئی ہے۔''

''ہاں، تھکن تو ہو ہی جاتی ہے انسان اتنا سفر کرے تو۔ تم تو پہلے اتنے سفر کی عادی نہیں ہو۔''

''ہاں، واقعی یہی بات ہے تب ہی مجھے لگتا ہے میں اتنی زیادہ تھک گئی ہوں۔ بس گھر میں کچھ دن آرام کروں گی تو سکون آئے گا۔''

''سیرت اور اپنی دوستوں کا سناؤ وہ سب کیسی ہیں۔''

''وہ بھی گھروں کو پہنچ گئی ہیں۔ سب ٹھیک ہیں۔ تمہیں سلام کہہ رہی تھیں ڈھیر ڈھیر اور تمہارا بہت زیادہ پوچھ رہی تھیں کہہ رہی تھیں کہ ہم جب گھروں کو پہنچ گئے تو ایک دوسرے سے ویڈیو کال پر رابطے میں رہیں گے۔''

''ہاں، اب تو ویڈیو کال آسانی سے ہو جاتی ہے کمپنی والوں نے ایک نیا ٹاور لگایا ہے تو اب سگنل آتے ہیں۔'' بختاور نے جیسے خوش ہو کر اسے خوش خبری سنائی تھی۔ وہ بھی دھیرے سے مسکرا کر رہ گئی تھی۔

''ہاں میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ شانو کی شادی ہوگئی۔ بے چاری نے بہت کوشش کی کہ اس کی شادی میں تم شامل ہو مگر یہ کہاں ممکن تھا۔ خیر، اب وہ کچھ دنوں کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ میکے آئے گی تو تم سے اس کی ملاقات ہو جائے گی۔'' اس نے دھیرے سے سر ہلایا تھا۔

''ویسے چاچا کو اس کی شادی کم عمری میں نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے کے ہی دن تھے۔''

بختاور نے ہنس کر اسے دیکھا تھا۔

''بس یہاں پہلے بھی تو اتنی عمر میں ہو جاتی ہیں، اب کون سی نئی بات ہوئی ہے کنیزاں! بس ماں جب سے فوت ہوگئی تو اب ضروری تھا کہ اسے اپنے گھر کا سکون ہو۔''

وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ بختاور کو اس نے یونیورسٹی کی کافی باتیں بتائی تھیں اور کھانا لگایا تھا۔ تینوں ابا، اماں، بختاور اور وہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے رہے۔ ساتھ ساتھ اماں بھی پوچھتی رہی تھیں۔

''وہاں کھانے میں کیا ملتا ہے۔''

''سب کچھ مل جاتا ہے اماں۔''

اسے میس ہال یاد آیا تھا اور ہر وقت میس کھانے کے بعد سیرت اور تمکین کے تبصرے کہ کہاں نمک مرچ کی مقدار کم تھی۔ اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔

''کھانا کیسا بناتے ہیں؟''

''اچھا کھانا ہوتا ہے مگر انہوں نے ایک ہی مسالا رکھا ہوا ہے جو سارے کھانے میں ڈال دیتے ہیں تو ہر کھانے کا ذائقہ ایک سا ہو جاتا ہے میں گھر کے کھانے کو بہت یاد کرتی ہوں۔'' وہ رغبت سے بونٹ پلاؤ کھا رہی تھی۔

اس کی اس بات پر بختاور کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں کہ کچھ تو تھا جو وہ بھولی نہیں تھی، ورنہ اس کی پیشانی پر گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ مل پڑنے لگتے تھے کہ شاید اس کے اندر ان ریت کے ٹیلوں سے وحشت بھرنے لگی تھی، جن پر وہ بچپن میں ساون کی بارشوں میں ریت کے گھر بنایا کرتی تھیں۔ اور کنیزاں کا گھر ہمیشہ ٹوٹ جاتا تھا کہ ریت کی مٹی بھی محبت کے لمس کو راس آتی ہے۔ بس تو ہر بار بختاور کو ہی اس کے لیے ریت گھروندا بنانا پڑتا تھا.....

مگر کب تک..... آخر کب تک..... کبھی تو زندگی آپ کو آپ کے اپنے میدان میں اتارتی ہی ہے جہاں سارا اینٹ گارا آپ کو خود استعمال کرنا ہوتا ہے وہاں کوئی مددگار نہیں ہوتا.....!

☆.....☆.....☆

حبس بھری اس دوپہر میں لاری اڈے کے ہجوم میں بھانت بھانت کے لوگوں کے درمیان جب تمکین جمال نے بس سے قدم نیچے رکھا تھا تو اس نے جمال کو پرشوق نظروں سے بس کے دروازے کی طرف دیوانہ وار تکتے ہوئے اور ہاتھوں میں ٹھنڈے جوس کا ڈبا پکڑے ہوئے پایا تھا۔ جیسے ہی وہ بس سے نیچے اتری تھی تو وہ بھاگتے ہوئے اس کی طرف آئے تھے اور انہوں نے اسے گلے لگا لیا تھا۔

تمکین نے لازمی طور پر ان کے وجود کو کانپتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

''میری تمکو بیٹی۔ میری دھی۔ میری جند۔ کیسی ہے تو۔ سفر کیسا گزرا، تو ٹھیک تو ہے نا۔'' وہ بار بار اس کے ہاتھوں کو اور اس کے کندھوں کو دباتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

تمکین جمال نے لاری اڈا کے اس رش میں موجود تمام لوگوں سے زیادہ اپنے آپ کو خوش قسمت پایا تھا۔ اس نے ابا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور ابا نے وہ ٹھنڈا جوس کا ڈبا اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔

''یہ لے بہت گرمی ہے جلدی جلدی یہ پی لے۔''

وہ اپنی بہتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے باپ کو دیکھتی رہی تھی جو اس کے لیے اس کی ماں سے کہیں بڑھ کر ثابت ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی مائیں اور طرح کی ہوتی ہیں۔ ماؤں کے خمیر کی مٹی اور ہوتی ہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اماں زندہ بھی ہوتی تو تب بھی ابا کی محبت بازی لے جاتی۔ سامنے کھڑا ہوا شخص کبھی بھی اس معاملے میں ہار نہیں سکتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ ابا کے ساتھ بازاروں میں سے گزر رہی تھی اور وہ اس کے لیے کھانے پینے کا سامان خریدنے میں لگے ہوئے تھے۔

''ابا کیا کرتے ہیں آپ۔ بہت کچھ خرید لیا اتنے سارے فروٹ، لیگ پیس بریانی، میں اتنا کچھ کیسے کھا پاؤں گی۔'' وہ بار بار انہیں روک رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا۔ میں تو کب سے سوچ رہا تھا جب تو آئے گی تو تیرے لیے اتنا کچھ خریدوں گا بس تو چپ کر کے دیکھتی جا، پہلے اپنی صحت دیکھی ہے۔''

وہ بس ہنستے ہوئے انہیں دیکھے گئی تھی جو اس کی صحت بارے فکر مند ہو گئے تھے۔ اس کے ہاتھ کو کسی بچے کی انگلی کی طرح پکڑے ہوئے ایک ایک دکان پر لا کر وہ چیزیں خرید رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے کی خریداری کے بعد لدے پھندے وہ گھر پہنچے تھے اور جیسے ہی گھر کا دروازہ تمکین جمال نے کھولا تھا تو اس کی نظر صحن میں بکھرے ہوئے خشک پتوں پر پڑی تھی۔ اسے جیسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ سارا ماضی اس کے سامنے زندہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی جائفل جاوتری اور الائچی کی وہ خوشبو اسے آج اتنی بری نہیں لگی جتنی پچھلے کئی مہینوں میں لگا کرتی تھی۔ شاید وہ اب وہاں

رہتی نہیں تھی یا اس کی زندگی میں کچھ اور مقاصد شامل ہو گئے تھے۔ وہ ابا کے ساتھ وہیں بیٹھ گئی تھی جو بار بار اس سے پوچھ رہے تھے۔

''بیٹا! تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''ابا! بہت اچھی جا رہی ہے پہلے سمسٹر کے پیپر ہو گئے ہیں، دو ہفتوں کی چھٹیاں ہیں، اس کے بعد نیا سمسٹر شروع ہو جائے گا۔''

ابا اس کے سامنے پلیٹ اور برتن رکھتے جا رہے تھے اور ساتھ چھری بھی رکھ دی تھی کہ وہ خود فروٹ کاٹ کاٹ کر کھاتی جائے۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر ابا کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے فروٹ کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ ابا کے لیے سب سے پہلے اس نے پلیٹ بنائی تھی۔

''تیری سہیلیاں کیسی ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں ابا۔ وہ اپنے اپنے گھروں کو گئی ہوئی ہیں۔''

''تیرا دل تو وہاں لگ گیا ہے نا تمکو! مجھے بڑی فکر رہتی ہے کہ پریشانی میں تو انسان سے کچھ بھی نہیں ہوتا اور تو اتنے بڑے شہر میں اکیلی چلی گئی ہے۔''

اس نے چھری کنارے پر رکھ کر ابا کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''میں نے آپ کو کہا تھا کہ آپ فکر مت کیا کریں میں اب ایسی چھوٹی بچی نہیں رہی ابا۔ پڑھائی نے میرے اندر بہت اعتماد بھر دیا ہے اب اکیلے سفر کرنے سے آنے جانے سے بھی ڈر نہیں لگتا۔''

''تعلیم تو بچیوں کو بہادر بنا دیتی ہے اور مجھے یہ دیکھ کر اچھا لگ رہا ہے کہ تو واقعی بدل گئی ہے، ایک تو تو پہلے سے زیادہ سوہنی ہو گئی ہے اور دوسرا تجھ میں بہت ادب آداب آ گیا ہے۔ میری تو نظریں تجھ سے ہٹ ہی نہیں رہیں۔''

وہ شخص ایک باپ تھا جو اپنے خون کو بڑھتا پھلتا پھولتا دیکھ کر بار بار خوش ہو رہا تھا۔ تمکین نے غور سے ابا کو کپڑوں کی طرف نظر ڈالی تھی۔ سفید لٹھے کے کپڑے پہنے ہوئے وہ جیسے اپنی بیٹی کے لیے نک سک سے تیار تھے۔ نئے جوتے پہن رکھے تھے کلف لگائی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں سرمہ بھی ڈالا ہوا

http://kitaabghar.com

تھا۔ جیسے وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے پورے اہتمام سے تیار ہوئے تھے۔ جانے کیوں یہ محبت دیکھ کر اسکا دل پگھل گیا تھا۔

''ابا! آپ تو ٹھیک ہیں کوئی مسئلہ یا پریشانی تو نہیں، پھوپھو لوگ چکر لگاتی رہتی ہیں؟''

''ارے نہیں بیٹا، مجھے کیا مسئلہ پریشانی ہوگی بھلا۔ اپنی زندگی میں مصروف ہوں، کام میں لگا رہتا ہوں، باقی کچھ چھوٹے بچے نئے رکھ لیے ہیں تو وہ مدد کو آجاتے ہیں دن گزر جاتا ہے، اور پتا بھی نہیں چلتا۔ اب یہی دیکھ لے تجھے گئے ہوئے پانچ مہینے ہونے کو آئے ہیں اور پتا بھی نہیں چلا وقت کتنی جلدی گزر رہا ہے۔''

''جی ابا، یہ تو ہے۔''

کچھ ہی دیر میں اس نے اور ابا نے کھانا کھالیا تھا اور وہ برتن لیے نلکے والی سائیڈ پر دھونے کے لیے آگئی تھی۔

''نہ کر تمکو۔ رہنے دے۔''

''ابا! میں نہیں دھوؤں گی تو کون دھوئے گا۔''

''میں دھو دیتا ہوں۔'' وہ جیسے جھینپ گئے تھے۔

''بس کر دیں ابا۔ میں آپ کی اولاد ہوں اور پہلے بھی تو یہ کام میں ہی کرتی تھی تو اب آپ پریشان مت ہوں وہاں تو میں صرف پڑھائی کرتی ہوں گھر کے کام تو ہوتے نہیں ہیں تو جب تک میں یہاں ہوں مجھے اپنی خدمت کرنے دیں۔''

''ارے بیٹی، تو تو مسافر ہے، دو ہفتوں کے لیے آئی ہے پھر چلی جائے گی تو تب تک اچھا نہیں لگتا کہ میں تجھ سے کام کرواؤں۔''

''ارے رہنے دیں اب، آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئے ہیں اور ویسے بھی میں کوئی مسافر وغیرہ نہیں ہوں گھر سے میرا جب چاہوں گی چھٹیاں ہوں گی آجاؤں گی، گھر کے کام کرنے سے کب کوئی چھوٹا پڑ جاتا ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد برتن دھونے کے بعد اور انہیں ان کی اپنی جگہوں پہ سجانے کے بعد اس نے صحن میں جھاڑو لگانا شروع کر دی تھی۔ جمال ابا کن انکھیوں سے اس گھر کو اصلی حالت میں گھر ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جب بھی وہ گھر ہوتی تھی وہ ان کے گھر کو ایسے ہی سجا سنوار کے رکھتی تھی۔ جھاڑو لگانے کے بعد خشک پتے سمیٹ کر اس نے کنارے پر رکھ دیے۔ اس کے بعد وہ اپنی لگائی ہوئی موتیے کی بیلوں کی کانٹ چھانٹ پہ لگ گئی تھی۔

''ابا! ان کو آپ برابر پانی دیتے رہتے ہیں نا۔''

''ہاں بیٹا، پانی تو دیتا رہتا ہوں لیکن موسم کی سختی کی وجہ سے ایسے ہو گئے ہیں۔''

''ہاں ابا! اس بار گرمی بھی تو بہت پڑ گئی ہے، موسم کافی بدل رہا ہے تو شاید اس وجہ سے ہی۔''

گھر کی ہر ہر چیز کو ٹھکانے پہ لگا کر ابا کے دھلے ہوئے اور بغیر دھلے کپڑے الگ کر کے وہ فارغ ہوئی تھی تو اس کے بعد ابا اور اس نے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ ابا نے محلے کے ایک گھر کے بارے میں پانچ مہینوں میں جو جو واقعات ہوئے تھے اسے بتائے تھے۔ بچپن میں بھی وہ اور ابا رات کو سونے سے پہلے صحن میں تاروں سے سجے آسمان تلے لیٹ کر جہان بھر کی باتیں کیا کرتے تھے، اب بھی ابا اسے یہی کچھ بتا رہے تھے۔

''ان کے بیٹے نے دوسری شادی کر لی ہے اور بے چارے آج کل گھر کے ماحول کی وجہ سے بڑے پریشان نہیں تو میری دکان پر آ کر دکھڑے روتے رہتے ہیں۔ ان کی دوسری بہو نے انہیں گھر سے نکال دیا ہے۔ میں نے تو یہی کہا ہے کہ میرے پاس آ جاؤ میں بھی اکیلا ہوتا ہوں مگر خوددار آدمی ہے مان ہی نہیں رہا۔''

''ارے آپ تو ان کو کہیں نا کہ وہ آپ کے پاس رہ لیں ہمارے گھر میں اتنی تو جگہ ہے آپ کا بھی دل لگا رہے گا۔''

''میں نے کہا تو ہے لیکن کہا نا خوددار بندہ ہے۔ کیا کہوں بیٹا، آج کل کے دور میں خودداری بھی بڑی چیز ہے۔''

وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی تو کوئی ڈائجسٹ لے کر اپنے چھوٹے سے گھر کے صحن میں کہانی پڑھتے ہوئے ٹہلتی رہتی تھی ساتھ ہی ایک ہاتھ میں کڑک چائے کا مگ ہوتا تھا جس سے وقفے وقفے سے وہ چسکیاں لیتی رہتی تھی۔ ابھی بھی وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے چہل قدمی کرتے ہوئے وہ پورے صحن میں ٹہل رہی تھی اور جیسے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔

زندگی وقت اتنا تیزی سے بدل جاتا ہے اور انسان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وقت نے اسے کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ شاید روز آئینے میں خود کو دیکھنے کی اتنی عادت ہو چکی ہوتی ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا کہ ہم پر کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔ وہ بھی اپنے آپ کو ان صدیوں کا اسیر ہوتا دیکھ رہی تھی۔

چند دن گھر میں گزرے تھے کہ پھپھو لوگوں نے بھی چکر لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے انواع واقسام کے کپڑے بھی لے آئی تھیں آخر کو وہ ان کا خون تھی، بھتیجی تھی۔ پھوپھو نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

''ارے تمکین! کیسی ہو؟ تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ میں نے تو کہا بھی تھا جمال کو کہ لڑکی ذات کو اتنا دور بھیجنے کی کیا ضرورت ہے مگر آفرین ہے میرے بھائی پر کہ اتنا زمانہ شناس ہے کہ اسے پتا ہے آج کل کی بچیوں کی کتنی تعلیم ضروری ہے۔ میں اپنے بچوں کی وجہ سے ابھی تک شدید پریشان ہوں۔ واقعی زمانہ بدل گیا ہے اور آج بچیوں کے لیے لڑکوں سے کئی گنا زیادہ تعلیم ضروری ہے۔''

اسے غور سے دیکھا تھا وہ دیکھ کر خوش بھی ہوئی تھیں۔ وہ کتنی سلجھی ہوئی سمجھ دار لگ رہی تھی۔ سمجھ دار اور سلجھی ہوئی تو وہ پہلے سے ہی تھی مگر اب جیسے اس میں اور نکھار آ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے پھوپھو کے سامنے چائے بنا کر رکھی تھی اور ساتھ ہی شامی کباب بھی تلے ہوئے تھے۔

پھوپھو نے شامی کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا تھا اور انہیں جیسے سواد آ گیا تھا اس کے ہاتھ کا ذائقہ آج بھی ویسے کا ویسا ہی تھا۔

''تمکین! تمہارے ہاتھ کا ذائقہ آج بھی نہیں بدلا۔''

''پھوپھو! ذائقے بھی بھلا بدلا کرتے ہیں۔'' وہ جیسے دل کھول کر ہنسی تھی۔

''واقعی جمال صحیح کہتا ہے تم اس کے لیے ہیرا ہو ہیرا۔'' پھوپھو نے اسے اپنے گھر کی باتوں میں لگا لیا تھا۔

جب وہ چھوٹی تھی تو وہ جب بھی آتی تھیں اس گھر کی خاموشی اور وحشت سے پریشان ہو کر جلدی چلی جاتی تھیں مگر گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی انسیت تمکین سے ایسی بڑھی تھی کہ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمانے بھر کی کتھا تمکین کو سنا کر ہی دم لیں۔

آج بھی وہ ایک اچھے سامع کی طرح ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے انہیں سنتی رہی تھی کہ آواز بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ان کے بھی احترام ہوتے ہیں کہ ان کو سنا جائے۔

☆.....☆.....☆

''ارے تو.....تو ہمارے جیسی ہے۔'' ریشمی نے شیشے سے ناک ٹکا کر اندر جھانکا تھا۔

تالیوں کا شور.....ٹھٹا سا بلند ہوا۔ بھڑکیلے لباس میں ملبوس اس مخنث نے فردوس کی گاڑی کے شیشے پر اپنی انگلی میں پہنے ہوئے اناری عقیق سے ٹھک ٹھک کی تھی۔ روشنیاں خاک ہو گئیں۔ سارے اجالے غرق ہو گئے تھے۔ فردوس گوہر کی سانس بند ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے چوراہے میں ننگا کر کے رکھ دیا ہو۔ جس حقیقت سے وہ نظریں چراتی رہتی تھی اور نظر بند رہی تھی آج وہی برہنہ ہو کر منہ چڑا رہی تھی۔ اسے لگا تھا وہاں موجود سب لوگوں کی لپلپاتی ہوئی زبانیں نکل آئی ہوں جو اسے نوچ لیں گی۔

اس نے جلدی سے شیشہ اوپر چڑھایا تھا مگر تالیوں کا شور کم نہ ہوا تھا بڑھتا ہی گیا تھا اور.....

اور.....زمین سے آسمان تک.....! پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے ہاتھ کپکپا گئے تھے اور سارا پانی دامن کو بھگو گیا تھا۔

باہر ہونٹ رنگ ہیجڑے نے اپنے ساتھیوں کو اشارے کر کے بلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ڈری سہمی ہوئی اسپرابلک بلک کر رو دی تھی۔

''ارے، یہ اپنے قبیلے کی ہے۔ واللہ کیا حسن ہے۔ اری، یہ تو ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائے گی۔''

تالیوں کا شور بڑھتا گیا۔ اردگرد حصار بندھنے لگا تھا۔ ٹریفک وارڈن نے اس خوب صورت لڑکی کو

گاڑی کے دروازے سے اچانک باہر نکلتے دیکھا تھا وہ مسلسل رو رہی تھی جھٹکے سے گاڑی سے نکلنے پر اس کے پاؤں کا جوتا ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ ننگے پاؤں سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ کئی گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے۔ لوگ چیخے چلائے۔ مگر وہ ایک دلچسپ تماشا تھا اور لوگ اچھے تماش بین تھے، بس دیکھتے رہے۔

فردوس گوہر نے خود کو تپتی ہوئی سڑک پر ننگے پاؤں خود کو بھاگتے ہوئے پایا تھا یہاں تک کہ سڑک کے پتھروں نے اس کے پیروں کو زخمی کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہا تڑپ تڑپ کو روئے کہ سینہ پھٹ جائے۔ ماں باپ کی محبت..... ڈاکٹر طلال کی مثبت سوچ کی ڈوز..... نتاشا ابراہیم کا ساتھ کچھ بھی کام نہیں آیا۔ وہ کل بھی اکیلی تھی وہ آج بھی اکیلی تھی۔

وہ پانچ خواجہ سرا فردوس گوہر کے پیچھے تھے۔ تالیاں پیٹتے..... دہائیاں دیتے..... اسے بس بھاگنا آتا تھا اور وہ بھاگ رہی تھی یہاں تک کہ وہ اندھے منہ پورے قد سے روڈ پر گری تھی۔ منہ میں خون بھر گیا تھا۔ ہر طرف سیاہ اندھیرا چھا گیا تھا۔ رات سے بھی گہرا۔ بدصورت اور ننگا..... جو سب کچھ ڈھانپ کر بھی عیاں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے اپنے آپ کو ریشمی کی گود میں سر رکھے ہوئے پایا تھا۔ آواز بازگشت جیسی تھی..... سیسے سی..... موت سی..... کاٹتی ہوئی..... چیرتی ہوئی۔

"ہائے اللہ..... یہ تو ہمارے قبیلے کی ہے مگر اتنا حسن..... آنکھ نہیں ٹھہرتی۔"

فردوس گوہر نے سارے حواسوں کو گم ہوتا پایا۔ یوں لگا کسی نے اس کے پیروں کو بھی گود میں رکھ لیا ہو۔ نرمی اور ملائمت سے.....

ہے جنوں افلاک میں ترے حسن سے
اس جنوں کے دم سے لحہ ابد ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

باب دہم

پری چہرے

میں ویکھاں میرا یار نہ ویکھے
میں نہ ویکھاں تے او ویکھے
ایڈے بخت میں کتھوں لیانواں
کہ میرے ویکھن دے وچ ویکھے
ماہی تیرے اندر وسدا
تینوں ایویں پین بھلیکھے
یار فریدا! بوہے یار دے مریئے
بھانویں ویکھے یا نہ ویکھے

پری چہرے ہوتے ہیں۔ دھوکے باز ہوتے ہیں۔ فریبی اور اداکار سب ہوتے ہیں مگر کچھ اس فن میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ اور فن کی دنیا کا کمال تو انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے بھلا، زمین سے اٹھا کر آسمان تک لے جاتا ہے مگر..... یہ دھوکہ بازی کا فن، فریب کا فون اسی شدت سے زمین کے حوالے کرتا ہے اور جب مٹی میں ملنا ہی حاصل ہو تو پھر کہاں کے عروج اور کہاں کے زوال بس.....!

پری چہرہ تو دنیا ہے۔ فریب میں ڈال کر مسکراتی ہے۔ اور دنیا کی مہارت حاصل ہے۔ دنیا کو تو کوئی زمین کے حوالے بھی نہیں کرتا۔ چچ..... بس ہم زمین کے ہیں۔ ہم ہی مٹی کے ہیں..... مٹی ہو جائیں گے تو پھر اس پری چہرہ دنیا کا کیا ہوگا؟

☆.....☆.....☆

''تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو۔''

فردوس گوہر کی جھٹ سے آنکھیں کھلی تھیں اور اسے پہلا احساس ہی اس اجنبی چھت کا ہوا تھا جس کے تلے وہ لیٹی ہوئی تھی۔ جیسے اسے اپنے پیروں میں ابھی بھی وہ ہلکی ہلکی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں سامنے ٹکائی تھیں جہاں ریشمی کے ساتھ تین چار اس طرح کی شخصیات براجمان تھیں۔

''پلیز۔ مجھے یہاں سے لے چلو، مجھے گھر جانا ہے۔''

ریشمی اور اس کے ساتھی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا رشک اور اپنائیت تھی جو پہلی نظر میں ہی فردوس گوہر کو محسوس ہو گئی تھی۔

ریشمی اٹھ کر چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی تھی۔ پیروں والی سائیڈ پر بیٹھ کر ہولے ہولے اس کے پیر دبانا شروع کر دیئے تھے۔

''تم پریشان مت ہو اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔''

آنکھیں کھلتے ہی اس نے اپنے آپ کو ڈبل بیڈ پر موجود پایا تھا جس پہ خوش نما پرنٹڈ پھولوں والی چادر ڈالی ہوئی تھی۔ اور وہ کریم کلر کے پینٹ سے سجا ہوا ایک خوب صورت سا کمرا تھا۔ جس کے دونوں طرف اتنا قیمتی ساز و سامان تو نہ تھا، کچھ پینٹنگ آویزاں تھیں، تین چار لیمپ پڑے تھے اور ہلکی سی مکمل روشنی تھی۔ شاید اس کمرے کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں۔ کیونکہ باہر سے وقفے وقفے سے ٹریفک کے شور، گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ایک اور چیز جو اسے نظر آ رہی تھی وہ سامنے ہی کمرے کے باہر کھلے ہوئے دروازے سے برآمدے کے اوپر روشن دان میں سے آنے والی مسلسل غٹر غوں کی آوازیں تھیں شاید وہاں پہ کبوتر رہتے تھے۔

فردوس گوہر نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

''ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم لیٹی رہو اور ہم سے ڈرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔''

اتنا نرم اور ملائمت والا لہجہ فردوس گوہر کو عجیب الجھن میں ڈال گیا تھا۔ ریشمی نے ساتھ کھڑی

ان لڑکیوں کو خشمگیں نظروں سے گھورا تھا۔

"بالڑیو! یہ کیا میرا منہ تکے جا رہی ہو۔ جلدی سے کھانے پینے کا انتظام کرو، دیکھ نہیں رہیں یہ بھوکی ہے۔"

بالڑیاں اسے پیار سے دیکھتے ہوئے باہر شاید کچن کی طرف دوڑی تھیں اور تھوڑی دیر بعد ہی کچن سے کھٹ پٹ اور برتنوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں، یوں لگتا تھا کچن قریب ہی تھا۔

ریشمی کے ساتھ وہ اس گھر کے واش روم کے دروازے تک آئی تھی اور اسے پتا چلا تین کمروں پر مشتمل ایک بڑے سے برآمدے والا کوئی اچھا سا گھر تھا جہاں یہ ایک طرف چھوٹے چھوٹے گملے رکھے ہوئے تھے اور وہاں صفائی بہت خوب تھی۔

ایک چھوٹی سی بچی شاید وہ بھی ان کے قبیلے میں سے ہی تھی یہ اسے سمجھ نہیں آیا، وہ پوچا لگانے میں مصروف تھی۔ اور تب ہی اس نے ایک چارپائی کے ساتھ ایک لڑکی کو آنکھیں بند کر کے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا تھا جس کی گود میں ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ وہ بچی شاید اسی لڑکی کی بیٹی ہوگی جو اپنی ماں کو پٹر پٹر تکے جاتی تھی۔ مگر وہ لڑکی بھی..... شاید لڑکی نہیں..... شاید وہ ان ہی کے قبیلے میں سے تھی تو پھر وہ چھوٹی بچی؟

اس لڑکی کی آنکھوں کے گرد حلقے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ صدیوں سے بھرپور نیند نہ لے سکی تھی۔ ریشمی نے اپنی پاٹ دار کراری آواز میں شاید اسی کو مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ارے چڑیا کب تک مرتی، سڑتی اور جلتی رہے گی، اب آرام کر۔ بچی اب ٹھیک ہے، اسے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تو نے تو اس کی صحت کا بارا اپنے سر لے لیا تھا۔ چپ کر کے اسے دودھ پلا، دوائی دے اور سلا دے۔"

چڑیا نامی لڑکی کی حالت پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کسی گہرے مراقبے میں ہو ک ذرا سی حالت بدلے گی تو سحر ٹوٹ جائے گا مگر پھر بھی وہ بچی کے سر کو کبھی کبھار تھپکی دے لیتی تھی لیکن چڑیا کی اپنی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ فردوس نے خود کو واش روم میں بند کر لیا تھا۔ صاف ستھرا واش روم تھا اور وہاں کے آئینے میں اس نے اپنے چہرے پہ لگے نشانوں کو دیکھا تھا۔ اس کے لمبے بال

بکھر کر رہ گئے تھے، اب اس نے اپنے سراپے پر نظریں گاڑی تھیں اور پہلی بار اسے لگا تھا کہ وہ بھی ان جیسی ہی تھی..... ویسی ہی..... شناخت کا جو معما تھا وہ حل ہو گیا تھا جیسے۔ جس سے وہ اتنے سالوں تک بھاگتی چھپتی رہی تھی آج اچانک سچ سامنے آ گیا تھا۔ شاید اس سچ نے اسے ہلکا کرنا شروع کر دیا تھا دھیرے دھیرے سے، مدوجزر کی کیفیت ٹھہرنے لگی تھی۔ اسے ایک ساتھ جیسے پھر سے کوئی اذیت یاد آئی جب وہ سڑک پر بھاگ رہی تھی اور وہ تالیاں پیٹتے ہوئے اس کے پیچھے تھے، مگر ایک چیز وہ ابھی دیکھ رہی تھی کہ ایک پل کے لیے اسے یوں محسوس ہو گیا تھا کہ جیسے وہ بھی عام انسانوں جیسے عام انسان تھے اور ان سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اس نے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے اور ایک دم سے جلتی ہوئی آنکھوں کو سکون آیا تھا۔ جیسے ہی وہ واش روم سے باہر نکلی تھی تو برآمدے میں ایک لمبی سی چارپائی پڑی تھی وہاں پہ اسے ریشمی نے بٹھا دیا تھا اور خود بھی کنارے پر بیٹھ گئی تھی۔ اب بھی وہ آوازیں لگا رہی تھی۔

''کاکیو! ارے۔ کوئی جوس لاؤ، کب سے کہہ رہی ہوں مگر یہ سنتی ہی نہیں ہیں۔'' تھوڑی دیر بعد وہ جنہیں کاکیاں کہہ کر بلایا گیا تھا نازک گلاس میں تازہ سیب کا جوس نکال کر فردوس گوہر کے سامنے لے آئی تھیں۔

فردوس کا جوس پینے کا بالکل بھی ارادہ نہیں تھا مگر ریشمی نے گلاس اسے پکڑا دیا تھا۔

''حلال کا ہے..... بے فکر رہو۔ ہم تمہیں حرام نہیں کھلائیں گے۔''

ریشمی کی اس بات پر فردوس نے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

''اپنے گھر جانا ہے، جانتی ہوں۔ تو خوش قسمت ہے کہ تمہارا گھر بھی ہے، ماں باپ بھی ہیں، رشتے بھی ہیں۔ میں تو یہ دیکھ دیکھ کر، تجھے حیران ہو کر سوچتی رہی کہ ایسے کون سے نصیبوں والے ماں باپ ہیں یا تیرے نصیب اوپر والے نے اتنے اچھے لکھے ہیں کہ جنہوں نے تجھے پالا پوسا۔ تو پڑھی لکھی بھی لگتی ہے، مجھے تو تجھ پر رشک آ رہا ہے۔ اور اچھی بات ہے تیرا اپنا آسرا تو ہے۔ بس یہی ہوتا ہے نا، ماں باپ ہی انسان کے کام آتے ہیں ورنہ دنیا تو بس.....''

ایک پل کے لیے دنیا کا نام لیتے ہوئے جیسے ریشمی کی آنکھوں میں آنسو ڈوبتے ہوئے آنے لگے تھے۔

''ہمیں دیکھو۔ان چاروں کو دیکھو.....'' وہ چاروں کچن سے نکل کر باہر آ چکی تھیں۔''ان کی ذمہ داری بھی مجھ پہ ہے۔ سارا دن لوگوں کے گھروں میں دعوتیں ڈھونڈتے، جھانکتے مانگتے ہوئے گزرتی ہے، فٹ پاتھوں پر گھسٹتے رہتے ہیں۔لوگ گالم گلوچ دیتے رہتے ہیں۔ دنیا عذاب بن چکی ہے۔تم خوش قسمت ہو کہ گھر کا کھاتی ہو، گھر کا پیتی ہو، سر کا آسرا ہے۔اور ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔زندگی اتنی آسان نہیں ہے پھر بھی مجھے خوشی ہوتی کہ تیرے ماں باپ تیرا خیال تو رکھتے ہیں۔اور تو تو اتنی سوہنی ہے کہ تجھے دیکھ کر رشک آتا ہے، دل کرتا ہے اتنی دعائیں دوں کہ جھولی کم پڑ جائے۔''

بھڑکیلے ملبوسات پہنے، ڈھیروں ڈھیر میک اپ کی تہوں میں چھپے ہوئے خدوخال کسی سستے پرفیوم کی سر درد میں مبتلا کرتی ہوئی خوشبو یہاں تک کہ شاید پورے گھر میں اگر بتیاں روشن تھیں۔ وہ ماحول آہستہ آہستہ گوہر کو نرم کرتا گیا اور وہ اپنے دل میں اچانک اتر جانے والی اس نرماہٹ سے بالکل لاعلم ہی رہی تھی۔ وہ جو اس کے دل کے اندر تھوڑی سی کدورت اور خوف باقی تھا، وہ ایک دم بالکل ہی زائل ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو پرسکون ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔

مسلسل چڑیا کی گود میں لیٹی ہوئی بچی بھی کبوتروں کی آوازوں کی طرف متوجہ تھی۔فردوس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ چڑیا کی گود میں لیٹی ہوئی بچی سے اپنی نظریں ہٹا لے مگر اس کی نظریں اس سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

ریشمی فردوس گوہر کی نظروں کا مرکز بھانپ چکی تھی اس لیے ہنستے ہوئے فردوس گوہر کو مخاطب کیا تھا۔

''دیکھ لے، یہ بھی انسانوں کی اولاد ہے، مکمل ہے لیکن کوڑے پہ ڈال گئے۔ محلے والوں میں سے کوئی بھی اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔مگر مرن جوگی چڑیا وہاں سے گزر پڑی اور جیسے ہی بچی پہ نظر پڑی تو ڈٹ گئی کہ پال کے رہے گی۔ پہلے کم ہمارے سر پر لوگوں کے گناہ ثواب کی تلوار لٹک رہی تھی اوپر سے چڑیا نے یہ کر دیا۔ خیر، ہم نے بھی یہی سوچا کہ جتنا ہم کھا رہے ہیں یہ ننھی سی جان بھی کھا لے گی۔ مکان

والے نے سارا سامان ہمارا گھر سے بے گھر کر دیا۔ یہ ایک ہفتہ پہلے ہی اس نئے محلے میں، اس گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ بچی کئی دنوں سے بخار میں پھنک رہی تھی اس کے لیے چڑیا نے اپنی جان جوکھم میں ڈالی ہوئی ہے۔ دیکھو، کیسے یہ حلقے پڑ گئے آنکھوں کے گرد۔ بچی کو لیے بیٹھی ہوتی ہے بس یہی زندگی ہے، جہاں بہت کچھ ختم ہوتا ہے وہاں بہت کچھ شروع بھی ہو جاتا ہے۔" ریشمی نے اب کے ایک ٹھنڈا ہنکارا بھرا تھا۔

"تم سناؤ۔ کون ہو۔ کیا کرتی ہو؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

اس کے نام پہ شوق سے چاروں نے اسے دیکھا تھا۔

"میرا نام فردوس گوہر ہے۔" اس نے اپنی خوب صورت آواز میں بتایا تھا اور وہ جیسے باغ باغ ہو گئی تھیں۔ بچی اتنا خوب صورت نام کبھی بھی ہم نے نہیں سنا۔" وہ چاروں اس کے آس پاس بیٹھ گئی تھیں۔ اور انہوں نے اپنی ذمہ داری لے لی تھی کہ جیسے ہی فردوس گوہر کے ہاتھ میں پکڑا جوس کا گلاس خالی ہوگا اسے دوبارہ بھر دیں گی۔ فردوس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔

"بہت شکریہ، آپ لوگوں کا۔"

"شکریہ نہیں کہتے۔ تو ہماری اپنی برادری کی ہے، اللہ تجھے ہمیشہ خوش حال رکھے۔"

روشن دانوں میں کبوتر غٹرغوں کرتے رہے۔ چڑیا بار بار اونگھتی رہی اور بچی کو تھپکتی رہی جواب ایک نیا مشغلہ ڈھونڈ چکی تھی اور بار بار گردن گھما کر فردوس کی طرف دیکھتی تھی۔ جانے کیوں اس کے پھولے پھولے گال دیکھ کر فردوس کا دل چاہا چوری سے اس کے گال تھپتھپا کر دیکھے۔ مگر یہ خواہش دل کے اندر ہی کہیں رہ گئی تھی۔

تب ہی بادل گرجے اور ساون کی بارش برس پڑی۔ ریشمی نے تڑتڑ برستی بارش کو دیکھا اور فردوس کو مخاطب کیا تھا۔

"ابھی بارش تھمے گی تو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گی۔"

فردوس بھی صورت حال کے پیش نظر خاموش رہی تھی۔ جیسے ہی اندر کہیں کمرے میں ریشمی گم ہوئی تھی۔ وہ ساری کا کیاں بالڑیاں فردوس کے گرد جھرمٹ ڈال کر بیٹھ گئی تھیں۔ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی

باتیں ہونے لگیں، بے معنی سی..... جن کے معنی ہیں ہوتے..... کوئی سرے بھی نہیں ہوتے مگر وہ کرنا ضروری ہوتی ہیں کہ.....!

''بھائی نے چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دیا، تین دن میں دروازے کے باہر بیٹھی رہی۔ چوتھے دن اتنا مارا کہ وہ چوکھٹ چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔'' وہ کمزور سی جان اب بھی ماضی کے کسی المناک ناسٹلجیا میں غائب ہوگئی تھی۔ ''پہلے انگلی توڑی، پھر بھنویں کاٹ دیں، کہ میں خاندان کے لیے دھبا ہوں۔ محلے کے سارے لڑکوں نے کوئلے سے منہ پر کالک مل کر نہر میں دھکا دے دیا، مشکل سے جان بچائی اور آج یہاں ہوں۔''

فردوس گوہر سکتے میں تھی۔ صدیوں کے بادل تھے، مدتوں کا رونا تھا۔ اس کا دل پارہ پارہ ہوگیا۔ کبوتروں کی غٹرغوں بجلیوں کی گرج میں بند ہوگئی تھی کہیں..... تب ہی ان بالڑیوں میں سے سب چھوٹی بالڑی نے فردوس گوہر کے کان میں سرگوشی کر کے پوچھا تھا۔

''میں آپ کے لمبے بالوں کی چوٹی کر دوں؟''

فردوس گوہر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے آنسوؤں پر قابو بھی نہ پا سکی تھی۔

☆.....☆.....☆

سرسراتی ہوئی رات میں وہ دونوں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔

''سکندر کی طرف سے تمہاری تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی کی بات کی جا رہی ہے۔'' بختاور نے اندھیرے میں اپنی بات کے جواب میں کنیزاں کے چہرے کے تاثرات کھوجنے کی کوشش کی تھی۔

''کیا اتنا آسان ہوتا ہے کسی دوسرے انسان کی زندگی کا فیصلہ کرنا؟'' اس کے زہر خند لہجے نے بختاور کو کچھ دیر کے لیے خاموش سا کر دیا تھا۔

''کبھی نہ کبھی شادی تو کرنی ہی ہے اور تم نے اس کے بعد بھی کوئی پڑھائی کرنی ہے کیا؟''

جانے کنیزاں نے کون سی خوشبو لگائی ہوئی تھی جو سارے میں ہولے سے پھیل گئی تھی۔ بختاور نے ایک گہری سانس لی تھی۔ وہ بے چاری تو پچھلے ایک سال سے وہ خوشبو کی بوتل استعمال کر رہی تھی جو

ابا کے ایک دوست سعودیہ سے لائے تھے جس کی خوشبو سے اماں کے سر میں درد ہو جاتا تھا۔

''ارے بختاور! پرے ہو، یہ کیا مردوں والی خوشبو لگا کر آ گئی ہو۔''

''اماں! اتنی اچھی تو ہے۔'' وہ روہانسی ہو جاتی تھی کہ اسے خوشبو بہت پسند تھی، جو بھی ہو..... جیسی بھی ہو بس خوشبو ہو کہ مہکار پھیل جائے۔

''ارے۔ قسم سے اس خوشبو سے تو سر درد ہو جاتا ہے۔ اس سے اچھا ہے چنبیلی کے پھول کانوں کے پیچھے اڑس لے۔''

اماں سو چکی تھیں اور ابا بھی ان سے ذرا دور مویشیوں کے پاس چارپائی ڈال کر سوئے ہوئے تھے جبکہ وہ دونوں ابھی بھی گفتگو میں مگن تھیں کہ ان کی آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔

''اب تو اس نے اپنا گھر اتنا اچھا بنا لیا ہے کنیزاں، بالکل شہری گھر ہے۔ ہر کوئی جا کر دیکھ آیا ہے، تو بھی کل جا کر دیکھ لینا۔ ویسے بھی کل ہم سب نے ان کے گھر دعوت پر جانا تو ہے ہی۔''

بختاور نے جیسے اسے گھر کی تعمیر کا لالچ دیا تھا مگر وہ اس کی بات پر ہاں ہوں کرتے ہوئی آسمان پر تاروں کا جال دیکھ رہی تھی۔

''لاہور کا آسمان دھندلا ہوتا ہے، وہاں کبھی ایسے تارے نظر آتے ہی نہیں۔''

''تو تم یہاں سے آنکھوں میں بھر کر لے جاؤ ناں۔''

''میری آنکھوں میں تو ریت کے ٹیلے ہیں۔'' زبان کمبخت پھسل گئی تھی، پھر سے سارا جہاں آدم ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، سانس میں اچانک ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔

''بختاور پانی دینا۔''

بختاور گھڑونچی سے پانی بھرنے گئی تھی۔ کنیزاں ک وہ پھر سے یاد آ گیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اگر وہ ملا تو وہ خوب بے عزتی کرے گی اس کی کہ راستوں میں بے شک آ جایا کرے مگر خیالوں پر قبضہ نہ کرے۔

''یہ لو پانی۔ وہاں کے اور یہاں کے پانی میں بھی زمین آسمان کا فرق ہو گا۔ میں تو اتنا حیران

ہوئی جب تم نے بتایا کہ وہاں سے پینے کا پانی بھی خریدنا پڑتا ہے، یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی!'' وہ اب بھی شیشے کے گلاس میں پانی بھر لائی تھی۔

''بختاور! کیا ضرورت تھی تم ہر بار مجھے شیشے کے گلاس میں پانی پکڑا دیتی ہو۔ میں وہی کنیزاں ہوں پہلے والی، بدل تھوڑی گئی ہوں۔''

چاند اچانک ساری باڑیں توڑ کر آسمان کے وسط میں آیا تھا۔ بختاور نے سامنے بیٹھی تھل واسی کو دیکھا تھا جو ابھی بھی اس بات پر مصر تھی کہ کچھ بھی نہیں بدلا..... سب کچھ پہلے جیسا ہے۔ لان کے بڑے بڑے پھولوں والے دوپٹے کو کندھے پر ڈالے، کیچر سے سیدھے بالوں کو جکڑے ہوئے اور سفید ہاتھوں کے ناخن کے ساتھ وہ کہاں پرانی کنیزاں رہی تھی۔ پھر اوپر سے اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی وہ دھیمی دھیمی سی خوشبو بختاور کو بار بار متوجہ کرتی تھی۔

''ابا نے کہا تھا.....'' وہ پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے ایک پل کو رکی تھی۔

''ابا نے کیا کہا تھا؟''

''یہی کہ تمہارا پہلے سے زیادہ خیال رکھوں، اب تم پردیسی ہو۔''

لفظ پردیسی کتنا پرایا ہوتا ہے ایک پل کو دل بیٹھ جاتا ہے۔ سفر خیال میں دوڑنے لگتا ہے کہ دوڑتے بھاگتے رہیں گے اور منزل کوئی بھی سامنے نہیں ہوگی۔

''ابا بھی نا بس.....'' وہ ہولے سے مسکرا کر پھر سے لیٹ گئی تھی۔ آنکھیں نیند سے بھاری ہونے لگی تھیں۔ بختاور نے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھ دیا تھا۔ کنیزاں نے نیند میں گم ہونے سے پہلے بختاور کا وہ سوال سنا تھا۔

''تمہارے سینٹ کی خوشبو بہت پیاری ہے، یہ تم نے کہاں سے لیا تھا؟''

☆.....☆.....☆

کھانے کی میز پر مسلسل برتنوں کا شور تھا وہ بھی مکمل اطمینان کے ساتھ اپنے سامنے رکھی پلیٹ خالی کرنے کے بعد اب چائے کا کپ لے کر لاؤنج میں آ گئی تھی۔ لاؤنج کی لمبی کھڑکی سے باہر لان کا

http://kitaabghar.com

منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

''تمہاری واپسی کب ہے؟''

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ کبھی سکون سے بیٹھی ہو اور آیت اس کا سکون سلامت رہنے دے۔

''تمہیں کیوں میری واپسی کی فکر ہے اتنی؟'' چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے آیت کو خشمگیں نظروں سے گھورا تھا۔

''ویسے پوچھ رہی ہوں۔'' وہ کندھے اچکا گئی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہیں طاہر کیسا لگا؟''

سیرت کو پتا تھا کہ اس سوال میں آیت کی جان تھی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ پوپلی بوا نے کچن سے نکل کر باہر خصوصی طور پر جھانکا تھا۔ اس گھر کے مکینوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا ہنستے ہنستے رو بھی پڑتے تھے..... شاید اسی خدشے کے تحت باہر دیکھنے کو آئی تھیں۔

''تم کیوں مجھ سے پوچھ رہی ہو تمہارے لیے میری رائے کون سا اہمیت رکھتی ہے۔''

''تم اگر اپنے اندر کا زہر ختم کر دو تو ہم دونوں میں سب ٹھیک ہوسکتا ہے۔'' آیت نے جیسے اسے سنایا تھا۔

وہ شیشے کے باہر پیڑوں پر منڈلاتے بھنوروں کو دیکھ رہی تھی، اس کی بات پر زخمی نظروں سے مڑ کر دیکھنے لگی تھی۔

''زہر میرے اندر ہے؟''

وہ سوال وہیں رہ گیا تھا جب پوپلی بوا جوس کا گلاس لیے آ گئی تھیں۔

''تم سے کہا بھی تھا کہ صبح صبح جوس پینا مگر تم چائے لے کر بیٹھ گئیں۔'' وہ خفا خفا سی نظر آنے لگیں۔

''بس بوا! یہ تمکین اور کنیزاں نے مجھے چائے کی عادت ڈال دی ہے۔ اوپر سے روز مفت میں کوئی اگلا بنا کر پلا رہا ہو تو انکار نہیں بنتا ناں۔''

''اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ چلو اب چائے پی لو پھر کچھ دیر تک جوس لازمی پی لینا۔'' وہ واپس

مڑ گئی تھیں تو ابھی بھی آیت منتظر نظروں سے اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''کون سا سوال؟'' مسرت صاف مکر گئی تھی۔ چائے کے کپ کے کنارے اب ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔

''کہ تمہیں طاہر کیسا لگا؟'' آیت امتیاز نے جانے ضبط کی کتنی حدیں پار کر لی تھیں۔

''بالکل تمہارے جیسا ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح ایک جملے میں ساری کہانی ختم کر کے رکھ دیتی تھی۔ ایک ایسا اوپن اینڈ ہوتا تھا جس کا اختتام آیت کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا کہ چلو جیسے چاہو سوچ لو.....

☆.....☆.....☆

گوریا جنیز کی روشنیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے جانے کیوں خلیل کو عدن سے وہ سوال کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

''وہ تمہارا دوست فردوس تو لاہور سے ہے ناں۔''

وہ مکمل طور پر اپنی کافی کے جھاگ کی طرف متوجہ تھی۔ اسے بہت دلچسپ لگتا تھا کافی کے جھاگ کو دیکھنا اور پھر دھیرے دھیرے گم ہو جانا۔

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ویسے ہی خیال آیا تو پوچھ لیا۔'' وہ جانتا تھا کہ عدن جبار کی فطرت الگ تھی۔ وہ اپنی چیزوں اور رشتوں کے معاملے میں انتہا کی حد تک پوزیسیو تھی۔

''وہ تو لاہور سے ہی ہے باقی تمکین اور سیرت دوسرے شہروں سے ہیں۔ ویسے میں آج ہی سوچ رہی تھی کہ تم اور میں فردوس سے مل آتے ہیں۔''

خلیل کو وہ لڑکی یاد آئی تھی جو آنکھوں میں زمانے بھر کا حزن لے کر پھرا کرتی تھی۔ جسے اس نے آرٹسٹ کہا تھا تو وہ کتنے زخمی انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

''مام کیسی ہیں؟'' وہ گفتگو کا رخ ہولے سے موڑ گیا تھا۔

جینز کے اوپر ٹاپ پہنے اور گول ائیر رنگ میں نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگتی ہوئی عدن جبار کو احساس تک نہ ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے۔اب سنبھل گئی ہیں کہ انہوں نے اب ڈیڈ کو بالکل کنارے کر دیا ہے۔اپنے گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی ہیں۔'' عدن جبار کو اپنی مام میں واضح تبدیلیاں نظر آئی تھیں۔

''مام! آپ کیوں اتنی بدل گئی ہیں۔''

نیل پینٹ کی شیشیاں سامنے پڑی تھیں جو وہ چیک کرنے کے ساتھ ساتھ الگ رکھتی جا رہی تھی کہ اپنا پسندیدہ رنگ ہی ڈھونڈنا مشکل ہو گیا تھا۔

''کب تک بھاگتی کب تک تھکاتی خود کو؟ سارے نقصان ہی مجھے پہنچ رہے تھے۔رشتے بھی کھونٹے سے بندھے ہوتے ہیں۔مگر انہیں آزادیاں ہوتی ہیں کہ جب چاہا کنارے پر ہو گئے۔اور مجھے کناروں پر کھڑے ہونے کی عادت نہیں عدن۔''

وہ اپنے رنگ کی تلاش بھول گئی تھی۔وہ اپنی ماں کے چہرے پر اپنا پسندیدہ رنگ پھیلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

''سوچتی ہوں کہ زندگی سفر ہی تو ہے۔منزل سب کی ایک ہے جہاں سب نے چلے جانا ہے۔بس دنیا تو مدت کی جگہ ہے کہ تمام ہوئی اور چل دیئے۔جہاں ماں باپ جیسے رشتے بھی اپنے اعمال کے ساتھ الگ کھڑے ہوں گے وہاں میں نے بھی اکیلے ہی کٹہرے میں کھڑا ہونا ہے۔اور رہی بات جبار صاحب کی تو دیکھنا منزل پر پہنچ کر بھی میری طرف سے ہی دیکھیں گے تو میں کیوں کم ظرفی کے پیمانے لے کر بیٹھی رہوں۔دکھ تو فقط اس بات کا ہے کہ میں نے ایک رشتے کی خاطر خود کو دنیا کے رنگ میں رنگنا چاہا کہ رشتہ بچالوں،مگر دیکھ لو عدن۔کیا کچھ،کتنا کچھ باقی بچا ہے؟''

وہ ملکوں کی حویلی میں بھاگنے دوڑنے والی عورت شہر میں آ کر کتنے وار سہتی رہی تھی۔

عدن کا دم گھٹنے لگا تھا۔وہ بھی تو ہر چیز کو اپنی دسترس میں رکھنے کی عادی تھی اور اب زرد روشنی کے بلب کے نیچے بیٹھا ہوا شخص جو اس کے لیے سارے رشتے سے کہیں زیادہ قیمتی تھا۔

وہ اپنی آنکھیں خلیل پر لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ مسلسل نظروں کی حرارت سے وہ بے چارہ پزل ہو گیا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں عدن؟''

''تم سے محبت۔'' نظروں کی حدت بڑھتی جا رہی تھی۔

''وہ تو مجھے پتا ہے۔'' وہ دلکش انداز میں مسکرایا تھا۔

''میں تمہاری تصویریں زوم کر کر کے دیکھتی رہتی ہوں۔ تمہاری آنکھیں، تمہاری پلکیں بھی، تمہارے ہونٹ کا ننھا سا تل بھی جو شاید ابھی تک تمہیں بھی نظر نہ آیا ہو۔ محبت ارتکاز سکھا دیتی ہے، نظر ہٹتی ہی نہیں۔''

خلیل کو اپنا آپ مہینوال کے جیسا لگا تھا کیونکہ سامنے سوہنی بیٹھی تھی۔

''کیا جذبہ ہے کہ ساری کائنات کا سکون ایک انسان کے اندر جمع ہوتا ہے کہ وہ سامنے ہے تو سب ٹھیک ہے، وہ اوجھل تو سب پرے۔''

گلوریار کے شیشوں پر دھوئیں کے بادلوں سے نمی پھیل گئی تھی۔ چاکلیٹ پگھلنے کی خوشبو چکرا رہی تھی۔ خلیل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کتنا اہم اور ضروری ہوں۔ یہ بھی علم ہے کہ میرے معاملے میں تم بہت پوزیسیو ہو بس اتنا کہوں گا زندگی میں کبھی بھی اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو مجھے صفائی کا موقع ضرور دینا۔''

عدن جبار کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

کیفے نے جلد اس موقع کے آنے کی بو پالی تھی جس سے وہ دونوں ہی انجان تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ دور ریت کے ٹیلوں سے ہٹ کر نظر آتے اس زیر تعمیر گھر کی اونچائی سے عجیب خوف میں مبتلا ہوئی تھی۔

وہ گھر دور سے ہی توجہ کھینچتا ہوا نظر آتا تھا۔ مکمل شہری طرز تعمیر سے آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچتا ہوا

http://kitaabghar.com

گھر، جسے پہلی نظر میں دیکھ کر ہی یہی خیال آتا تھا کہ بنانے والے نے کس محنت اور محبت سے ان بنیادوں کو سینچا ہوگا۔

وہ بے اختیاری میں ہی بختاور کا ہاتھ تھام گئی تھی، کہ کچے راستوں پر چلنے کا طریقہ بھولنے لگا تھا۔ اس کی حالت سے بالکل انجان بختاور اپنی باتوں میں لگی ہوئی تھی۔

''سکندر نے شہر سے سارا نقشہ بنوایا ہے اور بنانے والے مستری بھی شہر سے آئے تھے۔ وہ خود بے چارہ اتنی گرمی میں سارا سارا دن اور رات کو بھی خود کام میں لگا رہا۔ کہہ رہا تھا کہ کنیزاں کے شایان شان گھر بنائے گا جیسے شہروں میں ہوتے ہیں، بالکل ویسا ہی۔ ابھی تو چمکتی ہوئی چپس بھی لگے گی اور بہت سارا کام باقی ہے۔''

کاش کوئی بختاور کو خبر کرے کہ وہ اپنی باتوں کی سختی سے کنیزاں کو مٹی میں دفن کرتی جا رہی ہے۔ وہ اونچی عمارت جو اپنی شکل وصورت کچھ دنوں تک نکال دے گی اور گھر ہو جائے گی، جہاں کچھ دنوں تک کنیزاں کو بند کر دیا جائے گا اور گھٹن سے اسکی سانسیں بند ہو جائیں گی۔

وہ دروازے پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔

کاٹن کے کڑکڑاتے ہوئے سفید سوٹ میں ملبوس اور پیروں میں پشاوری چپل پہنے ہوئے جیسے آنکھیں اور دل رستے پر رکھ دے گا۔

''بھئی، تم لوگوں نے تو بہت دیر کر دی۔'' وہ جیسے شکوہ کر رہا تھا۔

''اتنی بھی دیر نہیں ہوئی سکندر..... ویسے بھی اس دعوت کا کیا فائدہ جہاں کھانا پکانا بھی ہم نے خود کرنا ہے۔''

بختاور نے بے چاروں والی شکل بنالی تھی۔ یہ تو ہمیشہ سے طے تھا کہ چچی کی طبیعت خراب رہتی تھی تو جب بھی کوئی دعوت ہوتی تھی تو تب بختاور کی ہی خدمات لی جاتی تھیں اور آج بھی بختاور نے ہی سب کچھ کرنا تھا تو وہ ان دونوں کو پیچھے چھوڑ کر دروازہ پار کر گئی تھی۔

''کیسی ہو تم؟''

آنکھوں میں کاجل بھر کر، لمبے گیلے بالوں کو کھلا چھوڑ کر، کاسنی دوپٹا اوڑھے وہ سکندر کو کوئی مغل دور کی شہزادی ہی لگ رہی تھی۔

''ٹھیک ہوں۔تم کیسے ہو؟'' اسے بختاور پر جی بھر کر تاؤ آیا تھا جو اسے وہیں چھوڑ کر اندر بھاگ گئی تھی۔

سکندر نے اشارہ کیا تو وہ اندر کی طرف بڑھی تھی۔ساتھ ہی ساتھ وہ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے۔

''کیسا لگ رہا ہوں؟''

سامنے ہی کھلا صحن تھا جہاں پکی اینٹیں لگی ہوئی تھیں اور دیواروں پر انگوروں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں وہاں سب کچھ بدل گیا تھا۔مہندی کے پودوں کی باڑیں لگی ہوئی تھیں ساتھ ہی چمپا چھب دکھلا رہے تھے۔گیندے کا زرد رنگ دھوپ میں دہکنے لگا تھا۔

وہ سارے پر نظر ڈالتی ہوئی اس کے سوال پر چونک گئی تھی تو پلٹ کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے کی زحمت کر لی تھی۔

''میری یونیورسٹی میں پڑھتے تو بہت سی شہری لڑکیاں تم پر مر چکی ہوتیں۔''

گھنی مونچھوں تلے اس کے ہونٹ مسکرائے تھے۔

''مجھے شہری تعلق راس نہیں آتے، مجھ پر میرا تھل کافی ہے۔''

وہ ٹھٹک گئی تھی۔

''اور اگر تھل کو تم کافی نہ ہوئے تو؟''

وہ بالکل سیدھ میں آ گیا تھا یوں کہ کوئی چارہ نہ رہا۔

''میں تھل سے دستبردار ہو جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

کنیزاں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی کہ وہ ایسا تو نہیں تھا کہ کنارے پر ہو جائے۔اتنی آسانی سے.....!

وہ چچی سے ملی تھی تو انہوں نے بھی محبت سے اسے خود سے لپٹا لیا تھا، چچی جن سے اس کا پھپھو کا رشتہ بھی تھا۔

''کب سے سکندر سے کہہ رہی تھی کہ بچیوں کو لے آؤ۔ کچھ تو گھر میں رونق ہو۔ بس قرآن پڑھنے والے بچے آجاتے ہیں تو وہی سارے کام کر جاتے ہیں ورنہ مجھ سے کہاں کچھ ہوتا ہے، اوپر سے اس نے گھر کا بکھیڑا کرلیا ہے۔''

وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ جب وہ ٹرے میں گلاس رکھے ہوئے اندر آیا تھا۔ سب سے پہلے اسے کولڈ ڈرنک کا گلاس پیش کیا گیا تھا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

''بدتمیز۔''

وہ چونک کر مڑا تھا۔

''تم نے مجھے کچھ کہا؟''

''نہیں۔'' وہ صاف مکرتے ہوئے کچن کی طرف آگئی تھی جہاں سلنڈر پر پتیلے چڑھائے بختاور مٹن پکا رہی تھی۔

''قسم سے کچھ پکانے کا سکندر کے گھر میں ہی مزا آتا ہے۔ گھر میں تو اپلوں کے دھوئیں سے میری آنکھیں نکل جاتی ہیں۔''

وہ سر ہلا کر کچن کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر دیکھنے لگی تھی۔ چند بچے ٹریکٹر ٹرالیوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ تین چار عورتیں کھگل کے سوکھے تنوں کو ڈھو رہی تھیں کہ وہ ایندھن کے کام آتے تھے۔

''تمہاری اور کتنی چھٹیاں رہ گئی ہیں؟'' آنچ کم کرتے ہوئے بختاور نے پوچھا تھا۔

''شاید سات یا آٹھ۔'' وہ خود دور ریت کے ٹیلوں کے منظر میں کھوئی ہوئی تھی جہاں سے اونٹوں کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔

''پھر کب آؤ گی؟''

''شاید عید پر ہی۔''

تبھی وہ دروازے میں آن رکا تھا۔ ''اب تک انتظار کون کرے عید تو بہت دور ہے ابھی۔''

کنیزاں نے پیچھے مڑنا بالکل بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''میں تو سوچ رہا ہوں کہ لاہور کا ایک چکر لگا ہی لوں۔'' وہ سارے طریقے جانتا تھا کہ کیسے اس کا سکون غارت کر سکے۔

''تمہارا کیا کام ہے لاہور میں؟''

''تو کیا لاہور صرف تمہارا ہے؟'' وہ بھی آگے سے سکندر تھا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں شہر راس نہیں آتے۔''

''میرا خیال غلط بھی تو ہو سکتا ہے ناں۔''

وہ طیش میں آ گئی تھی۔ وہ بھلا کیا سمجھتا تھا خود کو۔

''میں تمہاری جان لے لوں گی۔''

بختاور نے ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر چاولوں کو دھونا ضروری سمجھا تھا اور نل کی طرف چلی گئی تھی۔

''جان تو تم پہلے ہی لے چکی ہو۔'' وہ جذبوں کی شدت سے چور لہجہ کنیزاں کو ڈھا سا گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ وہ کمزور پڑ گئی تھی۔

''بس کر دو سکندر۔ اللہ کے واسطے بس کر دو، میں اتنی مضبوط نہیں ہوں۔''

وہ ہکا بکا کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔ کاسنی دوپٹا سر سے اتر گیا تھا۔ لمبے بال پشت پر لرز رہے تھے اور سارے وجود پر کپکپی سی طاری تھی۔ کنیزاں فاطمہ کی اس حالت نے سکندر کے اندر کسی خوف کو زندہ کر دیا تھا۔ ابھی تو کچھ مہینے ہی ہوئے تھے اور.....اور.....!

وہ ہولے سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا تھا تو وہ بھی بختاور کی طرح کنیزاں کے وجود سے اٹھتی ہوئی سینٹ کی خوشبو سے متاثر ہوا تھا۔

''میں واقعی تھل چھوڑ دوں گا کنیزاں، اتنا حوصلہ ہے مجھ میں۔''

☆.....☆.....☆

''کیک کیسا بنا ہے؟''

نیلم نے اپنی محنت مکمل ہونے کے بعد ان سب کے سامنے اپنا کیک چکھنے کے لیے پیش کیا تھا اور سب سے پہلے اس نے نتاشا کی طرف دیکھا تھا۔ نتاشا کی نظروں میں ایک دم سے ستائش اتر آئی تھی۔

''یار! لگ ہی نہیں رہا کہ یہ تم نے گھر پہ بنایا ہے۔ یوں لگتا ہے میں لاہور کی کسی مشہور بیکری کا کھا رہی ہوں۔ یہ تم نے کیسے بنالیا اتنا پرفیکٹ۔''

نیلم کے اندر سکون اترنا شروع ہو چکا تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کوئی بھی تخلیق کی چھوٹی سی بھی قسم ہو انسان کو وہ ذاتی سکون عطا کرتی ہے جو دنیا کے کسی بھی کونے میں میسر نہیں ہوتا۔

''میں تو ہمیشہ سے یہی سمجھتی تھی کہ میرے علاوہ کوئی اور اچھا کیک بنا ہی نہیں سکتا تھا مگر تم نے تو مجھے بھی پیچھے چھوڑ دیا۔''

ماہی باجی بھی کھانے کے بعد اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوئی تھیں۔ نیلم کو یوں لگا تھا جیسے اس کی محنت وصول ہوگئی ہے۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ بادلوں کے گرجنے کی آواز نے چونکا دیا تھا۔

''یہ دیکھو، اب ساون کی بارش شروع ہوئی ہے۔''

وہیں بیٹھے بیٹھے بالکل پندرہ منٹ میں ہی بارش برسنا شروع ہوئی تھی اور ہر طرف جل تھل ہو ہو کے رہ گیا تھا اور ماں کو ہول اٹھنے شروع ہو گئے تھے کیونکہ آج ہی ماہی کو دیکھنے رشتے والے آرہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صبح سے نیلم کچن میں لگی ہوئی تھی، ماہی باجی بھی تیار ہو کر بیٹھ گئی تھیں اور نتاشا بھی گھر کے ادھر ادھر کے کام نمٹا رہی تھی مگر اب اندرون لاہور کی ساری گلیاں بارش کی وجہ سے جل تھل ہو گئی تھیں۔

نکاسی آب کا صحیح بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے پوری گلیوں میں پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔ ہر طرف کیچڑ ہو جاتا جس سے بچ بچا کر نکلنا بہت مشکل تھا۔

موسم کی شدت کی وجہ سے نیلم پر بھی ایک طرح سے اوس پڑ گئی تھی کیونکہ صبح سے ہی وہ کھانے پکانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ نتاشا بھی صفائیوں میں لگی ہوئی تھی اور ماہی باجی نے اپنے ہاتھوں کی لکیریوں کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔ شاید زندگی نے ان کے لیے کوئی ایسا حصہ رکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک

بار پھر سے خود کو نا امیدی کے کنویں میں گرنے سے روکنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔

''اماں! یہ ساون کی بارش ہے بھلا اتنی جلدی کہاں رکے گی۔''

اماں بھی کھڑکی کھول کر باہر کا نظارہ کرنے لگی تھیں جہاں چھتیں دور دور تک پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

ابھی وہ انہی باتوں میں مشغول تھے کہ دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی تھی۔ نتاشا نے جیسے ہی دروازہ کھولا تھا تو سامنے خاتون اسے مکمل طور پر بھیگی ہوئی نظر آئی تھیں اور ان ہی خاتون کے پیچھے وہ لڑکا بھی نظر آیا تھا جو پانی سے شرابور تھا اور اس کے سارے وجود سے پانی ٹپک رہا تھا۔

''یہی شائستہ کا گھر ہے ناں؟'' خاتون نے دروازے کے اندر قدم رکھ کر نتاشا سے استفسار کیا تھا۔ وہ بس سر کو ہی ہلا سکی تھی۔ لڑکے نے بھی جھکتے ہوئے اندر قدم رکھا تھا۔ اماں کمرے سے لپک کر باہر آئی تھیں۔ دونوں خوب گلے لگیں۔

''ارے! یہ دیکھ لو شائستہ، تم تک پہنچتے پہنچتے یہ حال ہو گیا ہے جیسے لگتا ہے راوی کا منہ ہی ادھر کر دیا گیا ہے۔ پورا لاہور ڈوبنے کو تیار ہے۔ ایک تو ساون کی بارشوں نے اس بار زحمت ہی مچائی ہے بس۔''

اماں نے آگے بڑھ کر موصوف کی پیشانی چومی تھی، وہ لڑکا بھی جیسے شرما سا گیا تھا۔ اماں انہیں اندر کی طرف لائی تھیں۔

''لڑکیو! کوئی تولیہ لاؤ بھائی کے لیے، دیکھو پورا پانی میں بھیگا ہوا ہے۔''

بھائی صاحب ابھی بھی جیسے وہیں نچڑے ہوئے کھڑے تھے اور اماں کو لڑکیوں کی سستی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ نیلم چائے بنانے کے لیے اپنے مرضی کے کام کچن کی طرف بھاگی تھی۔ ماہی کو ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں تب ہی اماں نے انہیں کہا تھا۔

''ارے، کوئی اپنے ابا کے سوکھے کپڑے لاؤ اور بھائی کو پہناؤ۔''

نتاشا ابا کا سب سے بہترین سوٹ استری کر کے لائی تھی اور جمال کو باتھ روم کا دروازہ دکھایا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آیا تھا تو ڈھیلے ڈھیلے کپڑوں میں اب اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا تھا۔

دونوں مائیں اپنی داستان امیر حمزہ میں مگن تھیں اور جمال اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ارے بہن مت پوچھو، کیسے ہم وہاں سے گھر سے نکلے۔ ہمیں کیا پتا تھا ساون کی بارش کا جب اس کا دل چاہتا ہے برس پڑتی ہے، کوئی اس کا وقت معمول تو ہے نہیں۔ صبح سے ہم دونوں بھی ماں بیٹا تیاریوں میں لگے ہوئے تھے کہ راحت آپا نے کہا تھا کہ شائستہ کے گھر ٹائم سے پہنچ جانا۔ بس اس کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دیر سے اکیڈمی سے آتا ہے، بچوں کو پڑھاتا ہے تو اس وجہ سے ذرا معاملات خراب چل رہے تھے، تو ہم نے یہی سوچا کہ چلو تھوڑی دیر گزر گئی تو چلیں گے۔ اس کے آنے تک میں تیار ہو کے بیٹھی رہی۔ جب تک یہ آیا ہم دونوں نکلے تو اتنی بارش ہوتی کہ اس نے تو یہی کہا کہ ''پھر کسی اچھے موسم میں چلیں گے۔'' میں نے یہ کہا کہ نہیں بیٹا، لڑکی والوں کو بڑا انتظار ہوتا ہے اور وعدہ کر کے مکرنے کے حق میں، میں نہیں ہوں، کل کو نصیب ہوا نہ ہوا رشتہ ہوتا ہے نیت ہے۔ لیکن وعدے سے مکرنا نہیں چاہیے۔''

ماہین ابراہیم نے کھڑکی کھول دی تھی، ہلکی بارش کی جھڑپ اندر کو دی تھی۔ امید کا بوٹا جیسے پھر سے ہرا ہونے لگا تھا۔ نیلم گرما گرم چائے اور لوازمات لے کر پہنچ گئی تھی۔

''ارے یہ کون سی والی ہے؟''

''یہ نیلم سے چھوٹی بیٹی میری اور یہ نتاشا۔''

''اچھا اچھا کیا کرتی ہیں۔''

''بس یہ ایک جگہ نوکری کرتی ہے اور یہ میک اپ وغیرہ کا کام کر لیتی ہے۔ اور نیلم اچھی پڑھ رہی ہے۔'' اماں نے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

''ارے۔ اس کو بھی تو بلاؤ..... ماہین نظر انہیں آ رہی۔''

''بس وہ بھی آ ہی رہی ہے۔''

تھوڑی دیر بعد جب ماہین نے دونوں بہنوں کے ساتھ اندر قدم رکھا تھا تو جمال بے ساختہ طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں اسے آنے والی اس ہستی کے لیے احترام ابھی سے دل میں جاگتا ہوا محسوس ہوا تھا جس سے ابھی رشتے کی بات بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ بارش کے پانی میں بھیگتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

''بیٹھ جاؤ، تم کیوں کھڑے ہو گئے ہو؟''

ماہی بھی ایک جگہ سکون سے ٹک گئی تھیں اور انہوں نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا تھا جو کہ چائے کی پیالی کا سپ لیتا ہوا بالکل ان کی نظروں کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم سے گڑبڑا گئی تھیں اور انہوں نے نظریں اپنی گود میں رکھی انگلیوں پر جما دی تھیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں چٹخنے لگی تھیں۔

جمال کی اماں نے چائے کا ایک کپ بنا کر ماہین کو بھی پکڑا دیا تھا جو انہیں نا چاہتے ہوئے بھی تھامنا پڑا تھا۔

جمال نے اسے بھی چائے پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ سوبر اور گریس فل پرسنیلٹی کی مالک سامنے بیٹھی شخصیت اسے ایک پل میں جانے کیوں اچھی لگی تھی۔

''کیا کرتی ہیں آپ؟'' وہ تھوڑا آگے ہو کر پوچھ رہا تھا۔

''پڑھاتی ہوں۔'' وہ مدھم سا لہجہ کسی ریڈیو کی صوتی لہروں کی طرح جمال تک پہنچا تھا۔

''مجھے پڑھائیں گی، میرا حساب بہت کمزور ہے۔''

بارش تھم چکی تھی مگر شاید اس کی چائے کی پیالی میں شرارتیں گھلی ہوئی تھیں۔ وہ باز نہیں آ رہا تھا، نتاشا نے بمشکل ہنسی روکی تھی۔

جمال نے نتاشا کو جیسے سرزنش کی تھی۔ ''آپ انہیں نروس کر رہی ہیں۔''

''میں نہیں، آپ کر رہے ہیں۔ اور شکل سے تو لگتا ہے آپ کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔''

''زبان نہ ہوتی تو ہمیں کہاں یہ رشتہ ملنا تھا۔'' بے چارگی بھرے اس لہجے پر ماہی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

تب ہی نیلم نتاشا کا سیل فون پکڑے ان کی طرف آئی تھی۔

''نتاشا! تمہارا فون بج رہا ہے۔''

نتاشا فون لے کر کھڑکیوں کی طرف آ گئی تھی۔ دوسری طرف مسز گوہر کا پریشان لہجہ سنائی دیا تھا۔

''فردوس جانے کہاں ہے، گھر نہیں آئی ابھی تک۔ جانے کب سے نکلی ہوئی ہے، تمہاری طرف تو نہیں ہے؟''

نتاشا کو ان کے سوال نے سن کر دیا تھا۔ فردوس گوہر جانے کہاں تھی اس کا نمبر بھی بن جا رہا تھا۔

ادھر نیلم یہ سوچ رہی تھی کہ ماہین ابراہیم کو وہ مونا جمال کہہ کر پکارے گی یا پھر ماہی جمال۔ کیونکہ وہ نتاشا کے لیے ماہی تھی مگر نیلم کو ان کے نام کو زیادہ ہی ماڈرن رکھنے کا شوق تھا اور وہ انہیں مونا کہہ دیا کرتی تھی۔

☆.....☆.....☆

زندگی میں پہلی بار آٹو میں سفر کرنے کا اتفاق تھا اور فردوس کو یہ بہت پسند آیا تھا۔ جیسے ساری فضائیں آزاد ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو زمانے کے ہر سرد و گرم سے جیسے آزاد پایا تھا۔ ساتھ بیٹھی ہوئی ریشمی نے اس کے چہرے پر عجیب طمانیت سی محسوس کی تھی۔ شاید ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب آپ کے دل کا خوف ایک بار آپ کے سامنے آتا ہے اور پھر کسی لمحے کی طرح گزر جاتا ہے تو آپ کو تب خبر ہوتی ہے کہ یہ تو کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم ایسے ہی وہم کی بستیاں آباد کیے بیٹھے تھے۔

اشاروں پر جہاں بھی آٹو رکتا اور کچھ منچلوں کی نظر ریشمی پر پڑتی تھی تو ان کے ہونٹ سیٹی کی صورت میں سکڑ جاتے تھے۔

''ہیر، کدھر جا رہی ہو؟'' عجیب سوال کرتے تھے وہ۔

''رانجھے کول۔'' ریشمی میں کتنا برداشت کا مادہ تھا کہ وہ چپ چاپ چہرے پر مسکراہٹ سجا لیتی تھی۔

سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا، زندگی آسان آسان سی لگ رہی تھی۔ تب ہی کینال کے اشارے پر آٹو رکا تھا اور ریشمی نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا تھا۔ سامنے ہی دو منچلے اپنی ہیوی بائیک پر اشارہ کھلنے کے منتظر تھے اور جیسے ہی ان کی نظر ریشمی پر پڑی تھی ان میں سے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے ریشمی کی طرف منہ کر کے تھوک دیا تھا۔ تھوک اس کے منہ پر گرا تھا۔ فردوس گوہر پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ قیامت کی گھڑی تھی۔

ریشمی نے زخمی نظروں سے گوہر کو دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو، دیکھ لیا ناں زندگی اور لوگ کس طرح منہ پر تھپڑ مارتے ہیں۔ کیسی دشمنی نبھاتے ہیں۔

فردوس نے ان کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دوپٹے سے صاف کیا تھا۔ وہ چپ چاپ سسکتی رہی..... بلکتی رہی.....!

''آئی ایم سوری!'' جیسے یہ تین حرف سب زائل کر دیں گے۔ ذلت کہاں اتنی جلدی ختم ہوتی ہے۔

''سالوں ہو گئے ہیں فردوس، یہ تھوک صاف کرتے کرتے..... اب تو عادت ہو گئی ہے میری عادتیں مت بگاڑو۔''

''زندگی کتنی مشکل ہے ناں ریشم!'' وہ روتے روتے ہنس دی تھی۔

''تمہیں کیسے پتا کہ میرا اصل نام ریشم ہوگا۔''

''بس مجھے پتا چل گیا۔'' فردوس گوہر نے اپنی پشت پر بالوں کی چوٹی کا وزن محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ سرگوشی پھر سے زندہ ہونے لگی تھی۔

''کیا میں آپ کے بالوں کی چوٹی کر دوں؟''

وہ چوٹی جیسے اس کی زندگی کے سارے بوجھ ہلکے کر رہی تھی..... وہ واپسی پر چڑیا کی بیٹی کے گال تھپتھپا کر آئی تھی۔ روشن دانوں میں کبوتر اب بھی غٹرغوں کر رہے تھے۔ بالڑیاں اب بھی جوس بنا کر ٹکٹر ٹکڑا سے دیکھتی تھیں۔

''آپ کے نام کا مطلب جنت ہے ناں۔''

وہ وہیں ٹھہر گئی۔ جیسے کائنات کسی نقطے پر آ گئی ہو۔

''آپ دوبارہ کب آئیں گی؟'' وہ سوال دنیا کا مشکل ترین تھا۔

ریشمی نے انہیں ڈپٹ دیا تھا۔

''اب یہ کبھی نہیں آئیں گی۔ ان سے تعلق ابھی سے ختم۔ ان کی اپنی زندگی ہے انہیں گزارنے دو۔'' فردوس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ بالڑیوں کے چہروں پر تاریک سائے لہرا گئے تھے۔

ریشمی آٹو دیکھنے باہر چلی گئی تھیں۔ تب تک وہ چھوٹی لڑکی پھر سے اس کے سامنے آ گئی تھی۔ اپنی تمام سرگوشیوں سمیت۔

''ریشمی سے چھپ کر کبھی آپ مجھ سے ملنے ضرور آیئے گا، میں انتظار کروں گی۔''

سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا ریشمی اسے آگے کی طرف لے آئی تھی۔

''ہاتھ تھک گئے ہیں فردوس، تالیاں پیٹتے پیٹتے۔''

وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی، آنسو گالوں پر خشک ہو گئے تھے۔ پتا بھی نہیں چلا اور وہ منزل مقصود پر پہنچ چکی تھیں۔

فردوس گوہر نے آٹو سے نکل کر سامنے موجود اس عمارت پر نظر ڈالی تھی جہاں کی وہ مالک تھی۔ جہاں کا اسے آسرا تھا۔ دو چیزوں کا امتزاج، لکڑی اور شیشہ.....!

ریشمی آٹو میں ہی بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس کی طرف جھکی تھی۔

''اندر آ جائیں، آپ میرا گھر دیکھ لیں۔''

ریشمی نے تھوڑا سا آگے ہو کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

''ناں فردوس ناں۔ بس کچھ تعلق جہاں تک ہوتے ہیں وہیں تک رکھو ورنہ آزاد بن جاتے ہیں۔ جھولی بھر بھر دعائیں کروں گی کہ اللہ تمہیں زندگی میں کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔''

وہ تھکے ہوئے قدموں سے گیٹ کی طرف آئی تھی۔ جیسے بہت کچھ پیچھے رہ گیا ہو۔ جن لوگوں سے، جس شناخت کے بارے میں وہ زمانے سے سنتی ہوئی آئی تھی اس کی اصل آج پتا چلی تھی۔ گیٹ کھلنے سے پہلے اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ ریشمی جا چکی تھی اب سڑک پر دھول ہی دھول اڑ رہی تھی۔ شاید وہ اب زندگی میں کبھی نہیں ملنے والے تھے۔

جب پری چہروں پہ چھائی ہو فنا
تب فریب زندگی کا حسن ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

باب یازدہم

خاص

مائی کہے کمہار سے تو کیا روندھے موئے
اک دن ایسا ہووے گا، میں روندھوں گی توئے
پتا ٹوٹا ڈال سے، لے گئی پون اڑائے
اب بچھڑے کب ملیں، دور پڑیں گے جائے
مالا پھیرتے جگ بھیا، پھرا نہ من کا پھیر
مالا کا منکا چھوڑ دے، من کا منکا پھیر
میرا مجھ میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے سو تیرا
تیرا تجھ کو سونپ دیں، کیا لاگے ہے میرا

خام سانچے ہمیشہ زندگی کی بھٹی میں جلتے ہیں
تا کہ خاص کو پہنچیں۔ اور یہی راز حیات ہے کہ چھلنی لگے اور سب جو غیر ضروری ہے۔ وہ اپنے انجام کو پہنچے کہ مدت ختم ہوئی..... اور مدت ختم ہونے کے بعد بھی کوئی بقا کی قطار میں کھڑا ہوا ملے تو وہی خاص ہے۔

بساط لمحوں کی ہو یا صدیوں کی، بساط ہی ہوتی ہے..... اور جو خاص ہوتے ہیں وہ عمر بھر کے ہوتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

مسز گوہر گھنٹوں سے مسلسل جلے پیر کی بلی کی طرح پریشانی کے عالم میں پورے گھر میں چکر کاٹ رہی تھیں مگر جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی تو وہ دوڑتے ہوئے ہوئی، اپنی بیٹی کی طرف گئی تھیں۔

''تمہارا نمبر بھی نہیں لگ رہا تھا اور موسم بھی اتنا خطرناک ہو رہا تھا۔تم ٹھیک ہو نا.....فردوس، تم ٹھیک ہو؟ تمہیں کچھ نہیں ہوا ناں، تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

فردوس گوہر نے اپنی ماں کے چہرے پر نظر جما دی تھی اور مطمئن نظر آنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہی تھی۔

''مام! پریشان نہیں ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں بس میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔''

حادثے کی بات پر مسز گوہر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔

''کیسا حادثہ؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کہیں تمہیں چوٹیں تو نہیں آئیں۔''

وہ بار بار اسے سر سے پیر تک چھو چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ بالکل صحیح سلامت پا کر جیسے انہیں سکون محسوس ہوا تھا۔

اگر بتیوں کی مہک سے سجا ہوا وہ گھر، وہ میک اپ کی تہوں میں لپٹے اصلی مسکان سجائے چہرے، لمبا طویل برآمد، وہ بالڑیوں کی سرگوشیاں، روشندان کے کبوتروں کی غٹرغوں ابھی بھی جیسے اس کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔

''تم کہاں رہ گئی تھیں؟''

''میں کچھ دوستوں کے پاس تھی۔''

مسز گوہر اس بات کا تعین نہیں کر سکی تھیں کہ وہ کن دوستوں کی بات کر رہی تھی۔

''تمہارے کون سے دوست؟''

''مام! آپ نہیں سمجھیں گی۔ میں بس یہ آپ کو بتا رہی ہوں کہ زندگی میں اس سے پہلے میں نے ایسا کوئی تجربہ نہیں کیا تھا۔لیکن اب مجھے پتا چل گیا ہے زندگی بہت آسان چیز ہوتی ہے بس ہم ہی ہوتے ہیں جو اسے مشکل بنا دیتے ہیں۔ سوچ سوچ کے، اپنی سوچ میں توازن نہ رکھ کے۔ دوسروں کی سن سن

http://kitaabghar.com

کر، جب تک ہم کسی فیز سے خود نہیں گزرتے تب تک ہم زندگی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بہت مدت بعد آج مجھے زندگی کا یہ فلسفہ سمجھ میں آیا ہے اور اپنے خالق حقیقی کی اس بات پر پیار آیا ہے کہ وہ ہمیں بہترین طور پہ ہی تخلیق کرتا ہے۔ اب مجھے اپنی اس تخلیق سے، اپنے وجود سے کسی چیز سے کوئی تکلیف نہیں۔ میں جیسی ہوں جس طرح ہوں ٹھیک ہوں بہترین ہوں اور اس چیز کا مجھے کوئی گلٹ نہیں ہے۔"

واقعی اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور موتی دانتوں والی وہ فردوس بھی ہنس رہی تھی۔

وہ صحیح سے سمجھ نہیں سکی تھیں مگر اس کے مسکراتے ہوئے چہرے، چمکتی ہوئی آنکھوں میں ہلکی سی نمی کی لکیر دیکھ کر وہ چپ رہی تھیں جیسے سب ٹھیک تھا۔

اگلے دن ہی نتاشا صبح صبح پہنچ گئی تھی اور اس نے اس کی بتائی گئی تفصیل کو بہت شوق سے سنا تھا اور ایک پل کو اسے ایسے لگا تھا جیسے کئی پہاڑوں جتنا وزنی بوجھ اس کے کندھوں سے ہٹ گیا ہو۔

"تو آپ نے آخر دیکھ ہی لی وہ زندگی۔"

"ہاں میں نے دیکھ لی اور سچ پوچھو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ دنیا میں اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ عام انسان بھی تو اچھے برے ہوتے ہیں نا..... تو ان لوگوں میں بھی کچھ اچھے اور برے لوگ ہیں۔ بہت بار زندگی میں، میں اپنی شناخت کے معاملے میں پریشان رہی ہوں۔ شاید چوبیس سال۔ کیونکہ میرے سامنے جو بھی چہرہ ایسے لوگوں کا دکھایا گیا وہ اتنا ہرگز اچھا نہیں تھا، لیکن اب مجھے لگتا ہے جیسے مجھے بے مقصد نہیں بنایا گیا اور میں ابھی بھی ایک مکمل وجود رکھتی ہوں، شناخت رکھتی ہوں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے خالق کوئی بھی چیز ایسے ہی نہیں بنا کر چھوڑ دیتا۔ ہر چیز کا ہر تخلیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور مجھے بھی پتا ہے کہ میری زندگی میں بھی بہت سے بڑے مقاصد میرے منتظر ہوں گے۔"

ریشمی کے بارے میں، اس چھوٹے سے لمبے برآمدے والے گھر کے بارے میں بات کرتے ہوئے گوہر کے چہرے پر طمانیت بھرا احساس تھا اور یہی احساس نتاشا ابراہیم کو اتنے عرصے ساتھ رہنے کے بعد نظر آیا تھا۔

''وہ کیسے لوگ تھے؟''

''وہ بہت سچے، خوشبو جیسے لوگ تھے جنہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ اور دیکھو ان میں ایک چھوٹی لڑکی بھی تھی جس نے میرے بالوں کی یہ چٹیا بنائی۔''

فردوس نے نتاشا کو چٹیا دکھائی تھی اور کل سے ابھی تک اس کے بالوں کی چٹیاں ویسی کی ویسی ہی تھی۔ اب نتاشا ابراہیم کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اپنی چٹیا کے بل کھول رہی تھی اور نتاشا ابراہیم اس کے چہرے پر ایک عجیب سا نور دیکھ رہی تھی۔

''گوہر! آج آپ بہت الگ نظر آ رہی ہیں جیسی پہلے کبھی نظر نہیں آئیں۔ تو آخر کار آپ نے اپنی زندگی کا وہ راز پا ہی لیا۔''

''اب مجھے لگ رہا ہے کہ شاید میں اب ٹھیک چل رہی ہوں اور زندگی نے مجھے ایک موقع دیا ہے تو میں اس موقع کو بھرپور طریقے سے جیوں گی۔ تم بتاؤ، تم کہاں مصروف تھیں، کون سے مہمان آئے ہوئے تھے؟''

فردوس نے اس سے مہمانوں کی بابت پوچھا تھا۔

نتاشا نے خوش ہو کر اسے باجی کے رشتے کے بارے میں بتایا تھا۔

''باجی کو کچھ لوگ دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ خیر سے انہوں نے ماہی باجی کو پسند بھی کر لیا اور ماہی باجی انہیں بہت پسند آئی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں کہ وہ میری بن جو ہمیشہ ریجیکشن سہنے کے بعد پتھر ہو گئی تھیں۔ کل میں نے پہلی بار ان کے چہرے پر اصلی مسکراہٹ دیکھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو آج تک اتنے سالوں میں، میں نے ماہی باجی کے چہرے پر نہیں دیکھی مجھے ایسے لگا جیسے وہ اپنے وجود کی قبولیت کی مسکراہٹ ہو، جیسے آپ کو ایک سند مل گئی ہو۔ کیا ایک لڑکی کے لیے اس کا اچھی جگہ رشتہ ہو جانا اور چاہا جانا ہی اس کے لیے اصل شناخت کا ذریعہ ہوتا ہے؟ وہ مسکراہٹ سکون میں نے باجی کے چہرے پر اب دیکھا ہے۔ ہمیشہ بال پوائنٹ تھامے پیپر چیک کرتی ہوئی، چاندی کے تاروں میں ڈھلتی ہوئی وہ مجھے پہلی بار خوش دکھائی دیں گوہر۔''

''طمانیت اور سکون دنیا کے سب سے بڑے خزانے ہیں نتاشا۔''

''آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہیں اور کل انہوں نے اپنے بال رنگنے کے لیے مجھ سے کلر بھی منگوالیا ہے تو میں اس بات پر بہت خوش ہوں۔''

''کیسے لوگ ہیں؟''

''بہت اچھے لوگ ہیں۔لڑکا آیا تھا اپنی ماں کیس اتھ ہم سب کو بہت اچھا لگا ہے۔''

''تو پھر شادی کب کر رہے ہو؟''

''ان شاءاللہ کچھ مہینوں تک،شاید پانچ مہینوں تک۔جہیز وغیرہ جوڑ کر ہم باجی کی شادی کر دیں گے۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔''

وہ دونوں شادی کے فنکشن کو ڈسکس کرنے لگی تھیں۔

سوئمنگ پول کے پانی پر بطخوں کا جوڑا دیر تک تیرتا رہا۔کبھی کبھی چھپاک کی آواز کے ساتھ پانی کے چھینٹے اڑتے تھے تو تب وہ دونوں ایک پل کو گفتگو روک کر انہیں دیکھتی تھیں اور پھر دوبارہ سے اپنی گفتگو میں مشغول ہو جاتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

شیشے اور لکڑی سے بنے ہوئے اس گھر کو خلیل نے بہت ستائشی انداز میں دیکھا تھا اور عدن کو مخاطب کیا تھا۔

''تمہاری دوست فردوس کا گھر تو بہت خوب صورت ہے۔''

وہ دونوں اس خوب صورت گھر کے گیٹ کے سامنے باہر رکے ہوئے تھے اور گیٹ تک جیسے ہی وہ اندر ہوئے ٹہلتی ہوئی بطخیں،مختلف قسم کے لوگ ملکوں سے منگوائے ہوئے لان میں لگے پھولوں کی خوب صورتی نے انہیں مسحور کر دیا تھا۔جیسے ہی وہ ڈرائنگ روم میں آئے تو پرانے زمانے کی لگی ہوئی تصاویر،ڈیکوریشن پیسز دیکھ کر انہیں یوں لگا تھا وہ کیسے کسی آرٹ گیلری میں تشریف لے آئے ہوں۔یہاں ہر چیز اتنی پرفیکٹ اور مکمل تھی کہ لگتا تھا کسی بھی چیز کو اس کی جگہ سے کھسکانے سے پورے منظر

نامے میں ایک دراڑ اور خلا سا پڑ جائے گا۔

وہ دونوں غائبانہ طور پر اس گھر کے مکینوں کو داد دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ابھی وہ دونوں صوفوں پر بیٹھے ہی تھے کہ فردوس گوہر اور نتاشا اکٹھی اندر داخل ہوئی تھیں اور عدن کے گلے لگی تھیں۔ عدن نے ان دونوں کے سامنے خلیل کا تعارف کرایا تھا۔

''یہ خلیل ہے، میرا فیانسی۔'' وہ دھیمے سے تعارف کراتے ہوئے مسلسل مسکرا رہی تھی۔

خلیل نے مسکرا کر دونوں کو سلام کیا تھا۔

فردوس گوہر نے سامنے کھڑے اس شخص کو دیکھا تھا جو انجان چہرے کے ساتھ سپاٹ تاثرات سمیت سلام کر رہا تھا کہ گویا وہ دونوں کبھی نہیں ملے۔ کہیں نہیں۔ تو رات گئی او بات گئی۔

سلام کا جواب دے کر وہ عدن سے باتوں میں لگ گئی تھیں اور نتاشا کچھ کھانے کا بندوبست کرنے اندر گم ہو گئی تھی۔

سلام کا جواب دے کر وہ عدن سے باتوں میں لگ گئی تھی اور نتاشا کچھ کھانے کا بندوبست کرنے اندر گم ہو گئی تھی۔

''کیسی گزریں چھٹیاں؟'' عدن نے پوچھا تھا۔

''بس گزرتے گزرتے گزر ہی گئیں، پتا بھی نہیں چلا۔''

''واقعی یہ تو سچی بات ہے گھر میں تو اتنی بوریت ہے کہ بس۔ میں نے کافی دن سے خلیل کو کہا ہوا تھا کہ کسی فرصت کے دن تمہاری طرف چلیں گے، ہم دونوں تو ایک ہی شہر میں ہیں۔''

خلیل پاس پڑے انگریزی اخبار کو اٹھا کر اس کے کسی آرٹیکل کو پڑھنے میں مگن ہو گیا تھا۔ بس کبھی کبھار وہ اخبار کے کونے سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا کہ کہیں وہ اس کی طرف شناسا تاثرات کے ساتھ متوجہ تو نہیں۔ مگر وہ وہاں اس وقت صرف اور صرف عدن کی دوست ہونے کا کردار ادا کر رہی تھی۔

''مجھے تو کنیز، تمکین اور سیرت کی اتنی یاد آ رہی تھی کہ روز ملتے تھے، دنیا جہاں کو ڈسکس کرتے تھے اور اب گھروں میں ہی بند ہیں۔ چلو وہ آئیں گی تو پھر سے رونقیں بحال ہوں گی۔''

تھوڑی دیر میں نتاشا نے وہاں چیزیں بھیجنا شروع کر دی تھیں۔ انواع واقسام کے لوازمات سے سامنے رکھی میز بھر گئی تھی۔

عدن نے اسے ٹوکا تھا۔

''یار! اتنا کچھ ہم سے نہیں کھایا جائے گا۔ ویسے بھی آج کل میں ڈائٹنگ پر ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔ آج تمہارا چیٹ ڈے ہے، تم کچھ بھی کھا سکتی ہو۔''

اس نے چائے بنانی شروع کر دی تھی اور سر اٹھا کر خلیل کو دیکھا تھا۔

''آپ شوگر کتنی لیں گے؟''

اخبار کے کونے سے ہی سنجیدہ تاثرات کے ساتھ سر ابھرا تھا۔

''آدھا چمچہ۔''

وہ چائے بنانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں۔ عدن نے کوکی اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا۔

''کسی دن مووی دیکھنے کا پلان بناؤ ناں۔''

''مووی؟'' فردوس نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

عدن نے کندھے جھٹکے۔

''ہاں تو تم، میں اور خلیل اکٹھے چلیں گے۔''

فردوس کی نظریں اخبار کی طرف اٹھی تھیں اور وہ بھی گھبرایا تھا۔

''ہاں ضرور کبھی۔''

''تم نے بہت اچھا کیا کہ ملنے کے لیے چلی آئیں کیونکہ کچھ دن پہلے ہی میں نتاشا سے ڈسکس کر رہی تھی کہ عدن نے آنا ہے تو جانے وہ کب آئے۔ تو مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ تم میرے گھر آئی ہو۔''

فردوس گوہر نے انہیں اپنا گھر دکھایا تھا اور وہ ہر لگی ہوئی پینٹنگ، مختلف قسم کے ڈیکوریشن پیسز کو بار بار ٹھٹک کر دیکھ رہے تھے۔ ہاتھی دانت سے بنے شاہکار..... دھاتی ظروف..... کانچ کے گلدان۔

''گھر میں اتنا اچھا ذوق کس کا ہے؟'' عدن نے پوچھا۔

''ڈیڈ کو بہت شوق ہے ان سب چیزوں کا اور مام کو تو ان ڈور پلانٹس سے عشق ہے جب بھی کہیں جاتی ہیں تو ان ڈور پلانٹس لے کر ہی واپس آتی ہیں اور پھر اپنی نگرانی میں ہی سب کچھ کرواتی ہیں۔''

ایک ایک کر کے وہ انہیں آس پاس نظر آتی چیزوں کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔

نتاشا ابراہیم کی نظریں ان دونوں پر تھیں۔ واقعی گوہران دونوں سے ایسے ہی تو متاثر نہیں تھی۔

وہ دونوں گرومڈ پرسنالٹی کے مالک تھے جن کے میز کے آداب بھی مختلف تھے۔ عدن کے ہاتھ میں ابھی بھی ایک بسکٹ تھا جسے ٹشو میں لپیٹے وہ کبھی کبھی دانتوں سے توڑ کر کھا لیتی تھی۔

وہ اپنے پسندیدہ میوزک کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

موویز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ڈائٹنگ پلانز ڈسکس ہو رہے تھے۔

لکڑی کی سیڑھیوں کے سب سے اونچے اسٹیپ پر نتاشا ابراہیم نے اپنے آپ کو جیسے بونا محسوس کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بختاور نے اس شام اماں اور ابا کے چہرے پر شام اترتے دیکھی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی بھی اس طرح انہیں پریشان اور الجھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ جتنا اس شام وہ اسے پریشان اداس لگے تھے۔ اماں بار بار ابا کو ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔

''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ ایسا کرو گے، سر پر اتنا چڑھاؤ گے تو اس کا انجام برا ہی ہوگا۔ ارے بھلا دیکھو تو شہر میں جا کر اس کے طور طریقے ہی بدل گئے ہیں، جانے اس کی عقل گھٹنوں میں جا پڑی ہے یا کیا ہو گیا ہے۔''

ابا اس لمحے کی سازش سے خوف زدہ ہو کر بول رہے تھے۔

''بس کر دو۔ جو بھی ہے جیسا بھی ہے میں خود ہی سب سے نمٹ لوں گا۔ تم اس کی تعلیم اور تربیت پہ مت شروع ہو جانا۔''

ابا شاید خود ابھی تک شاک کی حالت میں تھے۔ جس سے نکلنے کے لیے انہیں صدیاں درکار

تھیں۔ وہ واقعی نہیں سوچ سکتے تھے کہ کنیزاں فاطمہ انہیں زندگی کے اس موڑ پر اس طرح سے دھوکا دے جائے گی۔ بختاور بھی اپنی جگہ بیٹھی شرمندگی سے انگلیاں چٹخاتی رہ گئی تھی کیونکہ اب اسے یاد آیا تھا کہ جاتے جاتے اس کے لہجے میں بڑی سرد مہری سی تھی جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''میں بس آپ سے اتنا کہہ رہی ہوں کہ میں نے زندگی میں سکندر کے ساتھ کبھی بھی رہنے کا نہیں سوچا اور مجھے نہیں لگتا کہ میں سکندر کے ساتھ خوش رہوں گی۔ اس لیے میں آپ کو ابھی سے بتا رہی ہوں کہ سکندر کے ساتھ شادی سے مجھے انکار ہے، میں سکندر کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔''

اور اماں نے دو ہتھڑ اپنے سینے پہ مار کر سینہ پیٹ لیا تھا۔

''پاگل ہو گی ہے کیا۔ اس جیسا اچھا رشتہ تجھے کہاں ملے گا؟ اس نے اپنے آپ کو اتنا بدلا ہے اتنا اچھا گھر بنایا ہے، تھل میں آج تک کسی کو ایسا گھر اور سسرال نصیب نہیں ہوا جیسا تجھے نصیب ہوا ہے۔ اور تو ہے کہ باتیں کیے جا رہی ہے۔''

مگر وہ چپ چاپ اماں کو دیکھ کے رہ گئی تھی۔ اس نے یہی کہا تھا۔

''اماں! بہت فرق ہے مجھے وہ اپنے قابل نہیں لگتا۔''

اس کے لہجے کی مضبوطی نے بختاور کو پریشان کر دیا تھا۔

''تم جذباتی ہو کر سوچ رہی ہو خدا کے واسطے چپ کر جاؤ۔''

لیکن وہ چپ نہیں رہی تھی، وہ بولتی رہی تھی۔ اور ابا چپ چاپ اس کی کہی گئی بات کو سنتے رہے تھے۔

''اتنا پڑھ لکھ کر بھلا مجھے کیا فائدہ ہوا کہ وہی ماحول بلکہ گنوار ماحول اور ایک ایسا انسان جس کی اپنی تعلیم مکمل نہیں ہے، کیا آپ میرے واسطے یہی دیکھتے ہیں کہ میں زندگی ساری اس شخص کے ساتھ گزار دوں گی..... نہیں ابا، ایسا کبھی بھی نہیں ہو گا خدا کے واسطے آپ تو سوچیں، میرا اور اس کا جوڑ نہیں بنتا۔'' کنیزاں کی کہی ہوئی بات پر بس ابا تھک کر چارپائی پر ڈھیر سے ہو گئے تھے۔ اور وہ اپنا سارا سامان لیے ابھی بھی منظر کھڑی تھی۔ اس کے جانے میں بس تھوڑا سا وقت ہی باقی رہ گیا تھا۔

اماں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

''خدا کا نام لے۔ ماں باپ کی تربیت کی لاج رکھ لے۔ تجھے اتنا پڑھایا لکھایا، آج اس کا تو یہ صلہ دے رہی ہے۔''

وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے سامان تھامے ہوئے زمین پر گڑی رہی، مضبوطی سے۔ ابا اماں اور بختاور کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

''میں مانتی ہوں۔ مجھے اس بات سے کوئی انکار نہیں کہ آپ نے پڑھایا لکھایا، اتنا بڑا کیا، پالا پوسا، لیکن آپ بدلے میں مجھ سے میری پوری زندگی مانگ رہی ہیں۔ یہ کیسا صلہ ہے جو آپ مجھ سے مانگ رہی ہیں اور مجھے ایک ایسے انسان کے پلے باندھ رہی ہیں جو مجھے دل سے پسند نہیں ہے، جو مجھے اپنے قابل نہیں لگتا۔ میں اس انسان سے کیسے اپنا رشتہ ناتا جوڑ سکتی ہوں..... آپ خود مجھے بتائیں۔ اس بات پر میرا دل نہیں مانتا۔''

بختاور نے اب اسے غور سے دیکھا تھا کہ واقعی اس کا دل کہاں مانتا تھا۔

''سکندر کیا سوچے گا..... تیری خالہ کیا سوچے گی۔''

''جو بھی سوچیں اماں! مگر میں نے کہہ دیا ہے اور میں نے سکندر سے بھی بات کر لی ہے۔''

اس کی بات پر ابا نے چونک کر سر اٹھایا۔

''تو کیا کہا ہے تم نے سکندر سے؟''

''میں نے یہی کہا ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''سکندر نے کیا کہا؟''

یہ سوال اماں کی طرف سے آیا تھا۔ وہ جیسے اسے ٹٹول رہی تھیں، جانچ رہی تھیں۔

''اس نے یہی کہا کہ وہ کہیں اور کر لے گا۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کی مجھ سے شادی ہوتی ہے یا نہیں۔''

کنیزاں نے سکندر کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی تھی اور اپنے آپ کو ہر نقصان سے بری الذمہ کر لیا تھا۔ اپنے جذبات کا اظہار کرے، اپنے اندر کا زہر اگل کر وہ بالکل پرسکون حالت میں تھی۔

''اگر تو نے سکندر سے شادی نہیں کرنی تو کس سے کرنی ہے؟ سارا تھل تجھ پر تھوتھو کرے گا۔ ہماری عزت کو ملیامیٹ مت کر دینا مجھے تو لگتا ہے تو سکندر کے لائق نہیں ہے۔''

بختاور چپ چاپ آرام سے اس بحث کو سنتی رہی تھی، وہ اس بحث کے دوران کچھ بھی نہیں بولی تھی۔ شاید کنیزاں اب اتنی بڑی ہوگئی تھی اور اس کے وجود میں بغاوت کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند پر سوال اٹھا سکتی تھی۔ انکار یا اقرار کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

چولہے کی راکھ کریدتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

''جانے اماں ابا کے اندر کون سی دوربینیں فٹ ہیں کہ جن کے شیشے ہی اتنے دھندلے ہیں کہ انہیں اپنی اولاد میں اتنی بڑی تبدیلی ہی نظر نہیں آئی۔''

سکندر کے گھر کی دعوت سے واپسی پر ہی اس نے بختاور کے سامنے اعلان کر دیا تھا۔

''میں جانے سے پہلے اماں ابا سے بات کروں گی۔''

''کس معاملے میں؟''

''یہی کہ مجھے سکندر سے شادی نہیں کرنی۔''

''میں تو کہتی ہوں یہ بات مت کرو۔ ابا اور اماں بہت دکھی ہوں گے، انہیں مت بتاؤ۔''

''کب تک نہ بتاؤں؟ کب تک چھپاؤں گی؟ کبھی نہ کبھی تو یہ بات سامنے آتی ہے تو کیوں نہ ابھی اسی وقت اس کا فیصلہ ہو جائے تاکہ لاہور جاتے ہوئے میرے کندھوں پر کوئی بار، کوئی بوجھ نہ ہو۔''

اسے صرف اپنی فکر تھی کہ وہ ہلکی رہے، کوئی الزام اس کے سر نہ آ جائے۔ کتنی سیانی تھی وہ کہ تھل کی عدالت کے مقدمے بھگتنے کو تین لوگ پیچھے چھوڑنے جا رہی تھی۔

''سکندر کا کیا ہوگا؟'' وہ بختاور کے بنائے ہوئے کروشیا کے پھول کو ادھیڑ رہی تھی۔

''وہ کہیں اور کر لے گا شادی، اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔''

''اگر نہیں ہے تو کیوں اس کو مسئلہ بنا رہی ہو، آواز اٹھا رہی ہو؟''

''میں نے ان ریت کے ٹیلوں میں نہیں مرنا۔ مجھے اب اور نہیں جینی یہاں کی زندگی۔ مجھے

http://kitaabghar.com

گھٹن ہونے لگتی ہے یہاں دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ تمہارے کروشیا کی سلایوں کی بھی ضرورت نہیں۔ اب مشینوں سے سب کام ہو جاتے ہیں۔'' وہ طیش میں آ کر کروشیا کے ادھڑے ہوئے پھول پھینک کر اٹھ گئی تھی۔

بختاور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی تھی۔ تین دن گزرنے کے بعد اسے اپنے ٹرنک میں وہ سینٹ کی شیشی ملی تھی جو کنیزاں لگائے رکھتی تھی۔ جس کے بارے میں اس نے اس سے سوال بھی کیا تھا اور سوچا تھا شاید وہ سوال سن نہیں سکی تھی مگر اسے سب پتا تھا۔ کرسٹل شیشے میں بند خوشبو وہ بختاور کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

چھٹیاں گزرنے کا بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنوں کو پَر لگ گئے تھے اور ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ گھر کی فضا، گھر کے ماحول میں وقت اتنی تیزی سے گزر گیا تھا، بغیر کسی چاپ کے ورنہ انہیں ضرور خبر ہو جاتی۔ ویسے اب تو لگتا ہے جیسے وقت میں برکت ختم ہوتی جا رہی ہے اور وقت بھاگتا دوڑتا ہوا اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑتا جا رہا ہے۔ جیسے ہم انسانوں کی عمر ہوتی ہے، پیڑ پودوں، شاید وقت کی بھی عمر ہوتی ہے اور وقت کو بھی اپنی عمر کو ضرور پہنچنا ہوتا ہے۔

لمبی ساری سوچیں تمکین جمال کے گرد پہرے ڈال کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہی وہ سوچتے ہوئے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی کہ ساری زندگی جس گھر میں اس نے گزاری تھی، وہی گھر جہاں اس نے بچپن سے لے کر، اپنے لڑکپن تک سے لے کر جوانی تک کا وقت گزارا تھا۔ آج وہی گھر تھا جہاں وہ ننگے پاؤں پھر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کے اندر ایک نئی توانائی محسوس کی تھی۔

کچھ دیر پہلے ہی تو ابا جمال آنکھوں میں اپنی ساری عمر کا مان بھروسہ لے کر اس کے سامنے سوالی ہوئے تھے۔ وہیں پھوپھی شاہد تھیں۔

''تمکو! تیری پھوپھی اور میں نے تیرے لیے ایک رشتہ دیکھا ہے، لڑکا بہت اچھا ہے، اس کا اپنا کاروبار ہے پڑھا لکھا بھی ہے۔ وہ لوگ تجھے دیکھنے آنا چاہ رہے ہیں۔''

وہ تو تمام عمر قصے کہانیوں میں زندہ رہی تھی کہ دور سیدھے جنگل کا راستہ ہوگا جہاں سے کسی اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی باگیں پکڑے کوئی شہزادہ آئے گا مگر حقیقتیں خوابوں سے، گمان سے دور کھڑی ہنس رہی ہوتی ہیں۔

اس نے اپنے باپ کے مان کو ہمیشہ سلامت رکھنا تھا۔ دل اندر سے جیسے رو پڑا تھا لیکن پھر بھی اس نے ابا کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

''ابا! جیسے آپ کو بہتر لگے، میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے۔ آپ کے فیصلے پر ہی مجھے اعتبار ہے۔ آپ جیسا کہیں گے، جو بھی کہیں گے میں اس پر یقین کرلوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ بار بار آپ کو یہ پوچھنے کی بھی ضرورت پڑے۔''

اس سہ پہر جمال دین جیسے سارے زمانے اور اپنی بہن کے سامنے سرخرو ہو گیا تھا۔

اگلے دن جب شام ڈھلنے میں کچھ وقت تھا تو اسے دیکھنے کو لڑکے کی دادی، ماں اور بہن آئی تھیں۔

دادی بار بار اسے پاس بٹھا کر صدقے واری جاتی تھیں۔

''ارسلان کے ساتھ بہت جچے گی، چاند سورج کی جوڑی ہے۔''

لڑکے کی بہن بار بار ماں کے کان میں کھسر پھسر کرتی تھی۔

''ہاں اماں! اتنے مزے کا کھانا۔ سب کچھ خود انہوں نے بنایا ہے۔''

اماں نے تمکین کو مخاطب کیا تھا۔

''بیٹی! سلائی کڑھائی کا کچھ جانتی ہو کیا؟''

تمکین نے ہولے سے سر اٹھایا تھا۔

''جی مجھے سب آتا ہے۔''

پیٹیوں ٹرنک کے کپڑوں کی کڑھائی سے لے کر، میز پوش چوڑی پاجامے کی سلائی تک بات ہوتی رہی۔ وہ لوگ جاتے جاتے اس کی مٹھی میں کچھ پیسے دبا کر ہنستے مسکراتے ہوئے وہاں سے گئے تھے۔ تمکین جمال پلر سے لگی ہوئی آنکھوں میں ایک سوال لیے کھڑی رہی تھی کہ پوچھ لے کہ آپ کی

حویلی کہیں بادبان کے پھولوں اور جائفل کی خوشبو کے قبضے تو نہیں؟

شام نے اس لڑکی کے ہونٹ تلے دبے ہوئے مردہ سوال کو غم ناکی سے دیکھا تھا، کہ وہ سوال کتنا ضروری تھا مگر وہ اپنے باپ کا قد اونچا کر گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ جہان رنگ و بو جو کچھ عرصے کے لیے بالکل ہی خاموش ہو گیا تھا، اب پھر سے آباد ہونے لگا تھا۔ وہ سارے لوگ اپنی اپنی چھٹیاں گزار کر جیسے اپنے اپنے آشیانوں کو واپس پلٹنے لگے تھے۔

وہی ہرے بھرے بوڑھے قدیم درختوں کے نیچے سوئی ہوئی سڑکیں تھیں جن پر چیونٹے قطاروں میں اپنی اپنی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔

ہاسٹل کی دیواروں کے پار شور وغل ایک بار پھر سے زندہ ہونے لگا تھا۔ گھر میں جیسے دم گھٹنے لگا تھا۔ سانس بند ہو رہی تھی۔

پوپلی بوا نے اس کا ہر ممکن خیال رکھا تھا۔ اس کے بالوں میں سرسوں کے تیل اور ناریل کی مالش کی تھی۔

''وہاں تو لگتا ہے کہ تم اپنا خیال ہی نہیں رکھتی ہو گی انسان کو اپنی ذات سے ایسی لاپروائی نہیں برتنی چاہیے۔''

''بوا! قسم سے بہت کوشش کرتی ہوں مگر پھر بھی کوئی ایسی مشینی سی روٹین بن گئی ہے کہ یونیورسٹی کا کام ہی مشکل سے ختم ہوتا ہے۔''

آج کل گھر میں ہوتے ہوئے بھی وہ بہت سے اخبار پھیلائے ہوئے آرٹیکلز کے پوائنٹس نوٹ کرتی ہوئی پائی جاتی تھی۔

آیت تب اس کے اردگرد منڈلاتے ہوئے اسے زچ کرنے کی ساری کوششیں بروئے کار لایا کرتی تھی۔

''جرنلسٹ بننے کا خیال ویسے کیوں آیا تمہیں؟''

''کیونکہ مجھے جرنلزم پسند ہے، خبر اور تحقیق کا مجھے بہت شوق ہے۔''

''کس قسم کی تحقیق؟''

''فی الحال تو رشتوں کی تحقیق کی ہے جس کا حاصل وصول بددیانتی اور تفریق ہی ملا ہے۔ باقی رہی بات صحافتی تحقیق کی تو مجھے زیادہ سے زیادہ مصروف رہنا ہے، کھوج لگانا ہے کہ کسی بھی خبر کے پیچھے کون کون سے عوامل کام کر رہے ہیں۔'' ناچاہتے ہوئے بھی وہ آیت کو جواب دینے پر مجبور ہوگئی تھی۔

''ایک بات پوچھوں تم سے؟''

وہ ہفتہ وار میگزینز کی فہرستوں کو غور سے پڑھ کر ہائی لائٹ کر رہی تھی جب اس خصوصی اجازت نامے پر چونک کر سر اٹھایا تھا۔

''دو باتیں پوچھ سکتی ہو۔''

''تم نے اپنی آگے کی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

بڑا محتاط سا انداز تھا جس میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا۔ پراسراریت سی تھی، کچھ کھوجنے کو بے تابی تھی۔

''آگے سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' وہ سچ میں نہیں سمجھی تھی۔

''شادی کے بارے میں۔''

قینچی سے کٹنگز کرتی ہوئی وہ ہنس دی تھی۔

''تم سوچ رہی ہوگی کہ میں تمہیں بتاؤں گی کہ یونیورسٹی میں میرا کوئی افیئر چل رہا ہے اور میں جلد اس لڑکے سے شادی کرلوں گی۔ اور اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر تم لوگوں کی جان چھوڑ دوں گی۔ تم کتنا آگے تک سوچ لیتی ہو، میں سب جانتی ہوں آیت..... سب جان لینے کی اذیت کو تم نہیں سمجھو گی۔ کاش کہ کبھی تم سمجھ سکو میری بہن۔''

آیت نے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے تھے سامنے بیٹھی ہوئی سیرت امتیاز آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی جس کے بال کیچر کی گرفت سے نکل کر اس کے منہ پر آرہے تھے۔ جنہیں بار بار وہ پیچھے کر دیا کرتی تھی۔

''مگر ایسا ویسا سوچنا بھی مت۔ رہی بات شادی کی تو وہ میں اپنی پسند سے کروں گی۔ اس شخص سے جو مجھے ویلیو دے گا..... گھر دے گا..... ہر وہ چیز جس کے لیے میں اس گھر کی چھت تلے ترسی ہوں۔''

''تمہاری خام خیالی ہے کہ اس گھر تلے تم نے کوئی آسائش نہیں دیکھی۔''

''تمہاری غلط فہمی ہے کہ اس گھر میں انصاف کیا جاتا رہا ہے اور اب جاؤ مجھے کام کرنے دو۔''

وہ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی تھی بغیر کوئی بحث کیے۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔

اب جب پوپلی بوا اس کے لمبے بالوں میں تیل کی مالش کرنے کے بعد چوٹی بنا رہی تھیں تو اس نے ان سے پوچھا تھا۔

''بوا.....''

''ہوں۔''

''اگر مجھے یونیورسٹی میں کوئی لڑکا پسند آجائے تو؟''

چوتھے بل کو گوندھتے ہوئے ان کے ہاتھ ایک پل کو رک سے گئے تھے۔

''تو کوئی بات نہیں۔ اسے کہنا اپنے ماں باپ کو لے کر یہاں آجائے۔''

وہ حیران رہی گئی تھی اسے بوا سے اس جواب کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

''بوا! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں'' آپ مجھے روک بھی نہیں رہیں۔''

بوا نے سامنے آکر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''میں تمہیں تب سے جانتی ہوں جب تم چھوٹی سی تھیں اور مجھے اتنا پتا ہے کہ تم زندگی میں کبھی بھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کرو گی۔ اور جس کو بھی تم پسند کرو گی اس پر میں سوال نہیں اٹھاؤں گی کہ تم اپنا برا بھلا سب سمجھتی ہو۔''

وہ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی تھی کہ اس کی ذات قابل اعتبار تھی کہ اس کے سب ہی مان سلامت تھے۔

وہ پہروں بیٹھ کر یہی بات سوچتی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ تھل واسیوں کو سب کچھ سنا آئی تھی جو کچھ بھی دل میں تھا، مگر وہ جو یہ سوچ رہی تھی کہ وہ سب کچھ کہہ کر اور سکندر سے انکار کر کے بالکل ہلکی ہوگئی ہے تو وہ بالکل غلط تھی کہ چھک چھک چلتی ہوئی ٹرین جس کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے باہر دوڑتے ہوئے مناظر وہ دیکھ رہی تھی اس جتنا وزن اعصاب پر آ پڑا تھا۔ دل کو کوئی پل کا بھی چین نہیں پڑ رہا تھا۔ دریا، گھاٹیاں، صحرا، نخلستان سب کچھ شیشوں کے پار سے گزرتا جا رہا تھا۔

وہ بہت تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ لاہور اسٹیشن پہنچی تھی۔

یونیورسٹی پہنچتے تک شام ہوگئی تھی۔ ہاسٹل روڈ پر رونقیں بحال ہوتی تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس طویل سڑک پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائے اور دل کھول کر روئے۔ یہاں تک کہ سب غبار نکل جائے مگر افسوس کہ اس دور میں اتنی سی بھی آزادی حاصل نہیں تھی۔

وہ سامان سمیٹتی ہوئی بس چلتی رہی تھی یہاں تک کہ ہاسٹل کے داخلی دروازے کے پاس اس نے خود کو موجود پایا تھا۔

وہی طویل راہداری تھی جہاں اب بھی کچھ بلیاں لیٹی ہوئی تھیں اور ہر آتے ہوئے کو گھورتی تھیں۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر کمرے تک پہنچی تو کمرے کا دروازہ تھوڑا سا بھڑا ہوا تھا۔ اس کے دھکیلنے سے سارا کھل گیا تھا۔

اور اس کی نظر سامنے دیوار سے لگ کر بیٹھی ہوئی تمکین پر پڑی تھی۔

''اللہ تمکین! تم سب سے پہلے پہنچ گئیں۔''

وہ بھی بھاگ کر اس کے گلے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں بعد کہیں مل رہی ہوں۔

''کیسی ہو تم؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں، تم بناؤ کیسی ہو..... گھر میں سب کیسے تھے؟''

تمکین اس کے بیگ اندر رکھی رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ وہ دونوں اپنی گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھیں۔

http://kitaabghar.com

''میں نے تم لوگوں کو اتنا یاد کیا۔''

''سچ میں، میں نے خود بھی۔''

وہ کچھ دیر ستانے کے بعد چائے بنانے لگی تھیں۔

''بختاور کا سناؤ۔''

''ٹھیک تھی وہ، تم سب لوگوں کو سلام کہہ رہی تھی۔''

وہ اپنے کپڑے ہینگر میں ڈال کر لٹکا رہی تھی اور تمکین چائے کی نگرانی کر رہی تھی۔

''سیرت کب آئے گی؟'' کنیزاں نے سوال کیا تھا۔

''آج ہی پہنچنا تھا اس نے۔ دیکھو، کب تک آتی ہے۔ لگتا ہے اسے دیر ہوگئی ہے کچھ۔''

کنیزاں نے گیلری والا دروازہ بھی کھول دیا تھا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر بے دھڑک گھسے تھے اور نیلگوں آسمان بھی صاف نظر آنے لگا تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہجوم دوستاں کی سریلی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ کمروں کے تالے کھلنے کی آوازیں بھی آتی تھیں۔

سارے مسافر اپنے ٹھکانوں کو واپس آ رہے تھے۔

موسم بدل گیا تھا۔ خنکی ہوگئی تھی۔

وہ دونوں بھی اپنے مسافر کا انتظار رہیں۔ جب انہوں نے پکا سوچ لیا کہ شاید آج سیرت نہیں آئے گی اسی وقت دروازہ دھڑ دھڑایا تھا اور دروازہ کھلنے پر سیرت اندر دھم سے گری تھی۔

''اللہ اتنا سفر..... میں بہت تھک گئی۔''

وہ دونوں اس کا سامان گھسیٹ کر اندر لائی تھیں۔

''توبہ ہے۔ سلام نہ دعا، آتے ہی لم لیٹ ہوگئیں تم تو۔''

''میرے ہاتھ پیر دباؤ، قسم سے کام نہیں کر رہے۔''

وہ دونوں اس کے ہاتھ پیر دباتی رہیں اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے دونوں کو گلے لگایا تھا۔

http://kitaabghar.com

''ہائے..... بہت یاد آئی تم لوگوں کی۔''

''ہاں نظر آرہا ہے۔'' تمکین نے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

''شکی نظروں سے مت دیکھو۔ پوپلی بوا گواہ ہیں اس بات کی۔''

''کیسی تھیں بوا؟'' کنیزاں کو ان کا ذکر بہت پسند تھا۔ اکثر وہ ان کے بارے میں خیریت دریافت کرتی رہی تھی۔

''مجھے کہتی ہیں سب ٹھیک ہے انہیں پرہیزی غذا کی ضرورت ہے مگر پرہیز نام کو نہیں کرتیں۔ شوگر ہائی رہتی ہے مگر نہ جی کوئی پرواہ نہیں۔''

وہ تینوں دیر تک باتیں کرتی رہی تھیں اور میس کے وقت ہال پہنچیں تو منشی جی سے پوچھا۔

''آج کیا پکا ہے؟''

''مسور کی دال۔''

وہ منہ بنانے لگی تھیں۔

''لڑکیو! گھر سے آئی ہو اتنا کچھ کھا پی کر، اب دال بھی کھالو۔''

وہ بھی کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ جو نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ میں جہاں مٹی کے برتن، گھروندے بنانے کی ورکشاپ تھی اور پوری یونیورسٹی کی تخلیقی روحیں وہاں اکٹھی تھیں تو وہ بھی اکیلی اس طرف نکل آئی تھی۔ کچھ تو اسے بینک کا کام بھی تھا۔ وہ آڈیٹوریم کی طرف نکل آئی تھی جہاں ساتھ ہی سارے ڈپارٹمنٹس ایک طویل گیلری کی صورت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ طویل راہداری تھی جہاں سوشل ورک سے لے کر چائنیز زبان سیکھنے والوں تک کی محفلیں لگتی تھیں۔ اور آج وہیں آثار قدیمہ کے طالب علموں کی ورکشاپ ہو رہی تھی جہاں سرخ مٹی کی پہاڑی سی بنائی گئی تھی۔ اور گیلی چکنی سرخ مٹی سے سارے اپنی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے مطابق صراحیاں، برتن، گملے بنا رہے تھے۔

سیرت امتیاز بھی اسی راہداری سے نکلتے ہوئے ہجوم دیکھ کر رکی تھی۔ سارے ماحول کو اس نے دلچسپی سے دیکھا تھا، شدت سے دل چاہا تھا کہ وہ بھی کچھ گھڑ ڈالے اور اس نے بھی سرخ مٹی کو اٹھایا تھا کہ کچھ بنا لے۔

وہ وہاں دوستوں کے گروپ کے ساتھ کھڑا تھا جب یوں لگا تھا یونیورسٹی کے کوریڈور میں ونڈ چائمز لگا کر رفو چکر ہو گیا ہو اور وہ آوازیں انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی تگ و دو میں ہوں۔

سرخاب خان اچانک مڑا تھا اور ونڈ چائمز کے لیے ہوائیں گمشدہ ہو گئیں۔

وہ ہلکے سے اس لڑکی سے ٹکرایا تھا جس کی ہتھیلی پر مٹی کی ایک چھوٹی سی خوب صورت صراحی تھی، جو شاید وہ ورکشاپ سے بنا کر خوش ہوتی ہوئی ابھی باہر آ رہی تھی۔ سرخاب کی ٹکر سے وہ کوریڈور کے فرش پر گر کر دوبارہ مٹی کے لوتھڑے کی شکل میں ڈھل گئی تھی۔

وہ ہنسی تھم گئی تھی۔ وقت بھی۔ اور سیرت امتیاز بھی..... بہت مشکل سے اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ ننھی سی صراحی بنائی تھی جو سامنے کھڑے شخص نے ٹکر سے زمین بوس کر دی تھی۔

وہیں لمحوں نے زنجیر باندھ لی تھی۔ سرخاب کو لگا وہ ابھی طیش میں آ جائے گی، چیخے گی، چلائے گی جیسے لڑکیاں عموماً کرتی ہیں۔ وہ بس خاموش ہو گئی تھی۔ تھوڑا سا جھکی، مٹی کا وہ لوتھڑا اٹھایا اور پیچھے الٹے قدموں کے ساتھ بنتی چلی گئی تھی جیسے وہ وہاں تھی ہی نہیں۔ بس اس نے آنکھیں ایک پل کو اٹھائی تھیں جو چار ہو گئیں۔ وہیں دل کے چار خانے بھی ہاتھ سے جاتے ہوئے محسوس ہوئے۔

وہ ڈر گئی تھی..... سہم گئی تھی۔

سامنے اپالو تھا یا کوئی گزرے وقت کا شہزادہ جس کے بھورے بال اور آنکھیں اسے ٹھٹھرا گئی تھیں۔

یہیں آ کر ان کی پہلی ملاقات ختم ہوئی تھی۔

دوسری ملاقات ہاسٹل روڈ کی طرف ایس ٹی سی کوریڈور میں ہوئی تھی جہاں کچھ لڑکیاں چھوٹے چھوٹے کپ کیکس میں رنگ برنگی موم بتیاں جلائے سالگرہ کی وش گنگنا رہی تھیں۔

وہ سرد موسم تھا کوریڈور میں چاروں طرف سے دھند گر رہی تھی دودھیا بلبوں کی روشنی میں وہ

بیچوں بیچ کھڑی تھی اور اس کی دوستیں۔

کورس میں گا رہی تھیں۔ ایس ٹی سی دھند میں لپٹا ہوا۔ موسم کی خنکی اور ہلکی سی رومانوی سی فضا۔

سرخاب وہیں سے گزرا تھا اپنے دو دوستوں کے ہمراہ جب اس نے اپنے پیچھے آواز سنی تھی۔

''سنو۔''

وہ تینوں پلٹے تھے۔

''کون؟''

''بھورے بالوں والے لڑکے میں تم سے مخاطب ہوں۔''

سرخاب نے سٹپٹا کر اپنے دوستوں کے سر کے بالوں کی طرف دیکھا تھا اور پھر اسے لگا تھا وہ اسے ہی تو بلا رہی تھی۔

''کون میں؟'' سینے پر انگلی رکھے وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔

''ہاں تم۔''

وہ تھوڑا سا آگے بڑھ آیا تھا۔ دھند گرنے لگی تھی خنکی بڑھنے لگی۔

''یہ لو۔ منہ میٹھا کر لو آج میری سالگرہ ہے۔''

وہ ہتھیلی آج کپ کیک سے سجی ہوئی تھی، چھوٹا سا کپ کیک اور چھوٹی سی اس پر جلتی بجھتی اور پھلتی ہوئی موم بتی۔

''میں آپ کو نہیں جانتا۔''

دھند میں سب گم ہونے لگا تھا حتیٰ کہ وہ دونوں بھی۔

''سنو..... تم لمحوں کی واردات پر یقین رکھتے ہو؟''

''نہیں۔ میں ایک زمینی اور حقیقی انسان ہوں محترمہ۔''

چھوٹا سا کپ کیک اور ننھی سی موم بتی پیچھے کھینچ لی گئی تھی۔

کوریڈور میں ونڈ چائمز پھر سے کہر آلود شام میں بجنے لگے۔

''جلد تم زمینی نہیں رہو گے اور حقیقی بھی۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ جو لمحوں کے وارد ہونے سے منکر ہوتا ہے ناں تو لمحے اسے جا پکڑتے ہیں۔ اللہ تمہیں لمحوں کے عذاب سے محفوظ رکھے بھورے بالوں والے حسین شخص۔''

وہ دونوں اپنے اپنے راستے مڑ گئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی فضا میں رابعہ انور کے چھوٹے روپ کے درشن کے کرداروں کی محبت میں۔ لمحوں کی واردات کی داستاں ابھی بھی تازہ تھی۔

ہر شے جہان رنگ و گل کی خاص کر
کن کی مستی گونج میں ہر سمت ہوا لا

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

نمرہ احمد کا بہت خوبصورت نیا ناول
مالا
ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں
kitaabghar.com

سحر ساجد کا بہت خوبصورت نیا ناول
میرا بخت
ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں
kitaabghar.com

باب دوازدہم

تلاش گمشدہ

ہاڑا ہانیاوے ایک بوٹا لسوڑے دا
ویلا خوشیاں دا آیا جوڑا رب نے بنایا
ہاڑا ہانیاوے اک بوٹا کنیر دا
دل رکھ سجناں ذرا تک سجناں
ہاڑا ہانیاوے اک ہٹی سنار دی
میڈی سجناں دہائی نکیں لک دی لکائی
گل تیرے میرے پیار دی
ہاڑا ہانیاوے چڑھ آئیاں تے ہنیر یاں
ساڈا جانڑ دا اے رب بھاویں بھل جاوے جگ
یاد اپھلنڑ نہ تیریاں
ہاڑا ہانیاوے

بڑے شہروں کے بھی دانت ہوتے ہیں اور جب انہیں بھوک لگتی ہے تو یہ انسانوں کو بھنبھوڑنے لگتے ہیں، کھانے لگتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

وہ کتنے ہی دن سے ان دونوں کی خاموشی کو محسوس کر رہی تھی جیسے وہ دونوں اپنے دھڑ سے پھر رہی ہوں مگر روح کہیں خلاؤں میں معلق ہوئی پھرتی ہو۔ دیکھا جائے تو کتنی بڑی نعمت ہے کہ انسان جس احساس میں ہو وہی محسوسات اوڑھے پھر رہا ہو جیسے کہ کنیزاں اور سیرت۔ تمکین نے اس بات پر انہیں غائبانہ خراج تحسین پیش بھی کر دیا تھا۔

شام ڈھلنے سے ذرا پہلے جب پرندے ٹولیوں کی صورت میں اپنے گھونسلوں کی طرف اڑے جاتے تھے اور خنکی سے تھرتھرا کر لوگوں نے اپنے بازو باندھے ہوئے تھے تو وہ اور سیرت اسپورٹس گراؤنڈ کی طرف چہل قدمی کرتی ہوئی نکل آئی تھیں۔

''تم نے کبھی محبت کی ہے تمکین؟'' سیرت نے سڑک پر پڑے ایک ننھے سے پتھر کو ٹھوکر کے حوالے کر دیا تھا۔

''مجھے نہیں پتا کہ یہ محبت کیا ہوتی ہے، کب ہوتی ہے، کیسے ہوتی ہے، تجربہ نہیں ہوا مگر مشاہدہ کر رہی ہوں آج کل۔ مجھے.....''

وہ اتنی سیدھی بات نہیں تھی کہ سیرت پتھر اڑائے جاتی وہ لمحے بھر کو رک سی گئی تھی۔

''کس کو محبت میں مبتلا دیکھ رہی ہو آج کل؟ تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟''

''یونیورسٹی میں ہاسٹل میں ایسی کہانیاں تو بہت ہیں کوئی سی بھی اٹھا لو۔'' تمکین نے اس نادان لڑکی کو ہنس کر دیکھا۔

لاعلمی سے بڑی دنیا میں کوئی نعمت نہیں اتری ہوگی۔

سامنے جغرافیہ کی لڑکیاں بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ وہیں سے چڑی اڑتی ہوئی سیرت کے سامنے سرمئی سڑک پر آ گری تھی جہاں وہ پتھروں کو ٹھوکروں پر رکھے ہوئے تھی، چڑی کو بھی یوں ہی اس نے ٹھوکر لگائی تھی۔

''افسوس کی بات ہے۔'' ریکٹ تھامے پسینے میں شرابور چڑی کے پیچھے بھاگتی ہوئی وہ لڑکی، سیرت کو لتاڑ گئی تھی، مگر یہاں کوئی اثر تک نہ ہوا تھا۔

''ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟''

''یہی کہ جب کسی کو محبت کا بخار چڑھتا ہے تو وہ پریشان نظر آنے لگتا ہے جیسے گیتی آرا کے چہرے کے اوپر ابھر آتا تھا۔''

تمکین جمال کو ہمیشہ انہوں نے زمانے سے بے خبر اور کام سے کام رکھنے والی کا ہی لقب دیا تھا مگر آج وہ انہیں آئینے دکھا رہی تھی۔

''تم۔ تمہیں کوئی غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔''

تمکین نے سامنے مکئی کے سٹے پر ایک ننھی سی چڑیا کو ٹونگتے ہوئے دیکھا تھا جو شاید اس کی نظروں کے لمس سے ہی ڈر کر پھر سے اڑ کر کہیں گم ہو گئی تھی۔

''ہاں شاید غلط فہمی بھی بہت آسانی سے ہو جانے والی چیزوں میں سے ایک ہوتی ہے تو مجھے بھی ہو گئی ہو گی۔''

شام کی چھتری تلے سب سیاہ ہو گیا۔ کچھ روشنیاں جگنوؤں جیسی چمکتی تھیں۔ کنیز کا پریکٹیکل تھا تو اس نے آج کچھ دیر بعد ہی آنا تھا تو وہ دونوں ادھر کو نکل آئی تھیں۔ کچھ لڑکیاں اپنی اسکوٹیاں بھگائے پھر رہی تھیں۔ پاس ہی ایک کنج کسی بحث میں الجھا ہوا تھا تو وقفے وقفے سے شور شرابے کے ساتھ کچھ الفاظ بھی کانوں میں پڑ جاتے تھے۔

''مرد ہمیشہ ہی عورت کی خود اعتمادی سے خوف زدہ رہا ہے۔''

دور دور تک جیسے ایک قہقہہ پھسل گیا۔

''غلط..... غلط۔ مرد ہمیشہ عورت کے حسن سے خوف زدہ رہا ہے خود اعتمادی تو آخری چیز ہو سکتی ہے۔'' تمکین نے جوتے اتار کر ٹھنڈی سڑک کو اپنے پیروں کے تلوؤں سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

''بے وقوف لوگ۔'' سیرت کو جیسے بے وجہ تاؤ سا آیا تھا۔

''کس کی بات کر رہی ہو؟''

''یہی جو کہہ رہے ہیں کہ عورت کا حسن خوف زدہ کرتا ہے۔''

''تو تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' وہ اب آہستہ آہستہ بھاگنا شروع ہو گئی تھیں سڑک پر ان کا سایہ بھی ساتھ ساتھ بھاگنے لگا تھا۔

''عورت ہمیشہ مرد کے حسن سے ڈر محسوس کرتی ہے کہ کہیں اسیر نہ ہو جائے۔''

تمکین کا سایہ ساکت ہو گیا وہیں کا وہیں..... وہ جیسے ٹھٹھر گئی تھی۔ جس سوال کی پہیلی اس نے ڈالی تھی اس کا سرا کھل گیا تھا۔

سیرت نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''میں نے بہت کوشش کی مگر میں ہار گئی تمکو..... اس نے مجھے صرف خوف زدہ نہیں کیا، بے بس بھی کیا..... اسیر بھی..... پیروں میں زنجیریں ڈال دی ہیں..... تالے لگ گئے ہیں جن کی چابیاں ڈھونڈنا بھی میرے بس کی بات نہیں۔''

☆.....☆.....☆

سرخاب خان نے اپنے راستے میں کھڑی لکڑی کو بہت کوفت اور بے زاری سے دیکھا تھا کو اس کا راستہ روکے کھڑی ہوئی تھی۔

''تم جیسے بڑے گھروں کی بگڑی ہوئی امیر لڑکیوں کو میں خوب جانتا ہوں۔''

جوس کے سپ لیتی ہوئی سیرت کا ٹھکا سا لگا تھا۔ وہ اتنے زور سے ہنس رہی تھی کہ آس پاس سے گزرتی لڑکیوں کو اس کے دماغ چل جانے کا یقین سا ہوا تھا۔

''بڑا گھر اور امیر! یہ میری زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ ہو سکتا ہے۔''

وہ اس کی مسلسل ہنسی سے خائف ہوا تھا۔ کانوں کی لوویں جیسے سرخ ہونے لگی تھیں۔ پہاڑی مرد کی شرم نے اسے بہت دلکش بنا دیا تھا۔

''میں عورت کی عزت کا قائل ہوں۔ میں تمہیں پھر سے کہہ رہا ہوں کہ میرے راستے میں مت آیا کرو۔'' اس کے دوست دور کھڑے تھے۔ سفید کاٹن کے کڑکڑاتے ہوئے کرتے شلوار میں ملبوس وہ اس لڑکی پر بگڑ رہا تھا۔

''میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔'' وہ ڈٹ کر کھڑی تھی، جرنل تھامے، سر پر دوپٹہ پنوں سے ٹانکے ہوئے اور اسے مہر پوش نظروں سے گھورتی ہوئی۔ ''تمہارا صدقہ اتار رہی ہوں میں آج کل۔''

سرخاب خان نے خود کو غصے کی انتہا پر پایا تھا، اس کا لہجہ جیسے آگ اگلنے کو تیار تھا۔

''اب نہیں، تب نہیں اور کبھی نہیں..... سمجھیں..... یاد رکھنا اور میری زندگی میں کوئی اور شامل ہے، تمہاری کہیں جگہ نہیں اگلی بار تم مجھے نظر آئیں تو بہت برا ہوگا۔'' وہ دھاڑتا چنگھاڑتا رہا۔

وہ بس خالی دماغ سے اس کی سرخیوں میں ڈھلتی ہوئی اونچی ناک کو دیکھے گئی۔ بس ایک بازگشت تھی جو اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔

''میری زندگی میں کوئی اور شامل ہے۔''

سارے منظر عمارتیں، درخت، انسان آنکھوں کے سامنے بھاگنے لگے تھے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور وہ غائب دماغی سے اپنے ہاسٹل روم کے باہر کھڑی تھی، دستک دینا بھول گئی تھی۔ وہ تو اچانک کنیزاں باہر نکلی تھی تو اس نے سامنے کھڑی سیرت کو عجیب حالوں میں دیکھا تھا، بنجر چہرہ، خالی آنکھیں، اور پتھر تاثرات۔

''تم باہر کیوں کھڑی ہو؟ کیا تم ٹھیک ہو؟'' وہ اسے اندر کھینچ لائی تھی۔

وہ دھم سے کارپٹ پر گری تھی اور ہچکیوں سے سارا وجود لرزنے لگا تھا۔ کاریڈور سے لڑکیاں گزر رہی تھیں، آوازوں کے شور میں اس کی سسکیاں بھی دم توڑنے لگی تھیں۔ کنیزاں نے اسے ساتھ لگا کر تھپکنا شروع کر دیا تھا۔

''کیا ہوا سیرت! کسی نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟''

''کنیز! اس کی اونچی سرخ ناک اس کے کانوں کی لویں میں نے بہت کوشش کی نظر ہٹا لوں مگر مجھے بہت دیر ہوگئی۔ اب آنکھوں کے سامنے سے وہ شخص ہٹ ہی نہیں رہا..... سچ کہوں میں اس کا پیچھا نہیں کرتی وہ خود بخود سامنے آجاتا ہے اور جب وہ سامنے آ جاتا ہے تو صرف وہی نظر آتا ہے اربوں کی آبادی کہیں گم ہو جاتی ہے۔''

کنیز فاطمہ کا ہاتھ اپنے دل پر جا پڑا تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں ابال اٹھا تھا۔ وہ دونوں گھات میں آ گئی تھیں۔

''مجھے کہتا ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور شامل ہے..... کوئی اور کیوں شامل ہے؟ پھر میرے دل میں اللہ نے اس کی محبت کیوں زندہ رکھی ہے..... یا محبت زندہ رکھے یا سرخاب کو موت دے دے کہ مجھے صبر آ جائے۔''

کنیز فاطمہ نے آہستہ سے اپنے آپ کو پیچھے والی دیوار کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کی سرگوشی پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔

''بڑے شہروں کے بھی دانت ہوتے ہیں اور جب انہیں بھوک لگتی ہے تو یہ ہم جیسوں کے دل بھنبھوڑنے لگتے ہیں اور اس بڑے شہر نے ہم دونوں کے دلوں کو کھا لیا ہے۔''

☆.....☆.....☆

فضا میں زناٹے دار تھپڑ کی آواز گونجی تھی، سارے لوگوں نے بے ساختہ متوجہ ہو کر دیکھا تھا اور انہیں فردوس گوہر نظر آ گئی تھی جس نے اپنی کلائی پکڑنے والے موسیٰ کے چہرے پر اپنے تھپڑ کے نشانات ثبت کیے تھے۔

''اب تو تمہارا چہرہ نشانہ بنا ہے، اگلی بار میرے راستے میں آئے تو یاد رکھنا اپنی ٹانگوں پر سلامت واپس نہیں جاؤ گے، سمجھے۔''

موسیٰ ابلاغیات کا لیڈی کلر تھا جس کی زندگی ہمیشہ حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں گزری تھی اور اس نے ہمیشہ لڑکیوں کو اپنی محبت میں مبتلا گڑگڑاتے ہی دیکھا تھا مگر آج فردوس گوہر کے تھپڑ نے اس کی شخصیت کے چارم کو ایک لمحہ میں زمین کے حوالے کر دیا تھا اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ننگا ہو گیا ہو۔ وہ طیش میں فردوس کے منہ کے برابر آ گیا تھا۔

''ایک بات یاد رکھنا ہمیشہ، کہ میں تمہیں وہاں زک پہنچاؤں گا جہاں کا تم نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔ یہ میرا وعدہ تم سے سمجھیں۔'' انگلی اس کی طرف بلند کرتا ہوا منہ سے جھاگ نکالتا ہوا وہ پلٹ گیا تھا۔

پہلی بار فردوس کے اندر خوف کی لہر بلند ہوئی تھی جب تک سیرت اور تمکین پہنچیں وہ حادثہ ہو چکا تھا۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اس کے منہ لگنے کی۔''

''میں پچھلے تین ماہ سے اس کی بدتمیزیاں برداشت کر رہی ہوں آخر کب تک میں اس جیسے لفنگے کی باتیں برداشت کر سکتی ہوں۔ آج میرا بھی پیمانہ لبریز ہو گیا۔'' وہ دوبارہ جیسے طیش میں آ رہی تھی۔ تمکین نے پانی کی بوتل اس کے سامنے کی تھی۔

''اچھا چھوڑو۔ جو ہوا سو ہوا، اب سکون سے پانی پیو اور دفع کرو۔ اسے اچھا کیا تم نے جو ایک بار اسے اوقات یاد دلا دی تم نے..... بھول جاؤ تم۔''

وقت کو ہمیشہ مٹی ڈالنے کا ہنر آتا ہے کہ کوئی حادثہ، واقعہ مٹی کے سپرد کر کے وقت آگے بڑھ جاتا ہے اس واقعے پر بھی وقت نے اپنے تئیں مٹی ڈال دی تھی مگر موسیٰ کی یادداشت میں وہ ذلت روز اول کی طرح تازہ تھی۔

☆.....☆.....☆

نتاشا نے مڑ کر اس لڑکے کو دیکھا تھا جو اچانک اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے بہت اچھے سے جانتا ہو۔ کوئی بچپن کی جان پہچان ہو چہرے پر، دوستانہ مسکراہٹ سی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''میں آپ کو نہیں جانتی۔''

نتاشا نے اس لڑکے کو نظر بھر کر ضرور دیکھا تھا کو کسی امیر ایلیٹ کلاس گھرانے کا فرد دکھائی دیتا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں نک سک سے تیار اور مسحور کن کلون کی خوشبو کا حصار لیے وہ اب بھی شناسا نظروں سے اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا اور چہرے پر مسکان سجی ہوئی تھی۔

''میں تو جانتا ہوں آپ کو بہت اچھے سے۔''

''تو میں کیا کروں۔'' اس نے نظر انداز کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور نظریں سامنے گیٹ کی

طرف بڑھا دی تھیں جہاں سے فردوس نے باہر آنا تھا۔

''بس نظریں نہ چرائیں مجھ سے..... میرے دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔''

''کسی اور پر کوشش آزمائیں، مجھے ایسے الفاظ متاثر نہیں کرتے، سمجھے۔''

یونیورسٹی کے سیاہ گیٹ کے باہر شہتوت اور شیشم کے درخت تھے جن کے زرد پتے پرندوں کی چھیڑ چھاڑ سے مسلسل گر رہے تھے اور وہ اپنے بالوں سے کئی بار وہ پتے نکال چکی تھی۔

''آپ کہیں تو شاعر بن جاتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ آپ کو اب سے ہی جیتا جا سکتا ہے۔''

وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھورنے پر مجبور ہوئی تھی۔

''یہ کوئی کھیل نہیں ہو رہا کہ آپ ہار اور جیت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔''

وہ بہت ہی دلکش انداز میں مسکرایا تھا تو موتیوں جیسے دانت نظر آنے لگے تھے۔ اس نے ہاتھوں میں گلاسز تھام رکھے تھے۔ تب ہی شیشم کی چوٹیوں سے ایک زرد پتا اڑتا ہوا نتاشا ابراہیم کے بالوں میں ٹھہر گیا تھا..... وہ تھوڑا سا آگے ہوا تھا اور اس نے وہ زرد آوارہ پتا اپنی انگلیوں کی چٹکی سے پکڑ لیا اور ہاتھوں میں دبا لیا جیسے انسان دنیا جہان سے کوہ نور چھپائے پھرتا ہے۔

نتاشا ابراہیم سن سی ہو کر بس وہیں کھڑے کی کھڑی رہ گئی تھی۔

''آپ سے مل کر اچھا لگا نتاشا، جلد پھر ملیں گے۔'' وہ شخص کسی جھونکے کی طرح آن کی آن میں وہاں سے گم ہوا تھا۔ وہ ایسا ساحرانہ مسکراہٹ اور کلون کی خوشبو جیسے اب بھی وہیں تھی۔

کچھ دیر بعد ہی فردوس گیٹ سے باہر آتی ہوئی دکھائی دی تھی تو وہ اس کی طرف بڑھی تھی۔

''نتاشا! تم کب آئیں؟ اندر ہی آ جاتیں۔''

''نہیں۔ بس مجھے یہیں اچھا لگ رہا تھا۔''

وہ گاڑی کی طرف آ گئی تھیں جہاں ڈرائیور ان کا منہ کنارے منتظر تھا۔ شیشوں کے پار نہر، درخت، برج بھاگنے لگے تھے۔

''اتنی چپ چپ کیوں ہو؟''

''ناں.....نہیں۔'' وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر چپکانے لگی تھی۔

''تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا نتاشا..... میں نے ڈاکٹر طلال کے پاس جانا ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلا گئی تھی۔

کچھ ہی دیر کے فاصلے پر ڈرائیور فردوس کو ڈاکٹر طلال کے ہاں اتار کر نتاشا کو لے گیا تھا.....وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی تو چہرے پر ایک طمانیت سے بھرپور مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ وہ گھر کبھی کبھی اس کے لیے پناہ گاہ جیسا ہو جاتا تھا جہاں وہ اپنے آپ کو بہت محفوظ تصور کیا کرتی تھی۔

فردوس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی تھی۔ ڈاکٹر طلال نے اسے خوش آمدید کہا تھا اور پھر وہ ہمیشہ کی طرح پورے کانوں سے متوجہ ہو کر سامنے بیٹھی اس لڑکی کو سننے لگے تھے جس کے چہرے پر آج نئی قسم کی مسکراہٹ تھی جو اتنے سالوں میں پہلی بار نظر آئی تھی۔

''انسان کیوں اصل سے بھاگتا ہے؟ فریب میں کچھ لمحوں کے لیے پناہ تو مل سکتی ہے مگر سکون کبھی بھی نہیں ملتا ڈاکٹر طلال..... مجھے پتا چل گیا ہے کہ میرا اصل کیا ہے اب میں اور دنیا کے سہارے زندگی نہیں جی سکتی.....''

ڈاکٹر طلال اس عرصے میں چائے کے دو کپ بنا کر سامنے رکھ چکے تھے کپوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

''میں نے کہا تھا ناں فردوس۔ کہ اللہ کی حکمتوں کے آگے سر جھکانے سے ہی کامیابی ملتی ہے اور ہر چیز کو سمجھنے کی عمر ہوتی ہے۔ آپ کو کوئی ادار کوئی استاد تب تک وہ سبق نہیں سکھا سکتا جب تک کہ شاگرد کی سمجھ کی عمر نہ ہو جائے.....اور پھر یہاں تو تمہیں استاد کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔''

''ایسی بات نہیں ہے ڈاکٹر! میری زندگی سنوارنے میں آپ کا بہت ہاتھ ہے، چاہے آپ یہ تسلیم کریں یا نہ کریں۔''

''تم نے کیا سوچا ہے کہ تم ان کے جیسی زندگی گزارو گی؟''

کپ کے کناروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اپنی نئی نویلی مسکراہٹ سے خود کو آراستہ کیے ہوئے پرسکون لگ رہی تھی۔

''میں اب خواب دیکھوں گی..... بہت بڑے خواب..... پھر میں ان کو حقیقت تک لے جانے کے لیے عمر لگا دوں گی..... میرے خواب بہت اونچے اور سچے ہوں گے..... میں آج کل ہمت اور حوصلے کی سیڑھی تیار کر رہی ہوں جس دن میری سیڑھیاں تیار ہو گئیں میں سفر شروع کر دوں گی۔'' وہ آدھی چائے کپ میں ہی چھوڑ کر اٹھ گئی تھی مگر اب بھی جیسے وہ سامنے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر طلال کو حیرت ہوئی تھی کہ فردوس نے اپنا وجود حاضر غائب کرنا سیکھ لیا تھا۔ چائے کے کپوں کی بھاپ دم توڑنے لگی تھی۔

وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر رہی تھی جب وہ اچانک سامنے آ گیا تھا۔ اب کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو شناسائی کا کوئی اشارہ نہ دیتے۔

''کیسے ہو خلیل؟'' وہ سنبھل کر بول رہی تھی وہ سامنے بس آ کر بازو باندھے کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں بہت کم لوگوں سے متاثر ہوتا ہوں۔ کیونکہ لوگوں کے پاس ایک جیسی خصوصیات ہوتی ہیں، وہی جو مدتوں سے چلی آ رہی ہوتی ہیں۔ کسی بھی انسان نے آج تک مجھے گنگ نہیں کیا..... شاک میں مبتلا نہیں کیا مگر.....'' پنسل ہیل پر مضبوطی سے جم کر کھڑی وہ لڑکی خلیل کو بہت اونچی لگی تھی جسے وہ سر اٹھا کر دیکھنے پر خود کو مجبور پا رہا تھا۔

''مگر؟'' گھنی پلکیں خلیل کی طرف اٹھی تھیں۔

''مگر تم نے مجھے گنگ کر دیا..... شاک میں مبتلا کر دیا فردوس گوہر۔''

وہ لمحہ آیا اور کسی آندھی کے آوارہ گولے کی طرح سب اڑانے کے درپے ہونے لگا تھا۔ فردوس نے خود کو بمشکل روکا تھا۔ سامنے کھڑا شخص تو اسے بہت عزیز تھا، وہ خود اسے دیکھ کر گنگ ہوتی تھی۔ جانے کیسا جادو آتا تھا اسے کہ وہ پلک تک نہ جھپک سکتی تھی۔

''جلد میں، تم اور عدن مووی دیکھنے جائیں گے۔'' وہ عدن کو مورل سپورٹ سمجھتی ہوئی وہاں سے کھسکنے کو تھی۔

''مجھے جلدی ہے میں چلتی ہوں۔''

خلیل نے اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا تھا کیوٹکس سے سجے خوب صورت ناخن، لمبے گھنے

کندھوں پر ڈھلکتے ہوئے بال اور ایک نسوانی خوشبو جو بھرپور اگلے پر اثر انداز ہوتی تھی۔

فردوس اسے کنارے پر کرتی پورچ پار کر رہی تھی جب پیچھے سے خلیل نے جادو کیا تھا۔

''سنو فردوس؟''

وہ نا چاہتے ہوئے بھی پلٹ گئی تھی۔

''مجھے تمہارا راز پتا چل گیا ہے۔''

وہ گھر جہاں کی فضا سے اسے عشق تھا اور مکینوں سے بھی وہ پیار کرتی تھی، وہ گھٹن کا شکار ہونے لگی تھی۔

''پنسل ہیل کی نوک پر اس کے وجود کا وزن لرزنے لگا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ریشمی ہو اور کوئی آوارہ مزاج لڑکا اس کے چہرے پر تھوک کر، استہزائیہ قہقہہ لگا گیا ہو۔ وہ پورے قد سے جیسے پھر سے زمین بوس ہو گئی تھی۔ پوری شان و شوکت سمیت..... ہر بار زخموں کے ٹانکے نئے سرے سے ادھڑتے تھے۔ سامنے کھڑے شخص نے اس کے سارے کھرنڈ چاک کر دیے تھے۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں لتا منگیشکر کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ تینوں اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ اماں رضائیوں کے لحاف سینے کے بعد تھک ہار کر سو گئی تھیں۔ نیلم کوئی شیفون اور سلک کا کپڑا بازار سے لے آئی تھی اور اب کٹ پیس پھیلائے کوئی جگاڑ لگانے کو ترکیبیں لڑا رہی تھی۔

''شرارہ بنانے میں کتنا کپڑا لگے گا؟ اس نے نتاشا سے جیسے اہم مسئلے کے حل کے لیے رائے طلب کی تھی۔

''مجھے نہیں پتا، میں کوئی درزن تھوڑی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب اپنے شادی کے کپڑے تم خود ہی بناؤ گی سمجھیں۔'' وہ اسے دھمکی دے کر پھر سے اپنے حساب کتاب میں الجھ گئی تھی۔

نتاشا کی نظریں باجی کی کھوج میں اٹھی تھیں اور وہ کاپیوں کو سامنے پھیلائے موبائل ہاتھ میں

تھامے ٹیکسٹ میسجز میں مصروف مسکرا رہی تھیں۔

''رشتہ ہونے کے بعد کتنی خوش دکھائی دیتی ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔'' وہ انہیں دعا دے گئی تھی۔

کچھ دیر دیواروں کو گھورنے کے بعد وہ کھڑکی کی طرف آ گئی تھی۔ کھڑکیوں کے باہر جیسے ایک نیا جہان کھل جاتا تھا سب کی مصروف زندگی اس کو بہت دلچسپ لگتی تھی تو وہ صدیوں بھی یوں ہی کھڑے کھڑے مزے سے گزار سکتی تھی۔ تب ہی ہاتھ میں سیل تھامے موبائل کی گھنٹی بجی تھی تو اس نے کان سے لگایا تھا۔

''ہیلو کون؟'' وہ اب بھی بال کے پیچھے چھتوں پر بھاگتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میں ہوں۔'' دوسری طرف سے کوئی جانی پہچانی سی آواز گونجی تھی۔

''سوری، میں نے پہچانا نہیں۔''

''اک دوست کچا پکا سا۔'' وہ دوسری طرف سے مسکرایا تھا۔

وہ جیسے اب بھی سیاہ گیٹ کے سامنے چوٹیوں سے گرتے زرد پتوں تلے کھڑی تھی۔

''تم نے مجھے کال کیوں کی؟ نمبر کہاں سے ملا؟'' وہ غیر ارادی طور پر اس سے بات کر رہی تھی مگر اس کی آنکھیں اب بھی چھتوں پر ہونے والی سرگرمیوں پر ہی تھیں جہاں کچھ دکان دار طبلے بنا رہے تھے اور کبھی طبلے کی تھاپ سے ایک گونج پیدا ہوتی تھی اور جنگلی کبوتر ایک جھنڈ کی طرح آسمان کی طرف چھیڑ چھیڑ کر کے اڑتے تھے۔

''محبت سے زیادہ بھی بڑی کوئی وجہ ہو سکتی ہے کیا؟'' وہ سوال جواب کا کھیل شروع کرنے لگا تھا۔

اب وہ یوں ہی بے فائدہ سی ہنسی ہنس دی تھی۔

''ہاں ایک اور وجہ بھی ہوتی ہے۔''

وہ دوسری طرف سے جیسے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ ''تو بتاؤ محبت کے علاوہ کون سی بڑی وجہ ہو سکتی ہے؟''

طبلے کی تھاپ جیسے چاروں طرف سے بلند ہونے لگی تھی۔

''نفرت۔''

وہ ایک لفظ موسیٰ کو کسی چابک کی طرح لگا تھا۔ وہ ایک پل کو خاموش ہوا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو میں تو تم سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ پھر سے پہلے والے روپ میں آنے لگا تھا۔

نتاشا ابراہیم کو پتا بھی نہیں چلا کہ جس فون کال کو وہ دو منٹ کے دورانیے کے بعد کاٹ دینے کا فیصلہ کر رہی تھی وہ کال پندرہ منٹ کے دورانیے میں چپکے سے داخل ہو گئی تھی۔

یوں ہی ہوتا ہے..... کسی بڑے حادثے کے پیچھے بہت چھوٹی وجوہات کے سلسلے ہوتے ہیں۔ کاش! طبلوں کی زہریلی تھاپ والی سہ پہر نتاشا اپنی زبان کے اس ایک لفظ ''نفرت'' پر یقین کر لیتی مگر وہ بھی بس اچانک یوں ہی سے ایک لمحے کا شکار ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

عدن کے کئی بار کے اصرار اور منت سماجت کے بعد وہ موووی دیکھنے پر راضی ہوئی تھی۔ وہ گہری سیاہ شام تھی جس کے آسمان پر کوئی تارا کوئی چاند نہیں تھا۔ وہ دونوں شیشے اور لکڑی سے بنے اس گھر کے دروازے کے باہر گاڑی میں اس کے منتظر تھے۔ سیاہ رات کی تاریکی میں کب وہ سیاہ لباس میں ملبوس گاڑی کے شیشے کو اپنے ناخن سے بجانے لگی تھی۔ وہ دونوں نہیں دیکھ سکے تھے۔

عدن فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی اور خلیل ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا جب فردوس نے پیچھے کا دروازہ کھولا تو عدن جبار بھی اتر کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی تھی جس پر خلیل نے برا منہ بنایا تھا۔

''مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں تم دونوں کا ڈرائیور ہوں؟''

عدن نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر مکا جڑا تھا۔

''خیر، آج تو تم ہمارے ڈرائیور کے عہدے پر فائز ہو۔''

وہ گاڑی کی زرد روشنی میں شیشے میں پیچھے بیٹھی فردوس کو دیکھ رہا تھا جو عدن کی کسی بات کا جواب دے رہی تھی۔

''میں خود حیران ہوں کہ جانے کنیز اور سیرت کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے کیونکہ وہ دونوں ہی مجھے بہت ڈسٹرب لگ رہی ہیں کچھ عرصے سے۔''

''تم نے تمکین سے پوچھنا تھا ناں۔'' عدن نے اسے مشورہ دیا تھا۔

''میں تمکین کو بھی کنارے پر کر کے پوچھ چکی ہوں کہ تم لوگ روم میٹ بھی ہو تو کیا وجہ ہے، اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ ہم مل کر حل کر لیں گے۔ مگر اس نے بی کہا کہ شاید وہ مڈز کو لے کر پریشان ہیں۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ وجہ ہوگی، مگر ہم کوشش کریں گے کہ یونیورسٹی کے باہر کوئی گیدرنگ رکھیں اور ان سے صاف صاف بات کریں یار۔ دوست اسی لیے تو ہوتے ہیں کہ ان سے ہر مسئلہ، ہر پریشانی بلا جھجک شیئر کر لی جائے۔''

عدن کی بات پر خلیل نے شیشے کو سیٹ کرتے ہوئے فردوس کو اپنی نظروں کے فوکس میں رکھا تھا۔

''عدن ٹھیک کہہ رہی ہے دوست اسی لیے تو ہوتے ہیں کہ ان سے پریشانیاں بانٹ لی جائیں۔''

وہ ایک دم سے نظریں چرا گئی تھی..... وہ شخص کیوں کرتا تھا ایسے کہ اسے بالکل زمین بوس کر دیتا تھا، وہ اس کے سامنے ٹھہر نہیں پاتی تھیں۔ نظریں وہاں سے ہٹ کر اپنی گود میں رکھے عدن کے ہاتھوں پر پڑی تھیں۔

وہ دونوں ہمیشہ ہی اسے اپنے دل کے قریب لگے تھے تب بھی جب وہ ان دونوں سے ناواقف تھی۔

وہ کچھ سوچ کر ہنسی تھی۔ جب نتاشا سے وہ بات کرتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

''میرا دل کرے تو میں خلیل طلال بن جاؤں..... یا پھر عدن جبار ہو جاؤں۔''

اور آج جب وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ آئی تھی تو وہ دنیا کو خود ببانگ دہل کہہ سکتی تھی۔

''میں فردوس گوہر ہوں اور میں یہی بنے رہنا چاہتی ہوں اور بس۔''

پھر اور بس کے بعد تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ سچائی شروع ہو جاتی ہے۔ خود شناسی سے بڑھ کر کچھ قیمتی نہیں ہوتا!

وہ رات فردوس گوہر کی زندگی کی سب سے خوب صورت راتوں میں اسے ایک تھی جب اس نے وقت کا ایک ایک سیکنڈ بہت اطمینان سے گزارا تھا۔ مووی دیکھتے ہوئے، ہال میں پاپ کارن کھاتے ہوئے اس کے کندھے پر رکھا ہوا عدن جبار کا تھکن سے نڈھال وجود اسے اپنے آپ میں اعزاز لگا تھا۔ اس کے گلاس میں کولڈ ڈرنگ انڈیلتا ہوا خلیل بھی اسے اپنے دل کے پاس بہت پاس

محسوس ہوتا تھا۔

تو وہ ایک نارمل زندگی گزارنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ وہ کوئی شودر، اچھوت نہیں تھی کہ جس کے ساتھ رزق الگ کر لیا جائے۔ جس کے لمس سے دور ہوا جائے۔

وہ جان گئی تھی کہ اس کا ''اصل'' ہی اس کا سب کچھ ہے، کیونکہ پردے اور فریب تو صرف دھوکا ہوتے ہیں.....!

☆.....☆.....☆

اماں نے ہمیشہ ہی شام ہونے سے پہلے سونے سے منع کیا تھا بقول ان کے شام سے جوان لڑکیوں کو چادر لے کر منہ سر لپیٹ کر نہیں سونا چاہیے۔ اور یہ بات بختاور نے پلو سے باندھ لی تھی۔ وہ خود شام کی نیند سے خوف کھاتی تھی۔ چاہے سر درد سے پھٹ ہی رہا ہوتا، وہ تب بھی چارپائی پر بس بیٹھی رہتی تھی، مگر آج وہ جانے کتنے دنوں سے شام سے چادر لے کر سو جاتی تھی۔ اماں کو اس کے اس طرح سونے سے ڈر لگتا تھا دل ہول ہول سا جاتا اور یوں لگتا کہ جیسے ابھی شام کی آندھی آئے گی اور سب کچھ بہا کر لے جائے گی۔ مال، مویشی، مسکان اور انسانوں کو بھی۔ اور پیچھے بنجر گھاٹیاں چھوڑ جائے گی جن کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اماں جیسے کسی خوف کے زیر سایہ بختاور کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی تھیں۔

''بختاور، بختاور۔'' انہوں نے اس کے پیر کے انگوٹھے کو پکڑ کر جیسے اس کے زندہ ہونے کی یقین دہانی کی تھی۔

''اٹھ جا، کب سے سو رہی ہے۔ دیکھ تو دودھ بھی ویسے کا ویسے پڑا ہے اور دودھ پہ بھی کوئی کپڑا نہیں ڈالا۔'' اماں کی تیسری چوتھی آواز پر آہستہ سے بختاور نے اپنے اوپر سے چادر ہٹائی تھی۔ اور ماں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں کہ گلابی آسمان سے کہیں زیادہ گلابی بختاور کی آنکھیں ہو رہی تھیں۔ وہ سسکتی ہوئی سیدھی چارپائی پر اٹھ بیٹھی تھی اور اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سسک کر رو رہی تھی۔

''اماں! اللہ کا واسطہ میں سچ کہہ رہی ہوں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آپ نے اور ابا نے مجھے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ پلیز، خدا کے واسطے، ایسا ظلم مت کریں۔ یہ صرف میرے ہی ساتھ نہیں

اس کے ساتھ بھی ظلم ہے۔اماں میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتی ہوں، میں یہ نہیں کر پاؤں گی۔"

اور اماں بس اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ان کی آنکھوں سے بھی آنسو موتی کی طرح بہنے لگ گئے تھے۔

"بختاور! اب جو کچھ بھی ہے تو ہی سنبھال سکتی ہے۔ ہمارے گھر کی، پورے خاندان کی عزت اب تیرے ہاتھ میں ہے۔ تیرے علاوہ ایسا کوئی نہیں کر سکتا میری دھی، بس اپنے باپ کی لاج رکھ لے۔اس گھر کی عزت اب تیرے اتھ میں ہے ورنہ اس نے تو ہماری عزت کو نیلام کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔"

"مگر اماں! ایسے کیسے؟ سکندر مجھ سے نہیں، کنیزاں سے پیار کرتا ہے۔ کیسے میں اس کے کھونٹے سے بندھ جاؤں؟ اس نے اسی کے لیے گھر بنایا۔اس کے دل میں وہی ہے۔ ساری زندگی وہ اس کے ساتھ شادی کے خواب دیکھتا رہا ہے اور آخر میں آپ مجھے اس کی سیج پہ بٹھانے لگے ہیں۔ یہ بہت غلط بات ہے، آپ اور ابا آگے کا سوچیں۔"

کنیزاں جاتے جاتے جیسے اسے ہی وار پر چڑھا کر چلی گئی تھی۔ بختاور اپنا چیتھڑے چیتھڑے وجود لیے لٹی پٹی ہوئی سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

چچی کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی تھی۔ان کے گردوں کا ڈائیلاسز ہو رہا تھا اور انہوں نے ابا کو بلاوے کا پیغام بھجوایا تھا کہ وہ سکندر کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتی تھیں۔ابا جہاں کے تہاں رہ گئے تھے۔

"مگر اتنی جلدی کیسے ہوگا سب کچھ؟"

"سب ہو جائے گا بھائی صاحب! بس مجے اب سکندر کی خوشی دیکھنی ہے تب ہی سکون سے دنیا چھوڑ پاؤں گی۔"

سکندر خود بھی چپ چاپ بیٹھا رہ گیا تھا شاید کہنے کو کچھ بھی اس کے پلے میں نہیں تھا۔وہ کیسے کہہ دیتا کہ جانے والی ایسی ریت کے ٹیلوں تلے دبا کر ہی گئی تھی۔

وہ تینوں چولہے کے گرد سکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔سرخ انگاروں کی حدت بھی کوئی سکون نہیں پہنچا رہی تھی۔ بختاور نے کنیزاں کو کال ملائی تھی اور کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جیسے پوچھا تھا۔

"تم واپس کب آ رہی ہو؟"

بختاور کا وہ جملہ جیسے کنیزاں کو ہوشیار کر گیا تھا۔

''کیا مطلب، کب آ رہی ہو؟ ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے تو میں یہاں آئی ہوں تو واپسی کی بات کیوں کر رہی ہو؟''

''چاچی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں ہی سکندر کی خوشیاں دیکھ لیں تو ابا اور ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہارا اور سکندر کا نکاح اسی اگلے ہفتے کر دیتے ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم، دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟''

لاؤڈ اسپیکر سے ابھرتی وہ بغاوت بھری آواز جیسے ان تینوں پر صور اسرافیل پھونک گئی تھی۔ اماں نے لرزنا شروع کر دیا تھا اور انہوں نے فون جھپٹ کر لے لیا تھا۔

''میری بات سن غور سے۔ میں تجھے اپنے دودھ کا واسطہ دیتی ہوں۔ اگلے ہفتے ہم نے تجھے سکندر کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ وہ نمانی وہاں پڑی ہے اکیلے گھر میں۔ سب کچھ تیرے لیے بنایا گیا ہے اور تو ہے کہ شہر میں بیٹھی ہے۔ اس وقت ہمارے گھر کو اور ہمارے خاندان کو تیری ضرورت ہے بس تو گاڑی پکڑ اور اگلے ہفتے پہنچ جا، ادھر جو باقی تیاریاں رہتی ہیں وہ مل کر کر لینا۔ بیمار کو اور اذیت میں مبتلا نہیں کرتے۔''

اماں کی آواز نے جیسے اس کے زخموں پر نمک چھڑکنا شروع کر دیا تھا، وہ شل ہو کر رہ گئی تھی۔

''اماں! کوئی بیمار ہوتا ہے یا نہیں، میں آپ سے اور ابا سے سب سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے سکندر سے شادی نہیں کرنی تو نہیں کرنی۔ آپ مجھے زبردستی کے کھونٹے سے کیوں باندھ رہے ہیں؟'' وہ طیش میں آ گئی تھی۔ اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

ہاسٹل کی چھت پر ادھر ادھر واک کرتی ہوئی کافی لڑکیاں جیسے رک کر اسے دیکھنے لگی تھیں جسے اس کی پروا نہیں تھی۔

''ساری زندگی میں نے اپنی زندگی میں اس مقام پر پہنچنے میں اتنی مدتیں لگائی ہیں اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اس انسان کے ساتھ بندھ کر رہ جاؤں۔ خدا کے واسطے اس بات کا تو خیال رکھیں کہ مجھ میں اور اس میں کتنا فرق ہے؟''

''تو فرق بتائے گی ہمیں۔ تو جانتی ہے میں ماں ہوں تیری۔ ارے، میں تو تجھے اور سکندر کو ایک پلڑے پر تولوں تو خاک برابر بھی تیرا وزن نہ نکلے۔''

کنیزاں فاطمہ رونے لگ گئی تھی، ابا نے اماں سے فون لے لیا تھا۔

''کنیزاں! ہماری عزت کا معاملہ ہے۔ میں چاہتا ہوں اور میں تم سے یہ توقع کر رکھتا ہوں کہ اگلے ہفتے تم آجاؤ بس، کہ اس کے علاوہ مجھے کسی بحث میں نہیں پڑنا۔''

اور پھر فون کال کاٹ دی گئی تھی۔ وہ خالی ہاتھ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی جو قطبی ستارے سے خالی تھا جو راستہ دکھاتا ہے۔ منزل تک چھوڑ جاتا ہے۔

ابا نے جیسے اپنی بات سن کر فون بند کر دیا تھا۔ وہ جیسے کسی سناٹے کی کیفیت میں تھی، کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ جس کو دیکھ کر کوئی بھی جذبہ نہیں ابھرتا تھا۔

جس طرح کی زندگی اس نے دیکھی تھی اس حوالے سکندر اس کا کبھی بھی آئیڈیل نہیں رہا تھا۔ جس شخصیت پرستی کی وہ قائل ہو چکی تھی اور آس پاس کے انسانوں کو اس نے دیکھا تو اس کی نظر میں جیسے سکندر تو کچھ تھا ہی نہیں۔ چاہے وہ کچھ بھی بن جاتا مگر وہ کبھی بھی آئیڈیل شخص نہ بنتا جس سے وہ اپنی آگے کی زندگی شروع کرتی.....!

جب وہ اپنے نشان اور قطبی ستارہ کھو چکی تھی تو بھٹکے ہوئے راستے میں اس کے سامنے وہ ہر بار آ جاتا تھا جس سے وہ سو بار جان چھڑایا کرتی تھی۔

☆.....☆.....☆

''آج کل میری زندگی میں بہت کچھ مشکل چل رہا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تم میرے ہاتھوں قتل ہو جاؤ۔ پلیز، اللہ کے واسطے میرے راستوں میں مت آیا کرو۔''

آدم نے جیسے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''تم دنیا جہان کا غصہ مجھ پر کیسے نکال سکتی ہو؟''

''تو تم بھی دنیا جہان کو چھوڑ کر میرے سامنے کیسے آ سکتے ہو۔ اپنا راستہ ناپو اور جاؤ، سمجھے۔''

وہ کبھی بھی راستہ ناپ کر نہیں جاتا تھا بس وہ اولڈ کیمپس کی بسیں بدل بدل کر اس کے راستے میں

http://kitaabghar.com

آجاتا تھا۔اس نے وہ سارے راستے حفظ کر لیے تھے جن سے وہ گزرتی تھی۔

تعلق کبھی بھی نظر انداز نہیں کیے جاتے۔ خاص طور پر تب جب وہ مسلسل آپ کے آگے نظر آئیں رستے کاٹتے.....آپ کو کنارے پر کر کے.....اپنا آپ پیش کر کے.....وہ بھی تھک گئی تھی،ٹوٹ گئی تھی جیسے کسی مضبوط چھت کا شہتیر ٹوٹتا ہے تو ساری چھت دھڑام سے زمین پر آجاتی ہے۔

''میں رنگوں کی زبان سمجھتا ہوں۔تم مجھے رنگوں کی زبان جیسی لگتی ہو، کچھ کچھ زعفرانی سی.....کبھی کبھار کاسنی سی.....اور بہت دفعہ آسمانی سی.....آرٹسٹ آرٹ کے پیچھے لپکتا ہے اور تم مجھ سے یہ توقع مت رکھو کہ میں تمہارے علاوہ کہیں اور دیکھوں۔''

آدم علی کے لہجے سے جیسے قوس وقزح کے سات رنگوں کی بوچھاڑ کنیزاں پر گری تھی۔اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھ رہی تھی۔

''میں زندگی میں ناانصافی کی کبھی قائل نہیں رہی اور میں منافق بھی نہیں۔مگر میں تمہیں ایک سچ بتاؤں میں تھل کی وہ لڑکی ہوں جسے دیکھ کر باقی پیچھے رہنے والیاں سبق حاصل کریں گی۔میرے ماں باپ نے آخر مجھ سے میری سارے سفر کی کامیابیوں کا خراج وصول کرنے کی بات کی ہے۔مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس راستے پر چلوں۔تم مجھے بتاؤ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم کیا کرتے؟''

''میں ہمیشہ اپنے دل کی سنتا کنیزاں، کہ میرا دل کیا کہہ رہا ہے انسان دل کی سنے تو وہ بہت سے پچھاووں سے بچ جاتا ہے۔''

کنیزاں نے صرف یہی سوچا تھا اگر میں سامنے بیٹھے شخص کو اپنے دل کی بتادوں تو آگے کیا ہو گا؟زندگی اس کے ساتھ چھپن چھپائی کھیل رہی تھی۔

''اولڈ کیمپس سے اتنی بسیں بدل کر یہاں آتے ہو، تھکتے نہیں ہو تم؟'' وہ بہت سہولت سے موضوع کو بدل گئی تھی۔آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتے ہوئے جیسے انہیں آس پاس کے ہجوم کی کوئی بھی پروا نہیں تھی۔فیصل آڈیٹوریم کی نیلی بلڈنگ کا سایہ ان دونوں پر پڑ رہا تھا۔کبھی وہ چھاؤں اور کبھی دھوپ کے پہرے میں چلے جاتے تھے۔

''دیکھ لو، یہی بات ہے۔میں بھی اس معاملے میں بہت مجبور ہوں۔میں نہیں جانتا کہ تم مجھے کیا

سمجھو یا کچھ بھی کہو مگر میں نے زندگی میں تمہارے علاوہ کسی سے محبت نہیں کی۔ محبت میرے لیے ایک لفظ تھا زندگی میں، میں صرف مشاہدات پر چلتا رہا۔ لیکن مجھے تجربہ ہوا ہے تو میری تصویر اور رنگوں کی زبان بدلنے لگی ہے۔ اب آ کر مجھے زندگی کے ایک حصے میں احساس ہوا ہے کہ اصل اثاثہ کیا ہوتا ہے۔"

"تم باتیں بہت اچھی بنا لیتے ہو۔"

"لیکن میں جھوٹ نہیں کہتا۔"

وہ پگھلنے لگی تھی..... ساتھ ساتھ چلتا ہوا شخص جس کے بالوں میں ایک برش پھنسا ہوا تھا اور وہ اپنی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کتنے مطمئن انداز میں چل رہا تھا جیسے یوں ہی وہ اس کے ساتھ ساری دنیا گھوم لے گا۔ وہ اپنے اور اس کے سائے کو دیکھتی رہی۔ اور اس نے اگلے ہفتے گھر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ریت کے ٹیلوں کو اپنا نصیب نہیں بننے دے گی۔

وقت گزرتا گیا اور تھل واسیوں کی آنکھیں انتظار نے بنجر کر دیں۔ کنیزاں فاطمہ نے نہیں آنا تھا اور وہ نہیں آئی تھی۔ وہ چودھویں کے چاند سے سجی ہوئی مکمل رات تھی۔ جب ہاسٹل گیلری میں بیٹھی ہوئی کنیزاں کے موبائل پر نوٹی فکیشن آیا تھا۔ اس نے لاپروائی سے کھولا تھا اور سامنے وہ تصویر آئی تھی۔ جس نے زندہ کنیزاں فاطمہ کو مردہ کر دیا تھا۔

سامنے ہی تصویر میں دلہن بنی بختاور سکندر کے ساتھ نظر آئی تھی۔ دونوں دولہا دلہن کے چہرے پر بس ایک ہی تاثر تھا۔ تباہی کا..... بربادی کا..... اور قیامت کا.....!

بختاور اپنے خاندان کی عزت پر قربان ہو گئی تھی۔

شہر عجائبات کی ہر شے عجب
گمشدہ ہے روح اور ہر جسم ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

باب سیزدہم

تلاش گمشدہ

چانن دی پھلکاری، تروپا کون بھرے؟
امبر دے اک آلہے سورج بال دیاں
من دی اُچی ممٹی، دیوا کون دھرے؟
امبر گنگا ھوندی، گاگر بھر دیندی
درداں دا دریا، اوہ کیہڑا گھٹ بھرے
ایہہ جو سانوں اک راکھویں دے چلیوں
دل دی بکل بلدی، چنڑگاں کون جرے؟
اپنے ولوں ساری با مکا بیٹھے
ھالے دی اک سوکا تیری کل کرے
چانن دی پھلکاری، تروپا کون بھرے

وقت کو بھاگنے کی بہت جلدی ہوتی ہے بس یہ دوڑتا ہے اور اس کی دوڑ میں انسان گر کر ہانپنے لگتے ہیں، مگر وقت کو رتی بھر بھی پروا نہیں ہوتی۔ وہ صرف ختم ہونے آیا ہے کہیں گھڑی کی سوئیاں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ کہیں انسان بکھر جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

ریزہ ریزہ ہو کر باؤلی ہو جانے والی کنیزاں کو وہ دونوں تھام رہی تھیں جس کی آنکھیں سامنے تصویر دیکھ کر پتھر تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے موبائل پرے اچھال دیا تھا۔ وہ کوئی گجھٹ نہیں تھا ایک کالے ڈنک والا بچھو تھا جس نے اسے ڈس لیا تھا۔

گوٹے کناری والے سرخ لباس میں کئی من کا بوجھ خود پر لادے وہ دلہن اس کی بہن تھی۔ جس کی شاید زندگی کا مقصد ہی کنیزاں کا جہیز اکٹھا کرنا تھا۔ صدیوں کا سفر تھا جو اس نے طے کر لیا تھا۔ جس نے تروپے سلائیاں کر کر کنیزاں کے لیے بہت کچھ جوڑ لیا تھا اور آج اس کے کرم فقط اسی کے ہی کام آ گئے تھے۔

کنیزاں کو لگا تھا سب کچھ اس پر ہنس رہا ہو، یہ جیت تھی یا مات جو اس جمع تفریق سے پرے تھی۔ اس کے سامنے بس دو چہرے تھے جو ہرگز بھی کسی خوبرو دولہے اور الہڑ دلہن کے چہرے نہیں تھے۔

واں قیامت تھی لٹے پٹے آثار تھے۔ وہ تصور میں بختاور کی آنکھوں کے بھاری پپوٹے تک دیکھ چکی تھی اور ضبط کی آخری حد تک پہنچا ہوا وہ اونٹوں کی باگ تھامنے والا شخص سکندر جس نے اپنے ہونٹ صبر سے چبا ڈالے تھے۔

تھل میں ہوائیں راکھ اڑتی رہی تھیں۔ شرینہہ جڑوں سمیت زمین پر تھے۔

اماں اور ابا نے بختاور کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی پلکوں کے ساتھ اپنے تن پر بانگے کی اترن کو دیکھتی رہی تھی۔ ٹرنک پیٹیاں، کھجور کی چنگیریں، اسٹیل کی پراتیں، شہنیل کی رضائیاں سب کچھ اترن تھا، کسی او کے حصے کا۔ چیزوں کا کیا ہے انسان لین دین کر ہی لیتا ہے مگر انسانوں کے لین دین صرف اور صرف خسارے ہیں۔

سکندر کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ بس وہ چپ کا لباس اوڑھ کر اس پکے گھر میں آ گئی تھی جہاں تھل کی ہوا فرصت سے چلا کرتی تھی۔ دھریک کی پتیاں سرسراتی رہیں..... رابیل کے سفید پھول اندھی رات میں بھی چمک رہے تھے اور ان کی مہک کم ہونے کا نام تک نہیں لیتی تھی۔

وہ پلنگ پر بیٹھی باہر کے شور کو سنتی رہی دور کہیں گیدڑ رو رہے تھے۔ کھٹ سے دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر داخل ہوا تھا۔ کمرے کی زرد روشنی میں نہایا ہوا وہ سکندر تھا جس کو ہمیشہ اس نے کنیزاں کے نام پر چھیڑا تھا۔

''میں جانتی ہوں جو ہوا.....'' وہ وہیں رک گئی تھی۔

سفید کاٹن کے لباس میں تھکا ہوا سا وہ نڈھال دکھائی دیتا تھا۔ سارے دن میں کام نمٹانے کے علاوہ اسے محبت کی مار پڑی تھی جس کے نیل تن من پر نشان چھوڑ گئے تھے۔ سامنے بیٹھی بختاور کی چوڑیوں کی گھن گھن پر وہ چونکا تھا۔

''مجھے نہیں پتا تھا، کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ وہ تو سچ میں بالکل باغی نکلی۔ اس نے ہم دونوں کو سولی پر چڑھا دیا۔'' گٹھڑی بنی دلن موروں کی طرح کرلائی تھی۔

باہر رات بھیگ رہی تھی۔

بختاور نے خود کو صبر سے کھڑا کیا تھا اور آہستہ آہستہ زیور سے نجات حاصل کی تھی اس سب سے جیسے ہی وہ فارغ ہوئی تھی اس نے سامنے صوفے پر سکندر کو نڈھال کر دیا تھا جیسے وہیں لیٹے لیٹے وہ سو گیا ہو۔

مہندی کے بوٹے اس کی ہتھیلیوں پر انگاروں کی طرح سلگ رہے تھے، شانوں نے اسے، مہندی سے نقش و نگار بناتے ہوئے کتنے یقین سے کہا تھا۔

''یہی جنڈری ہے۔ انسان جو سوچتا ہے وہ کبھی بھی نہیں ہوتا، بس خدا کی اپنی مرضیاں ہوتی ہیں۔ جس کی جھولی میں جو ڈال دے انسانوں کو بس اس پر صبر کر لینا چاہیے۔''

میں نے سکندر کو ہمیشہ کنیزاں کے ساتھ دیکھا ہے۔'' وہ سسکی تھی۔

''اب شیشے میں تم دونوں صرف اپنے آپ کو دیکھو گے۔ یہ محبتیں اور عشق وقتی ہوتے ہیں۔ انسان بے وقوف ہوتا ہے اس جھانسے میں آ جاتا ہے۔ میں بھی ایک بار محبت شاہ کے میلے پر ایک دیوانے سے ملی تھی۔ مجھے لگا تھا وہ نہ ملا تو کہیں مر مرا جاؤں گی اور میرا مزار بھی تھل کے کسی ٹیلے پر بنے گا۔ مگر آج دیکھو محبت شاہ کا میلہ ہے اور میں اپنے شوہر کی سانسوں کی دعا کرتی ہوں۔ نکاح کے بولوں پر تف نہیں کرتے بختاورے۔''

شانو کی آواز رات کے سنگیت کی طرح پھیل رہی تھی۔ وہ سامنے سانسوں کے شور میں لیٹے سکندر کو دیکھے گی بس یونہی پتا بھی نہیں چلا تھا کہ آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

اس کے بوٹ ابھی تک پیروں میں تھے وہ تھک کر گرا تھا۔ وہ ہولے ہولے سے پاس پہنچی تھی

اور اسے حدت کا احساس ہوا تھا وہ بخار میں تڑپ رہا تھا، بخاور کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ وہ غنودگی میں تھا جب اسے لگا کوئی دھیرے دھیرے اس کے پیروں سے جوتے اتار رہا ہے۔

وہ اس کے پاؤں آزاد کر کے باورچی خانے میں آ گئی تھی۔ دودھ کاڑھتے ہوئے وہ اپنے سرخ گوٹے کناری والے لباس میں بیٹھی دلہن سوچوں کے جنگل میں بھاگ رہی تھی۔ دودھ لے کر وہ کمرے میں آ گئی تھی۔

''سنو سنو۔ دودھ پی کر پھر سو جانا۔'' وہ اس کے کندھے تھپتھپاتی ہوئی جگا رہی تھی۔

سکندر بمشکل اٹھ کر پلنگ پر گرا تھا مگر وہ اسے دودھ پلانے میں مصر تھی۔

''تمہیں بخار ہو رہا ہے تم نے دن بھر کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ کم از کم دودھ پی لو۔''

وہ بے دم سا ہو گیا تھا۔ وہ سہارا دے کر اسے دودھ پلانے لگی تھی۔ وہ کسی معصوم بچے کی طرح دودھ پینے لگا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے لگی کھڑی تھی اور اس کا دل گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح بج رہا تھا۔

وہ ہولے ہولے دودھ پیتے ہوئے جیسے چونکا تھا۔

''بختاور! اپنے ہاتھ دکھاؤ ذرا۔''

وہ ایک دم سے چونکی تھی اور دونوں ہتھیلیاں سامنے کر دی تھیں۔

زرد بلب کی روشنی میں ان ہاتھوں پر مہندی کے رنگ کا جو بن سندر کو پتھر کر گیا تھا۔

''یہ مہندی تو تمہارے ہاتھوں پر بہت بھلی لگ رہی ہے۔ پہلے تمہیں کبھی ایسے دیکھا نہیں ناں۔''

بختاور کو لگا جیسے وہ جو تاریک جنگلوں میں رستے ڈھونڈتی پھر رہی تھی وہی سامنے کسی سبز اونچے درخت کی چوٹیوں سے چاند جھانکنے لگا تھا۔

رات اب بھی بھیک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

عدن جبار کو کسی نے زمین میں دھاتی کیل کی طرح گاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے خلیل کے شب و روز میں واضح تبدیلیاں دیکھی تھیں اب وہ صرف کھوج میں تھی کہ کب کوئی سرا ملے اور وہ استفسار کرے

جس شخص کے بارے میں بہت پوزیسیو تھی۔

وہ اپنی ماں کے پاس آئی تھی جنہوں نے زندگی کی سب حقیقتوں کو جان لیا تھا۔ وہ شیفون کی ساڑھی میں ملبوس ہولی ہوکس کے پاس کھڑی مالی کو ڈانٹ رہی تھیں ان کے ہاتھ میں کوئی اردو ادب کی پرانی کتاب تھی جس کے سرورق سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتاب کتنی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنی دلچسپیوں کو وقت دینا شروع کر دیا تھا۔

ٹینا ثانی کی غزلیں۔ اردو ادب کی ضخیم کتابوں کے بنڈل۔ کچن میں تھائی اور اٹالین کھانوں پر تجربے۔ ساڑھیوں کی کولیکشن۔ وہ کبھی کبھار اپنی ماں کو مسحور ہو کر دیکھتی تھی کہ یہ وہ عورت ہیں جنہوں نے اپنے شوہر کی بے وفائی کو سہا تھا جو شاید اب بھی سہہ رہی تھیں مگر انہوں نے اس سفر میں خود کو کھوج لیا تھا۔

''مام! آپ کو اب تکلیف نہیں ہوتی؟''

وہ ہاتھ میں تھمی کتاب کی نشانی لگا کر غور سے اپنی حسین بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔

''کبھی ہوتی تھی، بہت ہوتی تھی مگر انسان بہت ڈھیٹ فطرت کا ہے ناں تو کب تک کوئی ماتم کرے؟ زندگی ہمیشہ ہماری چوائسز پر چلتی ہے تو بہتر یہی ہے کہ ہر بار خود کو ہی چوز کر لیا جائے۔ میں نے تمہارے باپ کی طرف سے ملنے والی بے وفائی کو چوز نہیں کیا۔ میں نے اپنی دلچسپیوں کو چنا ہے جو میرے آس پاس ہیں۔ انسان کی دلچسپیاں اسے کبھی تنہا اور اکیلا نہیں کرتیں عدن۔ انسان چنو گی تو پھر بے آرام رہو گی، تکیوں پر سر رکھے کروٹیں بدلتی رہو گی۔ اپنی نیند کی حفاظت کیا کرو۔''

اب بھی سوشل سرکل کی بورنگ اور نمود و نمائش سے رنگا رنگ پارٹیاں ہوتی تھیں۔ ادھیڑ عمر خواتین تین تین گھنٹے پارلر میں لگا کر آتی تھیں اور پھر سارے وقت بے آرام سی ہو کر اپنی نقلی وگ کو ٹھیک کرتی رہتی تھیں۔ کچھ خواتین کو اپنی لپ اسٹک چاٹنے میں مزا آتا تھا تو وہ بار بار ڈریسنگ روم کی طرف بھاگتی تھیں۔ ایسے میں عدن نے مام کو بہت مطمئن انداز میں وہیں پاس ہی چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا تھا، جہاں ان کے پرسکون انداز اور طمانیت سے متاثر ہو کر کچھ لوگ ان کی نقل کرنے لگتے تھے اور وہ بس چہرے پر مسکراہٹ سجائے سب کو خاموشی سے دیکھے جاتی تھیں۔ عدن تب پلیٹ میں اسٹیک

ڈالے ان کی طرف آئی تھی۔

''مام! آپ کو نہیں لگتا آپ کچھ بدل سی گئی ہیں۔''

عدن کی پلیٹ سے وہ انہوں نے سلاد کا پتا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

''میں نے خود کو بدلا ہے عدن۔ بے شک انسان زمانے کے ساتھ چلے مگر اس بھیڑ چال میں اپنا آپ سنبھالنا ضروری ہے۔''

تبھی عدن نے محفل کی مہمان خاص کو جو ایک منسٹر کی بیوی تھیں، اپنی مام کی طرف آتے دیکھا تھا۔

''ارے کیسی ہیں آپ۔''

محفل کی ساری خواتین اور مرد حضرات نے ان دونوں کو محبت سے گلے لگ کر قہقہے لگاتے دیکھا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کی تحریریں پڑھ کر میں تو آپ کی فین ہوگئی ہوں۔''

مام بس مسکراتی رہی تھیں۔ عدن نے ان کے جانے کے بعد مام کو پکڑا تھا۔

''یہ آپ کو کیسے جانتی ہیں اور کون سی تحریریں؟'' وہ حیران تھی۔

مام نے سادگی سے اسے بتایا تھا۔

''ارے وہ میں آج کل فیس بک پر کچھ چھوٹی چھوٹی تحریریں لکھتی ہوں تو وہ بہت وائرل ہوتی ہیں انہوں نے مجھے فیس بک پر فالو کیا ہوا ہے۔''

عدن جبار کسی شاک میں آ گئی تھی۔ وہ اپنے موبائل پر سرچ بار میں کچھ سرچ کرنے لگی تھی اور سامنے ہی وہ پروفائل کھل گئی تھی جس کے فالوورز لاکھوں میں تھے۔ وہ جیسے جیسے اسکرول کر رہی تھی اس کا چہرہ جیسے سردیوں کی کہرے کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ پروفائل شاید اس کی زندگی کی اب تک کی سب سے خوب صورت پروفائل تھی جہاں چھوٹے چھوٹے قطعات میں تحریریں تھیں اور ان گنت تصویریں تھیں۔

گلوریا کی کھڑکیوں کے پار، فٹ پاتھ کی تتلیاں۔ ایک خط زندگی کے نام۔ ہولی ہوکس کے جھنڈ۔ امیر خسرو کی کہانی سنو۔ پھانسی گھاٹ میں جگنو۔ وہ ایک زندگی کا کینوس تھا جہاں رنگ ہی رنگ تھے۔

وہ وہی تھیں اس کی مام، جو شہر کی پرانی تاریخی عمارتوں میں گھوم پھر رہی تھیں۔ سرخ اینٹوں

والے مقبروں کی سیڑھیوں پر ساڑھی میں ملبوس بالوں میں سفید گلاب ٹانکے، وہ کوئی مغلیہ شہزادی دکھائی دیتی تھیں۔

گھر کے ڈیکوریشن پیسز کی تصویروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھے تھے۔ کچن کے مہنگے برتنوں میں دیسی کھانوں کی بھاپ اڑاتی ہوئی تصویریں۔ فالوورز کا ہجوم تھا وہاں جو مسز جبار کے لیے تعریفی پیغام بھیج رہے تھے۔

عدن جبار آج کی دنیا کی لڑکی تھی، سوشل میڈیا کی جنریشن والی جس کے لیے یہی اصل زندگی تھی جو یہاں مشہور تھا وہی سب کچھ تھا، مگر آج وہ حیران ہوگئی تھی۔ اس کی مام نے اپنی دلچسپیوں سے اپنے لیے جو دنیا بنائی تھی، وہ ان کو زندگی کے ہر موڑ پر محفوظ رکھنے والی تھی۔

اس شام جب کہرا گرنے لگا تھا اور امام اپنے گرد شال برابر کر رہی تھیں تو عدن کی نظر اپنے باپ پر پڑی تھی جو اپنے مردوں کے ٹولے میں کھڑا بے چین سا دکھائی دیتا تھا اور وہ بار بار پلٹ کر اپنی بیوی کو دیکھتا تھا جیسے مسحور ہو رہا ہو۔ وہ محفل جہاں عورتوں کی بہتات تھی، سوسائٹی کی حسین و جمیل عورتیں اکٹھی تھیں، وہاں وہ عورت کالی سیاہ ساڑھی میں راج ہنس کی طرح گردن اونچی کر کے ہنستی تھی تو وہ بے چین ہو کر اٹھتے تھے۔

وہ ان کی دسترس میں تھی۔ جب ان کو خوش کرنے کے لیے اس جنگ میں اتری تھی تو اسے مات ہی مات ہوئی تھی، آج وہ اپنے آپ کے ساتھ تھی تو محفل کی جان تھی۔ جبار نے اپنے آپ کو جیسے کسی زیاں کے احساس میں جکڑا ہوا محسوس کیا تھا۔

گھر واپسی پر جب وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں تو انہوں نے مدت بعد اپنے شوہر کی آواز سنی تھی۔

"آج تم بہت حسین لگ رہی ہو۔"

وہ رکی تھیں، وہیں کھڑی کی کھڑی ہو گئیں اور پلٹ کر دیکھا تھا۔

"جبار! پتا ہے تم نے بہت دیر کر دی۔ تمہیں مجھے پسند کرنے اور اپنے معیار تک پہنچانے کے لیے زمانے کی سند ضروری تھی مگر جب تک میں نے یہ کیا مسترد ہی ہوئی۔ اور آج دیکھو تم اور تمہارا رمانہ

مجھے اپنا رہا ہے۔ مگر سچ کہوں تو اب یہ سب خوشی نہیں دیتا۔ تم نے میرے اصل کا گلا گھونٹا تھا۔ کتنے عرصے میں نے اپنی میت خود اٹھائی ہے اور آج جب میں سانس لے رہی ہوں تو مجھے دوبارہ کسی پیمانے پر رکھ کر پرکھنے کی غلطی کبھی مت کرنا۔ تم اور تمہارا زمانہ ہے دونوں پر۔"

جبار نے ٹائی کی ناٹ کھولنے کی کوشش کی تھی، دم گھٹا جا رہا تھا۔ انہوں نے ہیل کی آواز پر مڑ کر دیکھا تھا پیچھے عدن جبار کھڑی تھی۔

"کیا ہوا ڈیڈ؟"

وہ سامنے پڑی پانی کی بوتل اٹھانے لگے تھے۔

"بہت دیر ہوگئی بہت دیر۔"

کہر آلود شام میں پوکلپٹس کے جھنڈ میں کچھ حشرات کی آوازیں سناٹے کو توڑ رہی تھیں۔ گھر کے اوپر والے پورشن سے ٹینا ثانی کی آواز خوب صورت سروں میں بکھرنے لگی تھی۔

فیض کی غزل کے مصروں نے سماں باندھ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وقت نے اپنے خیمے اٹھانے کا سندیسہ دے دیا تھا۔ خانہ بدوش انسانوں نے کوچ کرنے کی ٹھانی تھی۔ وہ پانچوں بھی جیسے برگد کے بزرگ پیڑ کے نیچے بیٹھے کسی سنیاسی کی طرح تھیں جو اپنے مقصد تپسیا کے بعد اچانک سے کوچ کر جاتے ہیں اور پیچھے صرف نشانیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ صرف نشانیاں!

وہ پانچویں بھی جیسے آنے والے اختتام سے اپنی اپنی جگہ خوف زدہ تھیں۔

جامعہ کی طالب علموں سے آباد رونقیں، درختوں کی چھایا تلے چہل قدمی کرتے ہوئے آزاد روحیں، فارسی اشعار پڑھتے ہوئے کچھ انٹلکچوئل حضرات، مختلف جماعتوں کے نمائندہ گروہ کی ہنگامی میٹنگیں مختلف تہواروں میں شامل ہونے والی گیدرنگ، ہاسٹل کی اداس دوپہروں میں کی جانے والی گپیں، شام کے کانسی لمحوں میں ایک دوسرے کی محبت کی ناکامیوں پر پردیئے جانے والے حوصلوں کے چند الفاظ سب نشانیاں تھیں۔ جو پیچھے رہ جانے والی تھیں۔

تمکین جمال نے آنے والے وقت کے اختتام کی بو پا کر انہیں باخبر کرنا اپنا اولین فرض سمجھا تھا جب کنیزاں اور سیرت امرتا پریتم کی خودنوشت رسیدی ٹکٹ پر زور و شور سے بحث کرنے میں مگن تھیں۔

''امرتا نے یوں لگتا ہے محبت کی تعریف کو مکمل کر دیا ہو۔''

''جس انسان کو خود محبت نہ حاصل ہو تو اسے محبت کی تکمیل کا تمغہ دینے پر کیوں تلی ہوئی ہو۔''

کنیزاں نے اسے گھور کر زمین پر ہی جمے رہنے کا کہا تھا جس کے خیالات کی دنیا اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیتی تھی۔

''جو بھی ہو رسیدی ٹکٹ ایک شاہکار ہے جسے ہر محبت کرنے والی روح کو پڑھنا چاہیے۔''

''ایسی کتابیں مسلسل اداسی کا مرض پیدا کر دیتی ہیں سیرت۔''

ہاسٹل کے کمرے کی کھڑکیوں کو گیلے اخبار سے صاف کرتی تمکین نے ان دونوں کو بور ہو کر دیکھا تھا۔

''تم دونوں کے پاس بات کرنے کو کوئی موضوع نہیں ہے کیا؟ پچھلے دو ہفتوں سے میں محبت کی غیبت سن سن کر پک چکی ہوں۔''

''تم تو چھوڑو۔ تم جیسے مرتد لوگوں کو محبت اپنے موضوع سے بھی کنارے پر کر دیتی ہے۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے، تم دونوں ہی اس بحرِ محبت میں کود مرو۔''

وہ دونوں اب بھی بحث میں لگی تھیں۔ سامنے جامن کے درخت پر چڑھ کر کچھ کوے شور مچا رہے تھے تو وہ وہیں رک کر چند لمحے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ پاس ہی ایک کوئل اڑتی پھر رہی تھی۔ یقیناً کوئل نے ہمیشہ کی طرح اپنے بچوں کو کوؤں کے گھونسلے میں ہی پرورش کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا کہ کوئل اپنے انڈے کوے کے گھونسلے میں ڈال دیتی ہے اور کوے کی مادہ ہی ان انڈوں کی حفاظت کرتی ہے اور جب بچے نکلتے ہیں تو وہ کوئل کے ہوتے ہیں۔

''بے چارے کوے دھوکا کھا جاتے ہیں۔''

تمکین کو کوؤں پر ترس آیا تھا تبھی بالکونی میں کھڑے ہوتے ہوئے اس کے پیچھے ایک قہقہہ پڑا تھا جیسے انہوں نے فیس بک پر کوئی لطیفہ پڑھا تھا اور اب ہنسی کے دورے بے قابو ہو گئے تھے۔

''یہ دونوں کم از کم میری سمجھ سے تو بالکل ہی باہر ہیں۔''

یونیورسٹی سے چھٹی تھی تو چائے بنا کر وہ چھت پر ٹہلنے لگی تھیں۔ چھت لڑکیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی۔ کچھ لڑکیاں دوپٹے کمر کے گرد باندھے کوکلا چھپا کی کھیل رہی تھیں۔ ایک گروپ کوک اور پزا اڑانے میں مصروف تھا۔ وہیں کچھ پڑھاکو لڑکیاں موٹے موٹے ناول ہاتھ میں پکڑے چھت کی دیواروں کے ساتھ اردگرد سے بے خبر تھیں۔ تبھی سکون سے چائے کا لمبا سپ لیتے ہوئے تمکین نے ان دونوں کے سر پر پہاڑ گرایا تھا۔

''ہمارے پاس اب صرف تین مہینے باقی ہیں۔''

دونوں کو رسیدی ٹکٹ بھول بھال گئی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

''تین مہینے کس لیے۔''

''یونیورسٹی مکمل ہونے میں۔''

اور پھر جیسے سورج وہیں غروب ہو گیا، رات ہو گئی تھی یونہی جیسے کوئی بے تحاشا ہنستے ہنستے اچانک چپ ہو جاتا ہے۔

جامن کے درختوں میں گھرا ہاسٹل جہاں قہقہوں کی بارات اترتی تھیں۔ جامعہ کی سرمئی سڑکوں پر جہاں کنیزاں نے آدم کے ساتھ خوابوں کی گفتگو کی تھی۔

کہرے میں گم ہوتے ہوئے ایس ٹی سی کوریڈور میں سیرت کو سرخاب کا مغرور انداز یاد آ گیا تھا۔

تو کیا واقعی سب کچھ خواب ہو جائے گا؟

☆.....☆.....☆

چاندی سے روشن دن میں جب سرخاب خان فیصل آڈیٹوریم کے مین کیفے میں اپنے دوستوں کے جھنڈ میں بیٹھا موجودہ حکومت کی ناکام پالیسیوں کے بارے میں بحث میں مگن تھا تبھی اس کے یار غار نبیل نے اس کی توجہ سامنے خزاں رسیدہ درخت سے ٹیک لگائے کھڑی لڑکی کی طرف مبذول کرائی تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

وہ وہی تھی، سیرت امتیاز۔ جو ایک مین کیفے کے ٹنڈ منڈ درخت کے نیچے کسی بہار کا پہلا پیغام معلوم ہوتی تھی، اس کی آنکھیں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں۔ سرخاب کو اپنے اندر چھوٹتا ہوا سا محسوس ہوا تھا۔ وہ لڑکی ہمیشہ لمحوں کی بات کرتی تھی لمحوں کے اسیر جو صدیوں کی سزائیں برداشت کرتے ہیں۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک خالی ٹیبل کی طرف چلا آیا تھا جہاں دو کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ اس سے الگ آ کر بیٹھتے ہیں وہ بھی وہیں چلی آئی تھی۔ جینز کی پینٹ کے اوپر ایک ڈھیلا ڈھالا سا کرتا اور نیچے جاگرز پہنے وہ اپنے بیگ کے اسٹریپ کو بار بار مروڑ رہی تھی۔ ماتھے پر کچھ بالوں کی لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔

''میں معذرت کرنا چاہتی ہوں تم سے۔''

سرخاب خان نے اس کی پیشانی پر کوئی بھی سلوٹ نہیں دیکھی تھی۔

''کس بات کی معذرت؟''

''یہی کہ میں نے تمہیں بہت تنگ کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اسی لڑکی نہیں ہوں جو کہ لڑکیوں کے رستوں میں آ کر انہیں گھیرتی ہیں اور فریب دیتی ہیں۔'' کاجل سے سجی کالی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر اس کے ہاتھ پر گرا تھا۔ ''تم بے شک میری دوستوں سے پوچھ سکتے ہو کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔''

''دوست دوستوں کی کہاں برائی کرتے ہیں؟'' سرخاب نے جیسے اسے جتایا تھا۔

''پھر تمہیں کون سی سند چاہیے۔'' وہ اب آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ چاندی کے ورق جیسا دن تھا۔ سیرت کی آنکھیں سرمئی بادل تھیں۔

''تمہاری آنکھوں کی سند کافی ہے لڑکی۔''

وہ جیسے اس کی بات پر چونکی تھی کہ وہ کیسے بات کر رہا تھا۔

''میں لڑکی نہیں ہوں۔''

''تو پھر کیا ہو؟''

وہ ہتھیلی میں دیے ہوئے ٹشو سے آنکھوں کے کنارے صاف کر رہی تھی۔ ''سیرت ہوں میں۔''

http://kitaabghar.com

وہ ویٹر کی طرف متوجہ ہوا تھا جوان دونوں کے سر پر آخر کھڑا ہو گیا تھا۔

''تم کچھ کھاؤ گی سیرت؟'' وہ جیسے دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''نہیں میرے پاس سیلڈ ہے۔ میں نے خود بنایا ہے وہی دینے میں آج تم سے ملنے یہاں آئی تھی۔'' وہ اپنے بیگ سے وہ سیلڈ کا ڈبا نکال رہی تھی۔ وہ پلاسٹک کا ڈبا تھا ساتھ کچھ ٹشو اور چمچہ بھی تھا جسے اس نے نفاست سے لپیٹا ہوا تھا۔ سیرت نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

''میں بھی تم سے معذرت کرنا چاہتا ہوں۔''

آس پاس اردگرد سے بے خبر اپنے اپنے مشغلوں میں کم ساری مخلوق بے خبر بیٹھی تھی۔ خزاں نے درختوں کو برہنہ کر دیا تھا۔ دسمبر کی ٹھنڈ نے ہر شے کو فسوں زدہ بنا دیا تھا۔ ماحول سے محبت کرنے والی ایک لڑکی مین کیفے کے ٹنڈ منڈ درختوں کے لینڈ اسکیپ بنا رہی تھی۔

''کس چیز کے لیے معذرت؟''

''وہ اس دن ایس ٹی سی کوریڈور میں، میں نے تمہارے جنم دن کا کپ کیک ٹھکرا دیا تھا۔ مجھے بعد میں احساس ہوا تھا کہ کسی کے جنم دن والے دن اس شخص کو ہرٹ نہیں کرنا چاہیے۔''

بھرے بالوں والا وہ شخص معذرت کر رہا تھا۔ چیک شرٹ میں ملبوس، بازو پیچھے کیے اور ایک بلیک واچ پہنے وہ سنجیدہ سنجیدہ سا نظر آتا سیرت کو بار بار کنفیوز کر دیتا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ اگر مروت میں آپ یہ سب کر بھی لیتے تو شاید مجھے زیادہ تکلیف ہوتی کیونکہ مرت اور ترحم کے جذبات بہت ہی ظالم ہوتے ہیں۔'' پھر جھیل سی آنکھوں میں دسمبر کی ٹھنڈ چھانے لگی تھی۔

''میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' وہ اب جیسے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا اور اب وہ غور سے بار بار اس کے چہرے کے تاثرات کو بھی نوٹ کر رہا تھا۔

''کیا؟'' دل خوش فہم ہو کر جیسے کسی اور ہی لے پر دھڑکنے کو بے تاب ہوا تھا۔

''میں اپنی کزن کے ساتھ انگیجڈ ہوں۔ اس کا نام درنجف ہے اور وہ دور پہاڑوں میں میری منتظر ہے۔''

خزاں نے سب کچھ برہنہ کر دیا تھا۔ وہ ظالم لمحوں کی آمد سے نیلی پڑنے لگی تھی۔

''تم۔تم اس سے محبت کرتے ہو کیا؟''

وہ سوال جیسے سرخاب خان کو بہت پیچھے لے گیا تھا۔ بہت پیچھے۔ کوئی ٹائم مشین تھی جس کے ریورس آپشن نے اسے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچا دیا تھا۔ جہاں درنجف اپنے بھیڑ کے میمنے کی حادثاتی موت پر تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔

''تم تو شہر ہوتے ہو تمہیں کیا پتا زندہ رہنے کے لیے کسی زندہ وجود کی کتنی ضرورت ہوتی ہے، بھلے وہ کوئی جانور ہی کیوں نہ ہو۔''

تب وہ شربتی آنکھوں والی درنجف کا سر تھپکتا رہا تھا۔ پھر جتنے دن بھی وہ وہاں رہا تھا وہ اس کے ساتھ مل کر صندل اور دیال کے درختوں کی گنتی کرتا رہا تھا اور واپسی کے وقت کیسے صبر سے اسے مشورہ دے گئی تھی۔

''میں تمہاری زندگی میں حادثاتی طور پر آ گئی ہوں۔ مجھے اس بات کا مکمل احساس ہے مگر میں ایک بات تمہیں بتا رہی ہوں خان۔'' برف کی چوٹیوں کے پار سے سورج نے آنکھ نکالی تھی اور برف کے گولے سونے جیسے ہو گئے تھے۔

''کون سی بات؟''

''اگر وہاں تمہیں کوئی اچھا لگے تو اسے پسند کر لینا۔''

سرخاب خان نے اس دن اس لڑکی کے ظرف کے پیمانے کو آسمان جتنا اونچا پایا تھا۔ اور آج وہ سامنے بیٹھی اس سے محبت کا سوال کر رہی تھی۔

ٹشو ختم ہو گئے تھے۔ آنکھوں کا کاجل بھل بھل بہہ رہا تھا۔

جو نہ مل سکے وہی بے وفا، یہ بڑی عجیب سی بات ہے

جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر، وہی آج تک میرے ساتھ ہے

کسی گروپ نے بیت بازی شروع کر دی تھی۔ ن۔م راشد، فیض اور ناصر کاظمی آس پاس

http://kitaabghar.com

گونجنے لگے تھے۔

وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

''زندگی میں، میں رشتوں کی بے اعتنائی کا شکار رہی ہوں۔ مجھے کسی بھی رشتے کا خالص پن میسر نہیں ہوا۔ امی کے گزر جانے کے بعد ابا نے دوسری شادی کر لی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دوسری شادی ہمیشہ دوسری ہوتی ہے۔ بیوی بھی، اولاد بھی رشتہ بھی۔ ہر چیز تقسیم ہو جاتی ہے۔ مجھے تقسیم سے خوف آتا ہے خان۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے لگا جیسے میں تمہیں بہت پہلے سے جانتی ہوں حالانکہ تم نے میری صراحی توڑی تھی۔ صراحی توڑنے والے کو معافی نہیں ملتی بشرطیکہ وہ آپ کا محبوب ہو۔ یہ اکیسویں صدی ہے یہاں سچے جذبات کو دنیا بہت سے ٹیگ لگا دیتی ہے۔ میں نے پوپلی بوا سے بھی تمہارا ذکر کیا تو انہوں نے اس چیز پر مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ وہ میری جہاندیدہ سہیلی ہیں جن کی باتوں کا میں یقین کر لیا کرتی ہوں۔ تم تک آتے آتے جانے میں نے کتنی بار اپنی عزت نفس کو کچلا ہوگا، لوگوں کی نظروں میں بری بھی بنی ہوں گی۔ خاص طور پر تمہارے دوستوں کے سامنے۔ یہاں میں اپنی سہیلیوں کی بات نہیں کروں گی۔ سچے جذبات یونہی خوار کرتے ہیں۔ لوگوں کو سچ راس نہیں آتا۔ دنیا بہت ملاوٹ زدہ سی ہو گئی ہے بہت.....''

وہ چہرے کے گرد لٹکتی ہوئی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ وہ سامنے سلاد کے بند ڈبے کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔

''یہ ضرور کھا لینا مجھے اچھا لگے گا۔''

سرخاب خان نے بھی خود کو اٹھنے پر مجبور پایا تھا۔ ایک دم ہی سیرت امتیاز اس کے سامنے بہت اونچی ہو گئی تھی۔ کسی شاندار عمارت کی طرح۔ جس کا، رعب انسان کو سر اٹھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ جاتے جاتے جیسے بے خیالی میں مڑی تھی۔

''سنو خان! تم مجھے ایک ٹشو دو گے؟''

سرخاب خان نے لمحوں کو خود پر قابض ہوتے دیکھا۔ دسمبر کی خزاں آلودہ دوپہر سہ پہر سے ملنے

والی تھی۔ سامنے چائے کے کھوکھے سے دھوئیں نے سب دھندلا دیا تھا۔

جو کسی نظر سے عطا ہوئی وہی روشنی ہے خیال میں
وہ نہ آسکے، رہوں منتظر، یہ خلش کہاں تھی وصال میں
میری جستجو کو خبر نہیں، نہ وہ دن رہے، نہ وہ رات ہے
کرے پیار لب پہ گلہ نہ ہو، یہ کسی کسی کا نصیب ہے

وہ سرخاب خان سے ٹشو لے کر واپس مڑ گئی تھی۔ دنیا نے لڑکھڑاتے ہوئے سیرت امتیاز کو سڑک پار کرتے دیکھا تھا۔ وہ خوشبو سے مہکتا ہوا ٹشو پیپر وہ اپنے ہاتھوں میں بھینچے ہوئی تھی۔

پیچھے بھورے بالوں والا شخص لٹا پٹا سا کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کہر آلود رات جب چار سو خاموشی تھی اور ہر کوئی اپنی اپنی سوچوں کے جنگل میں راہیں ڈھونڈ رہا تھا تب ہی ان دونوں نے سیرت کو بے تحاشا کھانستے ہوئے دیکھا تھا جیسے وہ کھانس کھانس کر بے دم ہو رہی تھی۔ وہ سیرت امتیاز کا پہلا استھما اٹیک تھا جس نے اس کو بے حال کر دیا تھا۔ وہ دونوں پریشان ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ہاسٹل وارڈن کو مطلع کیا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ یونیورسٹی کے اسپتال کے ٹھنڈے کوریڈور میں بیٹھی تھیں۔

''وہ کچھ دنوں سے بہت پریشان رہنے لگی تھی۔''

''مگر میں نے تو ہمیشہ اسے ہنستے مسکراتے شرارتیں کرتے دیکھا تھا۔'' تمکین کو یقین کرنے میں تھوڑا تامل سا ہوا تھا۔

''وہ بہت اچھی اداکارہ ہے تمکین، آنسو پینے کی بیماری ہے اسے۔ تمہارے سامنے موت جیسے ماتم پر بھی ایسا مسکرائے گی کہ تم یقین ہی نہیں کر پاؤ گی۔''

دسمبر کی دھند ہسپتال کی گیلریوں میں بھاگنے لگی تھی۔ وہ دونوں اسے آکسیجن لگتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

نرس نے ان دونوں سے پوچھا تھا۔ ''لگتا استھما پرابلم موروثی ہے۔''

''ہاں شاید سیرت کی امی کو بھی بہت سانس کا مسئلہ تھا۔''

''آپ کو بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا کیونکہ سردیوں کا موسم ہے اس میں سانس کی بیماریاں بہت خطرناک ہو جاتی ہیں۔''

کہرے میں سب گم ہو رہا تھا۔ وہ دو گھنٹے بعد واپس ہاسٹل آ گئی تھیں۔

کنیزاں سیرت سے لپٹ کر بیٹھ گئی تھی جس کے گالوں پر آنسو جم گئے تھے۔

''سیرت ہم ہیں ناں۔''

تمکین راڈ کو سوئچ لگا رہی تھی۔ قہوہ ابلنے کی مہک نے حواسوں کو ذرا سا سکون دینا شروع کر دیا تھا۔

''جانتی ہوں مجھے تم لوگوں کے ساتھ کا ہی تو حوصلہ ہے۔''

تمکین نے دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے ہی پوچھ لیا تھا۔ ''تم سرخاب سے ملی تھیں؟''

وہ رکے ہوئے آنسو پھر سے حدیں توڑنے لگے۔ باہر کچھ بلیاں چیخ رہی تھیں۔

''ہاں میں ملی تھی اس سے۔'' کتنا ٹھہراؤ آ گیا تھا آواز میں۔ شاید کنیزاں نے سچ کہا تھا کہ وہ ایک اچھی اداکارہ رہی تھی۔

کنیزاں نے ہی موضوع بدل دیا تھا۔ ''تم نے آگے کیا سوچا ہے؟''

کنیزاں چائے کے کپ سے حرارت کشید کر رہی تھی۔ رات کے دو بجے وہ تینوں اپنی زندگی کے آگے کے منصوبوں پر بات چیت کرنے لگی تھیں۔ باہر سرد دسمبر تھا، اندر ائے کی چاٹنی تھی جس میں خواب کھل رہے تھے۔

''سب نے مجھے دوش دیا ہے۔ سب کے سامنے میں بری ہوں ایک جیتا جاگتا انسان اپنی مرضی سے فیصلے بھی نہیں کر سکتا تھا۔'' چائے پینے کے ساتھ ساتھ کنیزاں آنسو بھی پی رہی تھی۔

سیرت نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ سرسراتی ہوئی رات یونہی کئی ثانیے ادھیڑ کر گزر جاتی ہے اور انسان پھر پیچھے تروپے بھرتا رہ جاتا ہے۔

''ایک اکیلی تن تنہا کنیزاں سارے تھل واسیوں کی عزت کی گٹھڑی سر پر تھامے کیونکر گھوم سکتی ہے۔ کیا سارے تھل کی عزت وقار ایک کنیزاں کی مرہون منت ہوگا؟ کتنی بڑی ناانصافی کی بات ہے تمکین۔ بہت بڑی۔ میرے دل کا کیا؟'' سارے رونے دل کے ساتھ۔ دل مسئلوں کا گھر تھا۔

''ہمیشہ ایجاد کرنے والے مرجد مرجاتے ہیں۔ پیچھے صرف ایجادات رہ جاتی ہیں۔ مگر میں وہ موجود نہیں ہوں۔ مجھے انسان ہی بنے رہنا ہے اپنی تمام تر کوتاہیوں سمیت، چلو میں نے غلط کیا بہت غلط کیا سیرت، انسان غلطیاں کرتے ہیں مگر ابا لوگوں نے کیا کیا؟ بختاور کو کسی جانور کی طرح ایک زبردستی کے کھونٹے سے باندھ دیا۔ جب عورت کو پتا ہو کہ مرد سارے کا سارا ہی کسی اور کا ہے تو وہ پوری حیاتی سارے کے سارے مرد میں دراڑیں تلاشتی رہ جاتی ہے کہ کہیں تو جگہ ملے۔''

وہ تینوں ٹھنڈی چائے لے کر بیٹھی رہ گئی تھیں۔ وہ تھل واسی اپسرا بلک رہی تھی۔

''میں خود غرض ہوں بہت ہوں۔ مگر مجھے کچھ تو وقت ملا ہوتا کہ میں کھرے کھوٹے کے اپنے پیمانے ہی سیدھے کر لیتی۔ مجھے دل میں درد اٹھتا ہے کہ میری بہن اس رابیل کے پھولوں والے گھر میں کسی روز گھٹن سے مرگئی تو کیا ہوگا؟''

دسمبر میں بھیگی رات نے کوچ کرنے کا قصد کیا اور پھر ایک اور پیتل جیسا دن طلوع ہوگیا۔ رات کی اداس اپسرا کنیزاں فاطمہ نے آدم علی کے لیے عدالت لگالی تھی۔

''تمہیں بہت آسان لگتا ہے کسی کو اس کے مقصد سے ہٹانا؟''

وہ اب بھی کچھ برش تھامے ہوئے تھا وہ کہیں بھی رنگوں سے خالی ہو کر نہیں جاتا تھا۔ وہ گل جی، صادقین اور سعید اختر کا شیدائی تھا۔

''میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا۔''

''تمہیں پتا ہے ابھی تک تم کیوں کاملیت کو نہیں پہنچے؟''

وہ سلیٹی سی رنگت کے سرخ ہوتی ہوئی کنیزاں کو دیکھے گیا تھا۔

''کیونکہ تم راستہ ٹھیک گئے ہو۔ تمہاری منزل میں نہیں ہوں اور میری منزل تم نہیں ہو۔ تمہاری

منزل تمہارے رنگ، کینوس اور خیالات کی دنیا ہے تم اسی میں زندہ رہو۔ وہیں بھٹکو۔ رستے پھولو پھر کسی روز منزل کو پالو گے۔ یہ محبت وحبت سب بے کار کی باتیں ہیں۔"

درویش درختوں کی چوٹیاں آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے چند پردے سکڑے ہوئے نیچے لگی عدالت دیکھنے میں مصروف تھے۔

"تمہیں کیوں لگتا ہے کہ سب بے کار ہے؟" آدم علی گڑگڑانے لگا تھا۔ کنیزاں فاطمہ تو وہ رستہ تھی، ایک ایسا برج جس سے وہ تخیل کو رام کیا کرتا تھا۔

"کیونکہ اونٹ ریت کے ٹیلوں میں کہیں گم ہو گیا ہے اپنی من مرضی سے۔"

☆.....☆.....☆

کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی قدیم راہداریوں میں سانس دھوئیں اڑاتے اسٹوڈنٹس گزر رہے تھے۔ کچھ خشک میوہ جات ٹونگ رہے تھے۔ تب ہی زوردار تالیوں کے ساتھ لیب کا دروازہ دھڑ دھڑ کھلا تھا اور میزی ڈیزی ایک فاتحانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہوئے اسٹوڈنٹس کے جھرمٹ میں باہر آئی تھیں۔

"اور ہم نے ایک کامیاب تجربہ کر لیا ہے۔"

وہ دن میم ڈیزی کی زندگی کا سب سے بہتری دن تھا۔ وہ اپنے آفس آنے والے لوگوں کی مبارک باد وصول کرنے کے ساتھ ساتھ ان سب کی تواضع اخروف کے حلوے اور چائے سے کر رہی تھیں۔ وہ بھی خود پر پابو پاتی ہوئی میم ڈیزی کے آفس کی طرف آ گئی تھی۔

"میم! آپ کو بہت مبارک ہو کہ آپ نے ایک کامیاب تجربہ کر لیا ہے۔"

وہ بوب کٹ والی ایک نٹ کھٹ پروفیسر تھیں۔ جنہوں نے اپنے چہرے سے کبھی بھی مسکراہٹ گم نہیں ہونے دی تھی۔ کنیزاں جانتی تھی کہ ہر یونیورسٹی کی ڈپارٹمنٹل پالیٹکس میں وہاں کے استاد ملوث ہوتے ہیں مگر وہ اس سب سے پرے بس اپنے مقصد پر ہی ساری توانیاں صرف کرتی تھیں۔

"تمہارا شکریہ اچھی لڑکی۔ یہ لو میں نے خود اخروٹ کا حلوہ بنایا ہے۔" بھاپ اڑاتی چائے اور اخروٹ کے حلوے کی مہک نے جیسے کچھ مکمل کر دیا تھا۔

http://kitaabghar.com

''تم نے آگے کیا سوچا ہے؟''

''ابھی کچھ نہیں سوچا میم۔ میں تھوڑی شش و پنج میں مبتلا ہوں۔'' وہ کپ کے کنارے پر انگلیاں پھیرتی ہوئی انہیں بہت ڈسٹرب لگی تھی۔

''سب ٹھیک ہے ناں؟''

''کبھی لگتا ہے سب ٹھیک ہے اور کبھی سبھی کچھ غلط ہونے کا احساس ستانے لگتا ہے۔''

وہ کیمیا کی سب سے بہترین اسٹوڈنٹ تھی۔ کبھی کبھار اس کی دلچسپی اور ریاضت دیکھ کر اس میں ڈیزی اپنا آپ دیکھتی تھیں۔ وہ اکثر ان کے پاس آ کر گھنٹوں بیٹھی رہتی اور یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہتی تھی۔

''آگے ایم فل میں داخلے کا کیا سوچا ہے؟''

وہ آنسو چھپانے کو سر جھکا گئی تھی۔

''میم! مجھے لگتا ہے میں تھکنے لگی ہوں، میں اب آگے کچھ نہیں کر پاؤں گی۔''

وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئی تھیں اور انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ ان کا پرفیوم بھی جیسے ایک مرہم کی طرح تھا جادو اثر رکھتا تھا۔

''میں کچھ نہیں سنوں گی ایسا ویسا۔ خبردار جواب تم نے کچھ ایسا ویسا سوچا بھی تو۔ اور رہی بات تمہارے ایم فل کی تو مجھے یقین ہے کہ تمہارا وظیفے پر داخلہ ہو جائے گا۔''

''مجھے شاید آگے پڑھنے کی اور اجازت نہ ملے۔''

''ہماری ینگ جنریشن مستقبل کے فیصلے مفروضوں پر کر لیتی ہے کنیزاں۔ ایسا کبھی بھی مت کرنا اس طرح انسان بے خبری میں مارا جاتا ہے۔ اور بے خبری کی موت سے بڑا دکھا اور کوئی نہیں ہوتا۔''

اخروٹ کی تلخ و شیریں مہک میں زندگی کی گئی گتھیاں سلجھتی رہیں۔

''آپ نے کبھی محبت کی ہے؟''

وہ سوال بہت ضروری تھا میم ڈیزی جیسے بنگور یونیورسٹی کی قدیم شاہی طرز کی عمارت میں پہنچ گئی

تھیں جہاں انہیں کئی پرنس چارمنگ للّی اور ٹیولپ کے گلدستے لے کر نظر آئے تھے۔ وہ کھنک دار ہنسی کے ساتھ حال میں آئی تھیں۔ سامنے بیٹھی تھل واسی دوشیزہ کو ان کے تجربے کی آنکھ نے ایک پل میں اسکین کر لیا تھا۔ انہوں نے جیسے کنیزاں کے دونوں ہاتھ تھام کر سرگوشی میں ایک گُر کی بات بتائی تھی۔

''ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا پیاری لڑکی۔ کسی بھی کیمیا دان کے تجربے کی کامیابی سو محبتوں پر بھاری ہوتی ہے۔''

☆.....☆.....☆

انسان کی زندگی بھی شاید کسی دھات کی طرح ہوتی ہے تاکہ انسان اپنے آپ کو، خود کو پیتل، سونا، چاندی یا ہیرا کر لے اور دنیا کے بازار میں اپنی قیمت مقرر کر لے کیونکہ دنیا ایسی بیوپاری ہے جو انسان کو اس کی قیمت کے عوض ہی خریدتی ہے۔

وہ پانچوں دور تک پھیلے ہوئے چٹیل میدان میں بیٹھی تھیں۔ سیرت نے کرکٹ کھیلتے ان لڑکوں کی طرف انہیں متوجہ کرتے ہوئے بیزاری سے کہا تھا۔

''جانے یہ لڑکے لوگ کھیل کھیل کر تھک کیوں نہیں جاتے۔''

''اس لیے کہ یہ ان کا شوق ہے تو شوق انسان کو کہاں تھکاتا ہے، بس یہی وجہ ہے کہ لگے رہتے ہیں۔''

''ہاں لیکن پھر بھی موسم بھی تو دیکھو سردی گرمی تک کی پروا نہیں ہوتی انہیں تو۔''

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ لڑکوں کی زندگی بہت آسان ہوتی ہوگی۔''

سیرت کی اس بات پر عدن نے جیسے چونک کر سر اٹھایا اور ہنسی بھی۔

''بس یہی تو بات ہے ہم یہی لیتے ہیں کہ دوسرے کی زندگی آسان ہوگی چاہے دوسرا کتنی ہی جنگ خود سے کیوں نہ لڑ رہا ہو۔''

''خیر، اب ایسی بھی بات نہیں، اگر دیکھا جائے تو لڑکیوں کی زندگی زیادہ مشکل ہوتی ہے۔'' یہ فلسفیانہ سا جواب کنیزاں کی طرف سے آیا تھا۔

''ایسا کیسے کہہ سکتی ہو۔''

''صرف اس لیے کہہ سکتی ہوں شاید کہ میں نے ان چیزوں کا تجربہ کیا ہے۔'' وہ جیسے ایک دم عجیب حالت میں آجاتی تھی تو وہ اردگرد سے بے نیاز ہو کر بولا کرتی تھی۔

''تو بتاؤ، تمہارے خیال میں لڑکیوں کے لیے کون کون سی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔''

''کیا ہمارے لیے یہی معرکہ کم ہے کہ ہمیں لڑکوں سے بہت تصور کیا جاتا ہے۔''

''تم ایسے ان چیزوں کو کیوں سر پر سوار کر رہی ہو۔''

''میں کسی بھی چیز کو سر پر سوار نہیں کر رہی۔ میں بس صرف اتنا کہتی ہوں کہ جتنے مواقع زندگی میں آگے بڑھنے کے لڑکوں کو ملتے ہیں اتنے ہی مواقع ہم لڑکیوں کو ملنے چاہئیں کیونکہ ہم بھی اسی طرح زندگی میں ڈیزرو کرتی ہیں۔''

تمکین کو وہ سب بور لگ رہی تھیں۔

''مجھے تو پتا نہیں ہم زندگی میں کیا ڈیزرو کرتے ہیں کیا نہیں کرتے بس ہم خواب دیکھ لیتے ہیں اور ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے ایک ان دیکھی ریس میں جت جاتے ہیں۔'' یہ جواب تمکین جمال کی طرف سے آیا تھا جو عبداللہ حسین کی اداس نسلیں تھامے خود ایک اداس مورت بنی بیٹھی تھی اور جس کے دماغ میں جانے کیا کچھ چل رہا تھا۔

''وہی بات ہے زندگی دھات ہے۔ اب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ پیتل کر لیں خود کو، سونا کر لیں، چاندی یا ہیرے، جانے کون سے خوش نصیب ہوں گے لوگ جو ہیرے بنتے ہوں گے۔''

یہ بات فردوس گوہر نے جیسے ہنس کر کہی تھی اور اس کی ہنسی میں بھی عجیب سا قرض تھا جو ان کو محسوس ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ابھی ڈھلتی ہوئی سہ پہر تھی جس کے شام ہونے میں بھی کافی وقت تھا۔ گل مہر کے جھنڈ سے فاختائیں پھڑ پھڑاتی ہوئی آسمان کو پرواز کر گئی تھیں۔ وہی سرمئی سڑکیں تھیں جہاں پر شور و غل اور قہقہوں کی برسات ہوتی تھی فٹ بال گراؤنڈ سے آنے والی آوازوں کو فراموش کیے وہ اسی سوچ میں تھیں کہ کیا

کھویا کیا پایا وقت نے انہیں کیا دیا؟

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ وقت اتنی جلدی گزر جائے گا اور اتنی جلدی سال ہم نے گزرا لیے۔'' تمکین جمال نے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

''وقت کا کام ہے گزر جاتا ہے پیچھے بہت ساری یادوں کو چھوڑ کر۔''

''صرف یادیں نہیں چھوڑتا وقت.....'' سیرت نے جیسے انہیں متوجہ کرتے ہوئے کسی اور موضوع کی طرف نکالنا چاہا تھا۔ ''بہت ساری پشمانیاں، شرمندگیاں اور پچھتاوے بھی تو چھوڑ جاتا ہے۔ یہ ہم پہ منحصر ہے کہ ہم واپسی سفر سے کیا لیتے ہیں۔''

''ہر چیز ہم پہ ہی آ کر کیوں منحصر ہو جاتی ہے کہ ہر چیز کے لیے خود کیوں قصوروار ہوتے ہیں؟ کیا ہمارا ماحول ہمارے اپنے قصوروار نہیں ہوتے۔'' یہ اکھڑا ہوا سوال بھی شاید سیرت کی طرف سے آیا تھا۔

کنیزاں نے سیرت کی اس بات پر اسے دیکھا تھا۔ ''تم آج کل ایسے سوال کیوں کرنے لگی ہو جن کے جواب تمہاری فیور میں نہیں جاتے۔''

''بس عادت ہو گئی ہے ایسے ہی سوالوں کی اور فیور چاہتا بھی کون ہے۔ اب زندگی سے مجھے کوئی فیور نہیں چاہیے۔ حقیقت یہی ہے کہ جو جیسا ہے اسے ویسا رہنے دو۔ زندگی اسی نامکمل اور مکمل کے چکر میں کہیں پوری ہو جاتی ہے اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔''

''پچھلے کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت عجیب و غریب باتیں کرنے لگی ہو۔'' عدن نے اسے ٹوکا تھا۔

''بس مجھے کبھی کبھی زندگی کی بے ثباتی سے ڈر آنے لگتا ہے۔''

وہ خوف زدہ ہوئی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سڑکوں کے کنارے عمارتوں پر ہلکے زرد اور سفید رنگ کے بلب جلنے لگے تھے۔ زرد زرد اور سفید روشنی کا امتزاج تھا۔ وہ بس پیدل مارچ کرتی رہی تھیں۔ وی سی گراؤنڈ سے کرکٹ گراؤنڈ تک، پی سی ڈھابے سے چیئرمین ہال کونسل آتے ہوئے وہ ہاسٹل روڈ پر نکل آئی تھیں۔ انہوں نے بہت ساری گفتگو کر لی تھی، وقت کو پَر لگ گئے تھے بہت جلد وہ

ایک دوسرے سے جدا ہونے والی تھیں۔ اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے وقت کے اس سفر میں خود کو کندن کیا تھا، سونا کیا تھا یا پیتل؟

بس یہی تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو ہیرا نہیں کر پایا تھا۔ کوئی بھی نہیں.....!

☆.....☆.....☆

نتاشا ابراہیم کے لیے گھر سے نکلنا بڑی بات نہیں تھی مگر آج گھر سے نکلتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بہت خوف زدہ محسوس کر رہی تھی۔ نیلم نے آج غور سے اپنے خود پر توجہ دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

''کچھ زیادہ ہی توجہ نہیں دے رہی ہو خود پر آج۔''

''ایک فنکشن ہے میں نے وہاں پر جانا ہے۔''

''کہاں فنکشن ہے؟ کس جگہ کی بات کر رہی ہو تم؟''

نیلم نے اپنے لہجے کو لاپروا کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ اردگرد ساری کترنیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ باجی کے جہیز کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ انواع واقسام کے کپڑے کا ڈھیر تھا۔ کریپ، شیفون، لیکلن۔ باجی پاس ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے گنگنا رہی تھیں۔ جب سے رشتہ طے ہوا تھا ان کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ رہنے لگی تھیں اور وہ بہت سنجیدگی کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ گنگنا رہتی تھی۔ اب بھی وہ فیض کی غزل دشت تنہائی میں اے جان جہاں گنگا رہی تھیں اور شاید قطعی طور پر وہ دونوں کی ہونے والی بحث سے بھی لاعلم تھیں۔

''ہاں بس وہ فردوس گوہر کے گھر ایک فنکشن ہے۔ تمہیں پتا تو ہے ان بڑے لوگوں کے گھر کتنے فنکشن ہوتے رہتے ہیں شاید انہیں تو موقع چاہیے ہوتا ہے کوئی نہ کوئی فنکشن کرنے کا اور بہت سارے لوگ گھر اکٹھے کرنے کا۔''

بالوں کی مانگ بھی بہت سیدھی نظر آ رہی تھی اور نیلم اسے یہ دیکھ کر سراہنے پر مجبور ہوئی تھی کہ وہ آج بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

''تو تمہیں کون لینے آئے گا؟''

''میں اوبر سے جاؤں گی۔''

تھوڑی دیر بعد اسے کوئی ٹیکسٹ ریسیو ہو گیا تھا تو وہ سلام کرتی ہوئی باہر کے دروازے سے نکل گئی تھی اور اپنے پیچھے خوشبو کا احساس چھوڑ گئی تھی۔

نتاشا نے جب اس کیفے کی بلڈنگ کو دیکھا تھا تو اسے سب کچھ جیسے شیشے کی روشنیوں کی چکا چوند بہت قیمتی لگا تھا، ایک پل کے لیے لگا تھا اس نے اپنے وجود کو ہیرا کر لیا ہے۔ ہیرا جس کی چکا چوند کے پیچھے ساری دنیا دیوانی ہوتی ہے ہر کوئی ہیرے کو پانا چاہتا ہے۔ وہاں رونق سی پھیلی ہوئی تھی اور خوشبوؤں کا جہاں تھا۔ جیسے ہی وہ کیفے میں داخل ہوئی تھی اس نے زرد بلب کی روشنی میں سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھا تھا جو مسکراتے ہوئے اس پر دیوانہ وار نظریں ٹکائے بیٹھا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس کی نگاہوں سے پیار کی بارش برس رہی ہو۔ وہ ہولے سے مسکراتی ہوتی ہوئی اور اپنے آپ کو کمپوز کرتی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ میں تمہیں لینے آ جاتا ہوں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں آ گئی ہوں گھر سے۔''

''آج تم بہت حسین لگ رہی ہو اور مجھے یہ اعتراف کر لینے دو۔''

''میں پہلے کبھی کسی کے ساتھ اس طرح باہر نہیں آئی۔'' نتاشا نے اسے بتاتے ہوئے کہا تھا۔

موسیٰ اس بات کی بات پر کھل کر ہنسا تھا۔

''انسان زندگی میں جب کوئی ایک کام کبھی نہیں کرتا تو وہی کام اسے کسی خاص شخص کے لیے کرنا ہی پڑتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ تمہارے لیے آج وہ خاص شخص میں ہوں۔ مجھے جانتی ہو ناں۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور محبت کرنے والے دھوکا نہیں دیتے۔ میں نے صرف تمہیں بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ صرف اس لیے کہ ہم ڈھیر ساری باتیں کر سکیں۔ جیسے ہم موبائل فون پر کیا کرتے تھے مگر اب تمہارے سامنے موجودگی ضروری تھی۔''

وہ بس اپنے ہاتھ میں پہنے ہوئے بریسلیٹ کو گھما رہی تھی۔

''میں تو صرف ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔'' نتاشا ابراہیم کی آواز میں بلا کا سکون تھا۔

''ہاں پوچھو میں جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ ایسے ہی سنبھل کر اچانک سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

''جاننا چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے اتنے متاثر کیسے ہو گئے؟ مجھ جیسی لڑکی سے کیسے محبت ہو گئی؟''

''تم جیسی لڑکی سے کیا مراد ہے محبت کے لیے انسان کون سا اسٹیٹس دیکھتا ہے۔''

''مجھے سب پتا ہے اپنا فیملی گراؤنڈ، اپنی تعلیم، حیثیت سب کچھ۔ مگر میں نے محبت کی کئی کہانیاں سنی ہیں اور آج شاید میں بھی اسی کسی کہانی کا حصہ ہوں۔''

رنگ برنگی شام تھی اور اس میں قوس قزح کے سارے رنگ سلامت تھے۔ کاش پتا ہوتا نتاشا ابراہیم کو کہ آنے والے وقتوں میں وہ سارے رنگ سیاہ جانے والے تھے۔ سیاہ تاری، اور اندھا کر دینے والے جس سے انکی بینائی چھن جانے والی تھی۔ وہ شخص لفظوں کا جادوگر تھا اور اس نے اپنی جادوگری سے اسے قابو کیا تھا۔

''مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب بھی میں تم سے بات کر رہا ہوتا ہوں اور اپنے گھر کے ٹیرس میں کھڑا ہوتا ہوں تو میں تمہیں اندرون لاہور کے ایک پرانے قدیم گھر کی بالکونی میں کسی مغلیہ شہزادی جیسا تصور کرتا ہوں۔''

وہ لچھے دار باتیں اسے پگھلا رہی تھیں۔ وہ خوف جو ہر لڑکی دیکھا کرتی ہے وہ جیسے تکمیل کو پہنچ رہے تھے۔ وہ بس جادوگر کو سن رہی تھی اسے پتا ہی نہیں تھا کہ جادوگر الٹے پاؤں پلٹ جاتے ہیں۔ جادو کا اثر بھی کچھ دیر تک رہتا ہے اس کے بعد سب کچھ ختم ہو کے رہ جاتا ہے۔

اس کی خوشی اور مسرت کو فردوس گوہر نے بہت جلدی نوٹ کر لیا تھا۔

''کیا بات ہے نتاشا بہت خوش دکھائی دیتی ہو۔''

''کوئی بات نہیں ہے۔''

''نہیں پھر بھی کوئی بات تو ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔''

فردوس نے ایک دن اسے پکڑ لیا تھا جب وہ اٹالین گلدان میں کچھ نقلی آرائشی پھول سجا رہی تھی

اور وہ آرائشی پھول دیکھنے میں بالکل ہی اصل پھولوں کی طرف دکھائی دیتے تھے جن کی وہ جی بھر کر تعریف کر چکی تھی۔ اور اس کے اس تعرفی انداز پر فردوس گوہر نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

''تم نقلی پھولوں کی تعریف کر رہی ہو جو صرف دیکھنے میں خوب صورت ہیں۔''

''ہاں میں جانتی ہوں مگر ی خوب صورت تو ہیں ناں گوہر، ان کا رنگ دیکھیں یہ بالکل اصل دکھائی دیتے ہیں۔''

''ہاں یہ تب خوب صورت ہوتے جب یہ کسی باغ میں پودے پر سجے ہوتے اور ان کی خوشبو بھی ہوتی۔ انسان کو پھولوں کو اسی وجہ سے محبت ہوتی ہے کیونکہ وہ خوشبو دیتے ہیں۔''

''میں آپ سے کبھی بھی کسی بھی طرح کوئی چیز نہیں چھپا سکتی بس یہی بات ہے میں آج کل ویسے ہی خوش رہنے کی کوشش کر رہی ہوں کیونکہ زندگی میں اتنے مسئلے ہیں کہ مجھے لگتا ہے مجھے خوش ہونا چاہیے چاہے لمحے بھر کا فرار ہی سہی۔''

فردوس گوہر کے گرد بھی جیسے سوچوں کا جنگل آباد ہو گیا تھا۔ اس نے بھی زندگی میں خوش رہنے کی بہت کوششیں کی تھیں اور انہی کوششوں کی کامیابی میں اس نے خلیل جیسے انسان کو اپنا دوست پایا تھا۔ وہ شخص جس کے سامنے وہ اپنا راز سامنے آنے سے خوف زدہ رہا کرتی تھی اس نے اسے راستے میں پکڑا تھا اور عجیب حوصلے کی دیوار کھڑی کر دی تھی جسے کوئی پار نہیں کر سکتا تھا۔

''گوہر ہم دوست ہیں۔ میں نے یہ مان لیا ہے آپ بھی مان لیں۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کی اور ڈیڈ کی اجازت کے بنا میں نے آپ کی فائل ہسٹری پڑھ لی تھی۔ آپ سے مل کر مجھے لگتا ہے کہ امپریشن میں ہی حسن پوشیدہ ہوتا ہے۔''

وہ بہت گہری باتیں کرتا تھا ادھر ادھر کی دنیا جہان کی..... مثبت رخ دکھانے کی، تب اسے ریشمی یاد آئی تھی۔

اس دن شام کی چائے پینے وہ ڈاکٹر طلال کے ہاں آئی تھی۔ جہاں اس نے اور خلیل نے روسی ادب پر بات کی تھی۔ جیمز کیمرون اور کچھ اسپینش سینرز پر تبصرے کیے تھے۔

وہ دونوں ایک موبائل اسکرین پر کچھ دیکھ کر قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔ وہ دونوں بالکل پاس بیٹھے تھے یہاں تک کہ گہری سانس لے کر ایک دوسرے کے پرفیوم کی خوشبو اپنے اندر اتار لیتے۔ کھلے ہوئے صدر دروازے سے اندر عدن جبار نے قدم رکھا تھا اور وہ لان میں نظر آئے تھے۔

فردوس گوہر جو ایک اپسرا تھی۔

خلیل جو ایک دوست تھا۔

عدن جبار جو ایک داسی تھی جو کھیلن کو چاند مانگتی تھی اور اسے چاند مل بھی جاتا تھا۔

وہ ڈرائیووے سے ہولے ہولے پیچھے ہٹ گئی تھی۔

سب ختم ہو گیا تھا۔

اختتام زندگی کی شرف تھی

تمام ہر ہر عشق اور ہر انس ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول **لا** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

باب چہاردہم

دیوانے

عمراں لنگھیاں پبھاں پار
ہالے نہ دس وے کاہلیا
پردیس کیوں پردیسی ہوئیوں
کملی کر کے چھوڑ دیتو نہ ایں
نہ میں بیٹھی خاک گلیاں تے رولاں
سرخ گلاباں دے موسم وچ
پھلاں دے رنگ کالے
اچیاں لمیاں لال کھجوراں
تے پتر جٹاں دے ساوے
ننگے پنڈے مینوں چھمکاں مارے
تے میرے روندے نین نمانے

کچھ دیوانے دل ہوتے ہیں۔ نفع اور نقصان میں سے صرف ایک ہی چیز پر ان کی نظر ہوتی ہے۔ یا نفع کا سودا کرتے ہیں یا پھر ہمیشہ کے لیے تہی دست پھرا کرتے ہیں۔ یہی کھیل ہے جس کا کوئی اصول نہیں ہوتا کہ جو دیوانے دل ہوتے ہیں ان کا مرکز ایک ہی ہوتا ہے یا تو سب روشنی یا پھر گھپ اندھیرے اور تمام.....تمام.....!

☆.....☆.....☆

سرخاب خان جامعہ پنجاب کی اس اپسرا کے سحر سے فرار ہو کر پہاڑوں میں پناہ لینے بھاگ آیا تھا۔ پہاڑوں کو سفید برف نے ڈھک لیا تھا۔ دیار کی چوٹیوں پر سے اب بھی برف گرتی رہتی تھی اور یہاں وہ پہاڑی حقیقت پسند لڑکی رہتی تھی جسے دنیا درنجف کے نام سے جانتی تھی اور جس کے پاس دیار اور صنوبر کے درختوں کی گنتی سے بڑھ کر کوئی کارآمد مشغلہ نہیں تھا۔ سرخاب خان کو تو بس اس کی ایک ہی بات ابھی تک یاد تھی اور وہ درنجف کے ظرف کی داد دیتا تھا۔ گھا گھرے میں پڑی چنٹیں ٹھیک کرتی، لکڑیوں کو چولہے میں برابر کرتی وہ درنجف تھی۔ جس کو معلوم تھا کہ لمحوں کی واردات کیا ہوتی ہے؟ تبھی اس نے سرخاب خان کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا۔ جب اس نے اسے جامعہ کی جادوگرنی سیرت امتیاز کے بارے میں آگاہ کیا تھا جو لمحوں کو دوست کہا کرتی تھی۔ سرخاب نے درنجف کو آزمانے کی سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

خوبانیوں کے باغ میں گلی سڑی خوبانیوں کی باس سونگھنے کی حس ناگوار تھی۔

''میں دل نہیں بدل سکتی تمہارا۔ میرے ظرف کو اگر کبھی ماپنا ہو تو علاقے کے سارے پہاڑ ذہن میں رکھنا شاید ان سے بھی زیادہ وسعت ہو میرے دل میں۔ سب کی چاہ الگ لگ ہوتی ہے مجھے صرف تمہارے نام کی چاہ ہے کہ فقط درنجف سرخاب کہلوائی جاؤں اور بس۔ مورے کہتی ہیں کہ میں پاگل ہوں، جھلی ہوں جو اپنے بندے کو کسی دورے کے حوالے کرنے کا سوچ رہی ہوں۔ مورے میری ماں ہیں مگر وہ بھی میرے ظرف کو نہیں جانتیں۔ تم اس کے سامنے جانا تو میرا نام لے کر کہنا کہ درنجف بھی سرخاب خان کے نکاح میں ہے اور صرف نام چاہتی ہے تو کیا وہ صرف نام کی حد تک مجھے قبول کر لے گی؟ اگر وہ ہاں کہہ دے تو مجھے بتا دینا میں اخروٹ کا حلوہ تقسیم کروں گی۔ اگر وہ انکار کرے تو تین طلاق کے پتھر بھجوا دینا۔ تمہارا نام نہ سہی مگر پتھر ہی سہی جو نصیب میں ہو مل کر ہی رہتا ہے۔''

اب وہ پہاڑوں میں لوٹا تھا تو درنجف نے اس کے سامنے قہوہ پیش کرتے ہوئے بغور اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت ساری الجھنوں کا شکار دکھائی دیتا تھا۔

الائچی کی خوشبو سارے میں پھیل گئی تھی۔ وہ شہد چاٹ رہا تھا جب بہت ہی میٹھے لہجے میں اس نے مورے کو متوجہ کیا تھا۔

''میں اسی ہفتے درنجف سے شادی کرنے کا ارادہ لے کر واپس آیا ہوں۔''

صنوبر کی چوٹیاں تڑاتڑ برف کے بوجھ سے گر کر ٹوٹ گئی تھیں۔ درنجف کا دل جیسے دھڑ دھڑ دھڑ کا تھا۔

مورے کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ اس کا ماتھا چوم رہی تھیں۔ درنجف نے چوری سے دوپٹے کی اوٹ سے اسے دیکھا تھا اور چونک کر رہ گئی تھی۔

سرخاب خان کے چہرے پر لمحوں کی واردات کا عکس واضح تھا۔

☆.....☆.....☆

دیوانے دل میں اپنی اپنی دیوانگی کے ساتھ محفلوں میں رنگ بھرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ وقت نے دوڑ لگا دی تھی اور سب کو جیسے اب خیال سا آیا تھا اور انہوں نے وقت کو کئی کوسنے دیے تھے اور وقت کو رتی بھر بھی فرق نہ پڑا تھا کیونکہ وہ وقت ہے وہ اس سب سے پرے ہے.....!

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے در و دیوار نے ان آنکھوں کے خوابوں کو دیکھا تھا، موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ شعبہ ابلاغیات کی عوام پر جیسے ایک ساتھ زمانے بھر کی مصروفیات نے دھاوا بول دیا تھا۔

تمکین نے ہنس کر خبر کی تعریف میں ترمیم کی تھی۔

''وقت انسان کو کالے تو یہی خبر ہے۔''

عملی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ اخباری دفاتر کے چکر لگنے شروع ہو گئے تھے۔ شہ سرخیوں کی تعریفیں، ایڈیٹوریل اور فیچرز کے موازنے، اخبار کی پالیسیوں سے لے کر کاغذ کے مہنگے ہونے تک کو ڈسکس کیا گیا تھا۔

مختلف ٹی وی چینلز کا رخ کیا گیا تھا۔ نیوز روم سے لے کر پر، ایز فائیو تک سے آگاہی حاصل کی گئی تھی۔ اس سارے سلسلے میں نیوز چینل اور اخباری دفاتر میں بیٹھے تجربہ کار لوگوں نے انہیں اپنے تجربات سے آگاہ کیا تھا۔

http://kitaabghar.com

''سب سے پہلے وہ سیاسی بڑی خبر میں نے بریک کی تھی۔''

سیرت کو کھجلی ہوئی تھی۔''ہاں اس کے بدلے آپ نے جیل بھی کاٹی تھی۔''

اگلا بندہ جیسے خفیف سا ہو گیا تھا۔تمکین نے اسے چٹکی کاٹی تھی۔

''تم کیوں زرد صحافت کا مظاہرہ کرتی اگلوں کے کچے چٹھے ان کے سامنے پیش کر رہی ہو۔''

وہ دونوں بحث میں الجھتی رہیں.....زندگی بہت مصروف سی ہو گئی تھی۔

ڈیجیٹل میڈیا کے حوالے سے سیمینارز.....شارٹ فلمز کے پراجیکٹس کی میٹنگز۔پرنٹ میڈیا والے اپنے تھیسز کے ٹاپک اپروول کے لیے جان توڑ محنت کر رہے تھے۔

سیرت اور تمکین نے پرنٹ میڈیا کو درپیش مسائل جیسے اہم ٹاپک کو تھیسز کے لیے چنا تھا۔

فردوس اور عدن نے شارٹ فلم پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا تھا۔

کنیزاں اپنے ڈپارٹمنٹ میں مس ڈیزی کو ایک تجربے میں اسسٹ کر رہی تھی۔

وہ ان سب کے یونیورسٹی میں آخری دن تھے کہ بعد میں سب خواب ہو جانا تھا بعد میں سب نے ناسٹلجیا کے مریضوں کی طرح بات بہ بات انہی یادوں اور گزرے ہوئے وقت پر ہی زندہ رہنا تھا۔

جامعہ کا ماحول ہی ایسا ہے کہ اسیر کر لیتا ہے کہ پھر پوری دنیا میں کہیں بھی پناہ نہیں ملتی۔چاہے جتنے بھی جتن کر لو.....!

وہ اسی بات کو ڈسکس کر رہی تھیں جب کنیزاں نے دکھی لہجے میں اپنا اظہار خیال ان تک پہنچایا تھا۔

''مجھے لگتا ہے یہ انسان اور ان کی محبتیں سب عارضی ہوتی ہیں۔ہم سب بھول بھال جاتے ہیں۔کیونکہ انسان آگے بڑھ جاتے ہیں اور سب کچھ پیچھے چھوٹ جاتا ہے مگر جگہیں وہیں کھڑی رہتی ہیں۔ہماری منتظر ویسی کی ویسی۔چاہے کتنے برسوں بعد بھی پلٹ کر آؤ تو وہیں کھڑی خوش آمدید کہتی ہیں۔پھر سے اپنا لیتی ہیں مگر انسان نہیں کرتے ایسا۔وہ سب بھول جاتے ہیں۔محبتیں،تعلق۔سب خواب ہو جاتا ہے۔''

سیرت کو اس کے لہجے نے جیسے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔وہ کسی خوف کی زد میں آ گئی تھی۔وہ بھی تو

آگے بڑھ آئی تھی جیسے سب پیچھے چھوٹ جائے گا۔ کچھ ہی تو دن ہیں۔ ہر کوئی اپنی راہ نکل جائے گا!

عدن پچھلے کئی دنوں سے فرش کو نظر انداز کر رہی تھی اور یہ بات فردوس محسوس بھی کر چکی تھی مگر عدن کے جامد تاثرات اسے کوئی بھی بات کرنے سے روک دیتے تھے۔ اب بھی وہ ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور میں عدن کے ساتھ کھڑی تھی۔

''عدن! کوئی بات بری لگی ہے کیا؟''

عدن نے فردوس گوہر کے چہرے کے خدوخال کو بہت غور سے دیکھا تھا، واقعی وہ اتنی ہی حسین تھی کہ کسی بھی مرد کا دل پھیر سکتی تھی۔ خلیل بھی تو ایک مرد تھا، کتنا آسان رہا ہوگا اسے خلیل کو اپنے جھانسے میں کرنا۔ فی الحال عدن جبار کے پاس کوئی ترازو نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کے تعلق کو ماپتی۔

''مجھے اچھا یا برا لگنے سے کیا ہوتا ہے فردوس۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔''

وہ آگے بڑھی تھی اور فردوس پیچھے پیچھے تھی جب موسیٰ نے بھی اسی کوریڈور میں قدم رکھا تھا۔

''ہائے عدن۔ یار! کل شام فوڈ اسٹریٹ کو کوزڈین پر میں نے فردوس اور خلیل کو دیکھا تھا تم مجھے وہاں نظر نہیں آئیں۔ خیریت تھی؟''

وہ دونوں تھم سی گئی تھیں۔ عدن کو کسی نے چاک چاک کر دیا تھا۔ فردوس گوہر نے اس کے چہرے کو سلیٹی ہوتے دیکھا تھا۔ وہ موسیٰ پر غصیلی نظر ڈالتی عدن کے پیچھے بھاگی تھی جو سخت غصے میں وہاں رکی ہی نہیں تھی!

☆.....☆.....☆

کانچ ٹوٹنے کی آواز نے اس عظیم الشان گھر کے در و دیوار کو جیسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ عدن جبار تھی جس کا مزاج آتشیں تھا..... آگ ہی آگ۔ وہ ہر آئینے میں خود کو دیکھتی تھی، کاملیت کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی تھی۔ وہ بس ایک ہی لائن میں مکمل ہوتی تھی کہ جو میرا ہے صرف میرا ہے۔ اور دنیا تو بٹی ہوئی ہے کہ جہاں ہر چیز کئی جگہ تقسیم ہوتی ہے۔ چیزیں، انسان، رشتے اور محبت!

وہ خلیل اور گوہر کو اتنے قریب دیکھ کر شاک میں نہیں آئی تھی بلکہ کسی ٹراما سے گزری تھی جس نے اس

کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ دونوں جانے کب اور کیسے ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے؟

وہ دونوں کی پروفائل دیکھتی رہی تھی جہاں ان دونوں کے ایک دوسرے کی پوسٹس پر کمنٹس نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں بار بار برستی تھیں۔

عدن جبار نے اپنے غصے پر ہر ممکن قابو پانا چاہا تھا مگر وہ چاہ کر بھی نہیں کر پائی تھی پھر تو جو جو ہاتھ لگا تھا وہ اس نے اٹھا اٹھا کر دیواروں پر مارنا شروع کر دیا تھا۔ ملازم اس کا یہ پاگل پن دیکھ کر لونگ روم سے باہر دوڑ گئے تھے۔ کانچ کے کئی ڈیکوریشن پیسز ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ جب وہ تھک گئی تو فرش پر دائرے کی صورت بیٹھ گئی تھی۔

مسز جبار نے جب ہال میں قدم رکھا تو ایک پل کو حیران پریشان رہ گئی تھیں۔ اور پھر ہر طرف بکھرے ہوئے کانچ سے بچ بچا کر ان کی نظر سامنے بیٹھی عدن جبار پر پڑی تھی۔ وہ بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر تڑپ گئی تھیں اپنی زندگی میں وہ دوسری بار اسے اس طرح دیکھ رہی تھیں۔ پہلی بار تب جب وہ او لیول کے ایک اسپورٹس ایونٹ میں بی منٹن ہار گئی تھی۔ جانے آج اس نے کیا ہارا تھا۔

''کیا ہوا عدن..... میری جان؟'' وہ اسے ساتھ لگائے پوچھ رہی تھیں۔

وہ لرز رہی تھی جیسے خود پر قابو پانا مشکل لگ رہا ہو۔ آنکھوں کا مسکارا پھیل گیا تھا۔ ڈرے ڈرے ملازم آس پاس بکھرا ہوا کانچ چن رہے تھے وہ کن انکھیوں سے ان ماں بیٹی کو بھی دیکھ لیتے تھے۔

وہ اسے ساتھ لگا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھیں۔ کمرے میں موجود فریزر سے پانی کی بوتل نکال کر اسے تھمائی اور ٹشو باکس سے ٹشو کھینچ کر اس کا چہرہ صاف کیا۔ وہ آہستہ آہستہ پانی کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

کمرے میں پن ڈراپ سائلنس تھا، وہ جھولنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے بس اسے دیکھتی رہی تھیں۔ وہ ان کی بیٹی تھی ان کے دل کے قریب جس کے چہرے پر جما ہوا درد ان کو ہولائے دے رہا تھا، مگر وہ خود کو صبر پر آمادہ رکھے ہوئے تھیں، اسے سن سکیں تاکہ بعد کے تسلی دلاسے پر وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر سکے۔

''مام! اس نے مجھے چیٹ کیا۔'' اس نے اب ہولے ہولے بولنا شروع کیا تھا۔

''کس کی بات کر رہی ہو تم عدن؟''

''خلیل نے۔'' رندھا ہوا لہجہ۔

''تم نے اس سے اس بارے میں بات کی ہے؟'' وہ بہت دھیمے لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''وہ مجھے مسلسل کئی ہفتوں سے اگنور کر رہا ہے۔ کہیں بھی جانے کا کہوں تو منع کر دیتا ہے اور میں کافی عرصے سے نوٹ کر رہی ہوں اور آج میں نے اسے فردوس گوہر کے ساتھ دیکھا ہے۔''

وہ جیسے اب بھی وہیں ڈرائیو وے پر کھڑی تھی۔ سامنے لان تھا جہاں وہ ایک دوسرے کی طرف جھکے موبائل پر کوئی ویڈیو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ اتنے قریب کہ ایک دوسرے کے پرفیوم کی مہک مہک فیل کر سکتے تھے۔

''فردوس تمہاری یونیورسٹی کی دوست؟''

''ہاں وہی۔''

''وہ خلیل کو کیسے جانتی ہے؟'' وہ حیران ہوئی تھیں۔

''میں نے خود ان کو ایک دوسرے سے ملوایا تھا۔ تب سے ان کی واقفیت ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ میری دوست ہو کر اتنی چالاک نکلے گی اور خلیل کو اپنی طرف مائل کر لے گی۔''

وہ زہر لہجے میں بول رہی تھی۔

مسز جبار اپنی بیٹی کے اس لہجے سے خوب واقف تھیں وہ خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اپنے باپ سے زہر لہجہ بھی لے چکی تھی۔ انہوں نے خود کو نارمل کرنے کو گہری سانس لی تھی۔

''میں نہیں جانتی تمہاری دوست فردوس اور خلیل کے درمیان کیا ہے، مگر میں اتنا ضرور کہوں گی عدن، کہ زندگی میں جلدی سے کبھی کام نہیں لیتے۔ چیزوں کو کلیئر کرتے ہیں پھر فیصلہ سناتے ہیں۔ تمہیں اس سے پہلے خلیل اور گوہر سے بات کرنی چاہیے تھی۔ خود کو نقصان پہنچانے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔ آج مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے اپنے باپ سے خوب صورتی اور زہر لہجہ لیا ہے مگر مجھ سے شاید صرف تم نے بے وقوفی ہی لی ہے۔ ایک ایسا ہنر جس کی کہیں کوئی قیمت نہیں۔''

''مام! پلیز۔ڈونٹ سے ویٹ۔''

''تم آج کل کے بچے کنفیوزڈ جنریشن ہو۔تمہارے مسئلے سارے خیالی ہوتے ہیں، بیٹھے بیٹھے خود سے بہت کچھ گھڑ لیتے ہو۔سوائے ایک چیز کے۔''

وہ اپنے کمرے کی قد آدم کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھیں۔کمرے کا پینٹ سفید رنگ کا تھا پرسکون کر دینے والا۔روشن اور ٹھنڈا۔عدن کو اس کمرے کا ماحول جیسے ٹھنڈا کر گیا تھا۔

''کون سی چیز؟'' وہ پوچھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔جانے مام نے اتنی دلچسپ گفتگو کرنا کہاں سے سیکھا تھا۔

''سروائیول۔مسئلے گھڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔اس صدی میں ریلیشن شپس کو کیسے لے کر چلنا ہے کس رشتے کو کتنی اسپیس دینی ہے۔یہ سب سیکھو عدن۔لوپ ہولز (کمیوں) کو ساتھ لے کر چلنا اور انہیں ٹھیک کرنا سیکھو۔خود میں برداشت کا مادہ پیدا کرو۔''

وہ ننگے پاؤں چلتی ہوئی پیچھے سے آئی تھی اور ان سے لپٹ گئی تھی۔گلا رندھ سا گیا تھا۔دروازے میں ونڈ چائمز بجنے لگے تھے۔

''مام۔سچ بتاؤں میں خلیل کے بغیر نہیں رہ سکتی۔مجھے اس سے محبت ہے۔''

وہ آج کھلے الفاظ میں اعتراف کر گئی تھی۔مام نے مڑ کر اس کی پیشانی کو چوما تھا اور اس کی آنکھ میں پھیلے مسکارے کو درست کرتے ہوئے کہا تھا۔

''محبت خصوصی جذبہ ہے اور اسے خصوصی ترکیبوں سے ہی لے کر چلنا پڑتا ہے ورن اس کا سانچ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔یوں سمجھو کچی مٹی کا برتن ہے اس کے ٹمپریچر کا خیال ضروری ہے۔ورنہ بے ڈھب ہو کر شناخت کھو دے گا۔جیسے میں اور تمہارے ڈیڈ ایک بے ڈھب رشتے کو شکل دینے میں لگے ہوئے ہیں۔مجھے نہیں معلوم کچھ ٹھیک ہوگا بھی یا نہیں.....مگر کوشش میں کوئی حرج بھی نہیں۔''

لیمن گراس کی گھٹی مہک گارڈن سے امڈ رہی تھی۔عدن جیسے کچھ سکون کی کیفیات میں سفید دیواروں والے کمرے سے باہر آئی تھی۔مام نے اروندھتی رائے کی کتاب اٹھالی تھی۔

☆.....☆.....☆

ریت کے ٹیلوں پر سے فجر سے اونٹ گزرتے تھے تو ان کی ٹلیوں کی گونج دور دور تک سنائی دیا کرتی تھی، ایسے میں وہ جاگ کر وضو کرتی پھر سکندر کو جگاتی تھی، تب تک چولہے میں آگ بھڑک جاتی تھی تو کتنی ہی دیر وہ انگاروں کو جلتے بجھتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ ویسے ہی جیسے بچپن میں وہ اور کنیزاں راکھ کرید کرید کر سوئے ہوئے انگاروں کو جگایا کرتی تھیں۔ اب نہ بچپن رہا تھا اور نہ ہی وہ کنیزاں۔ سب بدل گیا تھا۔

وہ دونوں کئی کئی دن ایک دوسرے سے نظریں چرائے پھرتے رہے تھے۔ وہ بس کام کی بات کرتی تھی جسے سن کر وہ مطلوبہ کام سرانجام دے کر چپ سارہ جاتا تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ جس رشتے میں وہ دونوں بندھ گئے تھے وہ رشتہ کوئی عام تعلق نہیں تھا، وہ ایک سند تھی جس نے انہیں ایک دوسرے کے لیے حلال کیا تھا۔ دنیا میں حلال سے بڑھ کر سکون دینے والی کوئی چیز بھی ایجاد نہیں ہوئی۔

رابیل کے سفید پھولوں والے گملے اب پانیوں سے تر رہنے لگے تھے۔ سارا صحن صاف ہی رہتا تھا کیونکہ وہ وقفے وقفے سے جھاڑو لگاتی رہتی تھی۔ عجیب صفائی کا خبط سا رہتا تھا اسے چاچی اسے دیکھ کر بس مسکراتی رہتی تھیں۔

''بختاور! دیکھ تیرے آنے سے ہمارا ویڑہ سج سا گیا ہے۔''

آٹا گوندھتے ہوئے چوڑیوں کی چھن چھن سے بیزار بختاور سر اٹھا کر نیم کے زرد پتوں والے اس آنگن کو دیکھا کرتی تھی۔ دل میں اچانک کوئی خیال وسوسے سا اتر آتا تھا۔

''کہاں کا ویڑہ چاچی۔ مانگے کا آنگن ہے، شاید مال غنیمت ہی ہے جو قدرت نے میری جھولی میں ڈال کر مجھ نمانی پر احسان کر دیا ہے۔''

نمانی بختاور نے زندگی میں در آنے والی اس جنگ کو اپنے طور سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔ سارا آنگن چمکتا ہوا ملتا تھا۔ نیم کے درخت کو بھی ہول پڑ جاتے تھے کہ وہ اتنی پھرتیلی تھی کہ پتا گرا نہیں اور صفائی کو وہ لپکی نہیں۔

مٹی کی کیاریاں کھود کر اس نے نت نئے گلابوں کی قلمیں لگا دی تھیں۔ کروشیا تھامے وہ اون

کے گولے پھیلائے رکھتی تھی اور بس سر جھکائے سلائیاں تھامے وہ ہاتھ جلاتے ہوئے گھر بناتی جا رہی ہے۔ بناتی جا رہی ہے۔ اس کے اون کے گولے کبھی بھی نہیں الجھتے تھے۔

چاچی نے ہمیشہ اسے سکندر کے سامنے مؤدب اور تازہ کھانا پیش کرتے ہی دیکھا تھا۔ وہ کھانا بنانے میں بہت محنت کرتی تھی اور چاچی بس خیرانی سے اسے دیکھے جاتی تھیں۔

''بختاور ے! تو کتنی سیانی ہے ناں۔ تو نے اتنا کچھ کہاں سے سیکھا ہے؟''

''کہاں سے سیکھنا تھا بھلا چاچی۔ خود ہی یونہی سیکھ لیا بیٹھے بیٹھے۔''

''مجھے بھی بہت شوق تھا سندھی اور کشمیری ٹانکوں کا مگر اب تو نظر ہی نہیں ٹھہرتی ہے مگر تجھے دیکھ کر مجھے بہت تسلی ہوتی ہے۔''

وہ اون لپیٹتے ہوئے بس مسکرائے جاتی تھی۔

کبھی کبھار شانو اور زرقا لپک جھپک آ جاتی تھیں اور ان کے پاس ہمیشہ ہی اب ایک ہی موضوع گفتگو ہوا کرتا تھا۔

''سکندر سے تیرا تعلق کیسا چل رہا ہے؟'' وہ بہت اشتیاق سے اس کے چہرے سے اندازے لگانے کی کوششیں کرتی تھیں۔

''مجھے تو سب ٹھیک لگتا ہے شانو۔ وہی ہے جو ایک شوہر اور بیوی میں ہوتا ہے۔''

''وہ تیرا خیال تو رکھتا ہے ناں؟''

خیال کی بات پر جیسے وہ چونکی تھی اس رخ پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کا خیال اور پروا کرتا ہے یا نہیں۔

کچھ دن گزرے تھے کہ گزرتا ہوا پوہ تھا جب اس کو تاپ نے گھیر لیا تھا اور وہ حرارت میں پھنکتی ہوئی زمان و مکان سے بے نیاز بے سدھ سوئی رہتی تھی۔ انہی دنوں میں وہ اونٹ بان بختاور نمانی کو کچھ کچھ پریشان سا دکھائی دیا تھا۔

سارے صحن میں نیم کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ پھولوں کے گملے پانی کے بغیر سوکھنے لگے

تھے۔ چوڑیوں کی کھن کھن بھی کم سنائی دیتی تھی۔

وہ حکیم صاحب سے دوا لے آیا تھا اور رات کو کڑے ہوئے دودھ کا پیالہ اور دوائی ہتھیلی پر رکھے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ بختاور مکمل غنودگی میں تھی۔

''سنو! یہ دوا لے لو دودھ کے ساتھ۔''

وہ اٹھنے کی کوشش میں سسکیاں لے کر رہ گئی تھی۔ پسلیوں میں درد اٹھنے لگا تھا۔ وہ بے دم ہو کر گری تھی۔ نقاہت نے اسے بالکل ہی نڈھال سا کر دیا تھا۔

سکندر بالکل بستر میں اس کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اسے ہاتھ تھام کر بٹھایا تھا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی سندور تھا جس نے سکندر کو جلا کر رکھ دیا تھا۔

ریت کے ٹیلوں پر رات ٹہل رہی تھی بادلوں کے پار سے چاندرات کے ساتھ راز و نیاز میں مگن تھا۔ وہ بمشکل دودھ پی کر اس کے کندھے پر ڈھلک گئی تھی۔ اور سکندر رضائی اوڑھے اسے تھپکتا رہا تھا۔ کھڑکی کے پار سے چاند اور رات نے چوری سے کمرے میں جھانکا تھا۔

''وہ تھل واسی شخص لفظ خیال'' کی مکمل تعریف تھا جو بختاور کو آہستہ آہستہ تھپک رہا تھا۔ وہ اپنا آرام و سکون بھول گیا تھا۔

آج لگ رہا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں کتنی بڑی تبدیلی لے کر آئی تھی۔ گھر اب واقعی میں گھر لگنے لگا تھا۔ اماں اور اس کی ہنسی کی آوازیں جیسے اسے سکون دیتی تھیں۔ بختاور کے قدموں کی آہٹوں پر وہ متوجہ ہو جاتا تھا۔ کروشیا کی سلائیاں اور اون کے گولے وہ لپیٹ کر رکھتی تھی تو وہ انہیں کھول کر دیکھا کرتا تھا۔ اسے کتنا شوق تھا کشیدہ کاری کا۔

اسی رات کی اگلی صبح اماں اور ابا آئے تو اسے گھر لے آئے تھے۔ پھر سے وہی آنگن تھا جہاں اس نے زندگی کی پچیس بہاریں دیکھی تھیں۔ بھینسوں کا باڑا۔ کھڑونچی پر ٹنگے اماں کے اسٹیل کے برتن۔ گارے سے لپی ہوئی کوٹھی جہاں چولہے کے گرد وہ جھرمٹ ڈال کر بیٹھا کرتی تھیں۔

وہ کافی دیر بس صحن میں یونہی چلتی پھرتی رہی تھی۔ ماضی میں سے بہت کچھ زندہ ہو کر سامنے آ رہا تھا۔

طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ باورچی خانے میں گھسی ابا کے لیے ویسی مرغ کی یخنی بنانے لگی تھی اور اماں دودھ سنبھال رہی تھیں۔

''بختاورے! تجھے کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں؟''

''نہیں اماں۔ میں بالکل بھلی چنگی ہوں بس موسم کی وجہ سے بخار ہے۔''

اماں کو وہ کئی بار آنسو چھپاتے دیکھ چکی تھی۔

''اماں! آپ پریشان ہیں کیا؟''

وہ چولہے میں سوکھا کپاس کا ایندھن ڈالے اماں سے پوچھنے پر مجبور ہوئی تھی۔

''سچ بتایئے گا اماں۔''

بس پوچھنے کی دیر تھی کہ وہ اکلاپے کی ماری اماں پھوٹ پھوٹ کر زمین پر رلتے گرد آلود دوپٹے کو منہ پر رکھ کر رو پڑی تھیں۔

''بختاورے۔ میں اور تیرا پیو تیرے قصوروار ہیں کہ تجھے اپنی پگڑی کے لیے ایک ایسے کھونٹے سے باندھ دیا جو سمجھوتے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔''

وہ ابلتی ہوئی یخنی بھول گئی تھی۔ کپاس کی لکڑی نے آگ پکڑ لی تھی۔ ہلکا سا کسیلا دھواں اٹھنے لگا تھا۔ وہ بھاگ کر اس لٹی پٹی عورت تک پہنچی تھی جو اس کی ماں تھیں۔

''ہائے نی امڑی۔ کیا کیا سوچتی رہتی ہیں آپ۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو قدرت کو منظور تھا وہی ہوا۔ آپ کا اور ابا کا کوئی قصور نہیں اور دیکھیں آپ کی دھی تھل کے سب سے اچھے پکے گھر کی مالک ہے۔''

وہ ماں کے ساتھ لگی ان کے آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی رو پڑی تھی۔ بکریوں کا دودھ نکال کر بالٹی کے اندر لاتے ابا باہر ہی رک گئے تھے کہ ماں دھی کے اپنے دکھ سکھ ہوتے ہیں جو وہ دونوں مل کر بانٹ لیتی ہیں۔ ایک وہ تھے جن کے پاس دکھ سکھ بانٹنے کو کوئی بھی نہیں تھا۔

ریت کے ٹیلوں پر ہوا نے ریت اڑائی تھی۔ شرینہہ کے درختوں پر پرند کے جھرمٹ بیٹھ گئے۔ کھگل کے درخت سے پتے توڑ کر تھل واسیوں نے دھونیاں سلگائی تھیں۔

وہ اس رات اماں کے ساتھ لگ کر سو گئی تھی۔ رات ہولے ہولے ڈھل کر فجر سے میں ڈھلنے لگی تھی جب چراغ کی دم توڑتی ہوئی لو کو دیکھتے ہوئے بختاور نے اماں سے سوال کیا تھا۔

''اماں! کنیزاں کی بہت یاد آتی ہے۔ کیا آپ کو آتی ہے؟''

اماں نے پیٹھ موڑ لی تھی۔ اور سسکیاں روکنے لگی تھیں۔

فجر سے ریت کے ٹیلوں پر پھیل گیا۔ شرینہہ کے پیلے پھول ریت میں دب گئے۔

☆.....☆.....☆

وقت کو بھی کتنی جلدی ہوتی ہے کسی پرندے کی طرح کسی ایک ڈال پر بیٹھ کر اسے سکون نہیں آتا بس اس نے دور خلاؤں میں کہیں پرواز کرتا ہوتا ہے فرق بس اتنا ہے کہ پرندوں کو ہم دیکھ لیتے ہیں ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے مگر وقت بغیر کسی چاپ کے گزر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی۔

دور تک پھیلی ہوئی جامعہ پنجاب کی وہ سلیٹی سڑکیں۔ ہاسٹل روڈ جہاں پر وہ چہل قدمی کرتے ہوئے اپنے اپنے بارے میں ایک دوسرے کو بتایا کرتی تھیں۔ تب کنیز فاطمہ کیسے فخر سے اپنے گھر والوں کے راضی ہونے کا ذکر کیا کرتی تھی۔

''میں اپنے تھل کی پہلی لڑکی ہوں کو اتنی رکاوٹوں کو عبور کر کے لاہور جیسے شہر میں خوابوں کی تعبیر بانٹنے کے لیے آئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن میں اپنا یہ خواب ضرور حاصل کروں گی۔ میرا دل چاہتا ہے میں باہر کسی بہت بڑے ملک میں کہیں کسی تجربہ گاہ میں اپنے تجربات کروں وہ بھی انسانیت کے لیے۔''

شاید ایجادات کو ماننے والی لڑکی تھی۔ وہ ہمیشہ ایجادات پہ بحث کرتی تھی۔ اسے ایجادات اچھی لگتی تھیں اور سیرت نے تب کیسے اسے یقین دلایا تھا اس کا ہاتھ تھام کر۔

''ہاں، مجھے یقین ہے کسی دن تم اپنا کامیاب تجربہ کر کے ہمارا نام روشن کرو گی اور جامعہ پنجاب کو تم پر فخر ہوگا تب ہم فخر سے کہا کریں گے کہ کیمیا دان کنیز فاطمہ ہماری دوست ہیں۔''

انہوں نے اس چیز کا کتنا لطف اٹھایا تھا۔

تمکین جمال جسے نئی نئی چیزوں کا شوق تھا۔ وہ بہت شوق سے ہر چیز کا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ لاہور کے چپے چپے کا، جگہوں کا اسے اگر کہیں سے بھی سوشل میڈیا سے لاہور کی کسی خاص تاریخی جگہ کا پتا چلتا تھا تو اپنے ٹولے کو لے کر پہنچنے پر بضد ہو جاتا کرتی تھی۔ اس نے پنجاب یونیورسٹی میں اتنی چیزیں دریافت کر لی تھیں جن کے بارے میں آدھی جامعہ تک کو بھی خبر نہ رہی ہوگی۔

وہ انہیں اولڈ کیمپس کی فارمیسی کی کافی پلانے لائی تھی شاید اس نے وہیں لڑکی سے سنا تھا۔ اور وہ واقعی وہاں آ کر خوش ہوئی تھیں کہ انہیں اس بات پر بھی پچھتانا نہیں پڑا تھا کیونکہ پنجاب یونیورسٹی میں ٹھنڈے ٹھار موسم کو انجوائے کرنے کے لیے وہ ہمیشہ پنجاب یونیورسٹی کے پوائنٹس سے اولڈ کیمپس پہنچ جاتی تھیں اور وہاں کی فارمیسی ڈیپارٹمنٹ کی کافی سے لطف لیا کرتی تھیں اور تمکین جمال کو داد دیتی تھیں اور اس داد کو سمیٹ کر تمکین جمال پھولے نہ سماتی۔

ہاسٹل میں چھکا چھک بھرے ہوئے میس میں جب جب بھی کوئی جمعرات والے دن سرپرائز کھانا بنتا یا ویسے روٹین کی بات ہوتی تو وہ تینوں ایک دوسرے کے لیے جگہ رکھنا ضروری سمجھتی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی ڈیوٹیاں لگائی ہوئی تھیں پہلے کس نے جا کر میس میں دوسرے دو بندوں کی جگہ رکھنی ہوتی تھی اور اکثر یہ کام تمکین جمال ہی کرتی تھی۔ اسے ہی بہت شوق تھا اس لیے جیسے ہی میس کھلنے میں کچھ وقت باقی ہوتا تھا وہ میس کے دروازے کی طرف بھاگتی تھی اور جب تک وہ دونوں محترمائیں خراماں خراماں چلتے ہوئے سیڑھیوں سے ٹہلتے ہوئے اور ادھر ادھر گھومتے پھرتے لڑکیوں کی چغلیاں کرتے ہوئے میس میں پہنچتی تھیں تو انہیں اپنی کرسیاں پہلے سے بک ملا کرتی تھیں۔

وہ زندگی کا ایک حسین دور تھا جو انوں نے وہاں گزارا تھا۔ میس میں ہونے والی کھانے کی میز پر شرارتیں وہ کبھی بھی نہیں بھول سکتی تھیں۔

ہاسٹل فریزر سے کسی کا کھانا چرا کر کھانا بھی اس میں سے ایک تھا اور یہ ایسے نادر اور نایاب خیالات ربار تمکین کے ہی دماغ کی پیداوار ہوتے تھے۔

بے چاری لڑکیاں گھر سے اپنا کھانا بنوا کر لاتی تھیں مگر وہ زرق کسی اور کا ہی مقدر بنتا تھا۔

سیرت ایک پڑھاکو بچے کی طرح جیسے ہی اسے موقع ملتا تھا اپنے ڈپارٹمنٹ سے نکل جاتی تھی۔ پیچھے عدن، فردوس گوہر، تمکین، سیرت، سیرت کرتی رہ جاتی تھیں۔ اور بعد میں بس ایک میسج موصول ہوتا تھا۔

''لائبریری میں ہوں اور خبردار تم تینوں میں سے کوئی میرے پیچھے آیا۔''

اس کی اور کتابوں کی بہت گاڑھی چھنتی تھی اس وجہ سے وہ لائبریری میں پائی جاتی تھی۔ ان سب کو بعد میں معلوم ہوا تھا کہ لائبریری میں پائے جانے کی وجہ ایک سرخاب خان بھی تھا۔ وہ پہاڑی شخص جس نے سیرت امتیاز کو دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ یہی بات تھی کہ وہ گھنٹوں وہیں لائبریری میں بیٹھا کرتی تھی جہاں سرخاب خان سول سروسز کے امتحان کی تیاری کے لیے آیا کرتا تھا۔ واپسی پر وہ آہنی جنگلے سے پار کرتی ہاسٹل جاتے وئے بزنس فنانس والے کے ہیلے کالج کی عمارت اور وہاں اسٹوڈنٹس کا شور دیکھا کرتی تھی۔

اس سب کے بغیر زندگی کیا ہوتی۔ وہی گھر۔ وہی برآمدہ۔ وہی آیت کی جلی کٹی باتیں اور پوپلی بوا کی طرف سے ملنے والی ڈھیروں ڈھیر نصیحتیں..... زندگی کبھی بھی اس پہ مہربان کیوں نہیں رہی تھی؟

جب سہ پہر ڈھل رہی ہوتی تھی تمکین اور کنیزاں ہاسٹل پہنچ چکی ہوتی تھیں تو وہ ہاسٹل میں کبھی کبھار بہت دیر سے پہنچتی تھی۔

وہ تینوں کب بور ہو رہی ہوتی تھیں تو انڈر پاس کی طرف چلی آتی تھیں جہاں بہت سے خوبرو لڑکے کرکٹ کھیل رہے ہوتے تھے اور تمکین انہیں ہر بار سرزنش کرتی تھی۔

''کنیز اور تم، اپنی آنکھیں نیچی رکھو۔ وہ لڑکے کیا سوچیں گے کہ ہم کیسی بدتمیز لڑکیاں جو انہیں دیکھے جا رہی ہیں۔''

''ہاں کیا سوچیں گے؟ وہ کون سے اتنے پرنس چارلس ہیں؟ تم تو ایسے ہی کسی سے بھی متاثر ہو جایا کرو بس۔''

شاید یہی ہوتا ہے تعلیمی اداروں میں گزارا جانے والا وقت بہت نایاب اور انمول ہوتا ہے جو انسان کیس اتھ ساتھ ساری زندگی رہتا ہے۔

ایس ٹی سی کی وہ چینی سے بھری ہوئی چائے جو مجبوراً انہیں پینا ہی پڑتی تھی اور اس کے علاوہ

ہاسٹل کینٹین کے وہ آلو کے پراٹھے جن میں نام کے بھی آلو نہیں ہوتے تھے۔اور اگر انہیں مائیکرو اسکوپ لے کر بھی ڈھونڈا جاتا تو بھی وہ آلو نظر نہیں آنے والے تھے۔

بہترین لباس پہننے کو لڑکیوں کی سلیکشن اور بازاروں کے چکر..... کتنا کچھ تھا جیسے حرکت ہی حرکت ہر طرف تھی اور زندگی بہت حسین اور خوابوں سے بھری ہوئی لگتی تھی۔

عشائیے کا ہر کوئی منتظر ہوتا تھا سالانہ عشائیے سب کی جان تھے۔

ہاسٹل کا کچھوے کی رفتار سے چلتا ہوا انٹرنیٹ کنکشن جس کو ہر طرف سے بددعایں ہی ملا کرتی تھیں۔کبھی کبھار پانی بند ہو جاتا تھا تو اور مصیبت آجاتی تھی۔

سب یادیں تھیں اور فقط یادیں تھیں۔

شڑاپ شڑاپ بارش کے پانیوں میں بے فکری سے پنجاب یونیورسٹی پر برستی بارشوں کے پانیوں میں نہایا جاتا۔کئی لڑکیوں نے تو چوری چھپے یونیورسٹی کی بلیوں سے ان کے بلونگڑے ایڈاپٹ کر رکھے تھے۔

فوٹو کاپی شاپ پر پھیلا ہوا رش جہاں کھڑے کھڑے ہی ہر کوئی دکھ سکھ کر لیتا تھا۔ایک دوسرے سے میچنگ دوپٹے اور جیولری کے لیے منتیں ترلے کا بھی اپنا مزا ہوتا تھا۔جس لڑکی کو میک اپ کرنے کا آرٹ آتا ہوتا تھا وہی ہاسٹل کی ملکہ ہوا کرتی تھی جس کے کمرے کے باہر لائنیں لگی ہوتی تھیں۔

فائنلز کے دوران ہر کوئی نوٹس کے بنڈل پکڑے کونے کھدرے ڈھونڈ رہا ہوتا تھا۔تب کھانا پینا اور ڈریسنگ کے خیال رفو چکر ہو جاتے۔گریڈز کی بہتری کے لیے پروفیسروں کی منتیں کی جاتیں۔بٹرنگ کی جاتی۔

ہاسٹل لائف تو ان تینوں نے بہت اچھے سے گزاری تھی۔

اس کے علاوہ عدن اور فردوس کے ساتھ مل کر گروپ اسٹڈی کے بہانے وی سی گراؤنڈ میں پھسکڑے مارے دنیا کے ہر موضوع پر گپ شپ کی جاتی تھی سوائے سٹڈی کے۔

جب بھی ایگزامز کا دباؤ پڑتا تھا تو آئی بی اے سے فیصل آڈیٹوریل تک ایک پیدل مارچ کیا جاتا تھا جو عدن کو تو بہت ہی بھاتا تھا۔

''یار! قسم سے مزا ہی آ جاتا ہے اس مارچ کا۔ انسان بالکل ہی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔''

وہیں ہنی بی فارم تھا جہاں شہد کی مکھیوں کے چھتے پڑے ہوئے تھے اور ایک بار ان مکھیوں کا شکار تمکین ہو چکی تھی تو اب وہ آہستہ سے ڈر ڈر کر وہاں سے گزرتی تھی۔ سڑک کنارے پھٹے لگے تھے جہاں یونیورسٹی کے زرعی قطعے میں اگنے والی موسمی سبزیوں کی ریڑھیاں لگتی تھیں۔ جہاں سے اکثر ہاسٹل کے لڑکے اور لڑکیاں خریداری کرتے تھے۔ پاس سے گزرتے ہوئے وہ ان اسٹائلش لڑکیوں کے بھاؤ تاؤ کو غور سے سنتی تھیں جو جانے پریزنٹیشن کے لیے روسٹرم پر کیسے راج ہنس جیسی گردن اکڑا کر کلاس سے مخاطب ہوتی تھیں اور یاں آلو اور بھنڈی کی قیمتوں پر بھاؤ تاؤ کرتی نظر آتی تھیں۔ تب تمکین انہیں متوجہ کرتے ہوئے ہمیشہ چند جملے کہتی تھی۔

''چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ عورت ہمیشہ اپنے چولہے اور گھر کے بارے میں بات کرتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہے۔ اسے گھر بنانا آتا ہے۔ وہ بنیادوں میں اپنا خون ڈال کر محل کھڑا کرتی ہے۔''

کنیزاں کے چہرے پر سفیدی پوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اسے چولہے میں سوکھے ایندھن کے بھانبھڑ جلاتی بختاور یاد آ جاتی تھی اور آنکھیں بس برس جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگتی تھیں۔

''یار! لڑکیوں کو تو یہ کام اچھے سے آتا ہے مگر یہ لڑکے کیسے بھاؤ تاؤ کرتے ہیں؟'' سیرت کو لڑکوں کی بحث بہت مزیدار لگتی تھی۔

''تم سے اللہ پوچھے سیرت۔ بے چاروں کے اعتماد کو کیوں زیر و زبر کرتی رہتی ہو۔''

جیسے ہی وہ وہاں سے مارچ کرتی بوٹینیکل گارڈن کے پاس سے گزرتی تھیں تو فردوس کے چہرے پر رات چھا جاتی تھی۔ اس جگہ کے بارے کئی باتیں مشہور تھیں وہاں فلک بوس درختوں کی چوٹیوں پر گِدھ اور چمگادڑوں کے بسیرے تھے۔ وہ چاروں دھاتی دروازے سے لپٹ کر اندر جھانکتی رہتی تھیں مگر فردوس گوہر ہمیشہ کچھ فاصلے پر خود کو روک لیا کرتی تھی۔ عدن ہنس کر کہا کرتی تھی۔

''کتنی ڈرپوک ہو تم گوہر۔'' ارے، کون سا یاجوج ماجوج رہتے ہیں یہاں جو تم خوف سے پیلی پڑ جاتی ہو۔

جس کا ڈر ہوتا ہے اسے ہی پتا ہوتا ہے۔ ڈر کتنے ہولناک ہوتے ہیں۔ یہ انسانوں کے دلوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ شریانوں میں خون کی طرح بہنے لگتے ہیں.....!

☆.....☆.....☆

ڈر جو ہولناک ہوتے ہیں۔ شریانوں میں خون کی طرح بہنے لگتے ہیں۔

ابا موسمی تبدیلیوں کا شکار ہو گئے تھے اور ان کی طبیعت بہت بوجھل سی رہنے لگی تھی تو تمکین سامان باندھ کر گھر کو روانہ ہو گئی تھی۔

پیچھے بس سیرت اور کنیزاں رہ گئی تھیں۔ ڈپارٹمنٹ سے واپسی پر وہ ذرا دیر کو ٹہل کر ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہ بھی بادلوں بھرا ایک پہر تھا جب وہ چائے کے کپ تھامے ہاسٹل کے گارڈن ایریا میں چپل اتارے ننگے پاؤں ٹہل رہی تھیں تو سیرت نے اس سے پوچھا تھا۔

''اس مصور کا کیا ہوا کنیز؟'' چائے کا گھونٹ لیتی ہوئی کنیز اچانک چونک گئی تھی۔ ایک ایسا زخم جسے وہ نظر انداز کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی اب وہی کھرنڈا کھڑنے کو تھا۔

''بہت مشکل تھا سیرت۔ مگر میں نے دل مار لیا ہے۔ جس تعلق کا کوئی مستقبل نظر نہ آتا ہو وہ تعلق بہت بودا ہوتا ہے ویسے بھی وہ ایک تخلیق کار ہے اسے اس کی تخلیق بچا لے گی۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟'' سیرت کے پیروں میں وہ بھوری بلی لوٹنے آ گئی تھی۔ یہ وہی بلی تھی جس کے بارے میں تمکین نے رائے پیش کی تھی کہ وہ سیرت کی سکھی سہیلی ہے، جہاں جہاں وہ سیرت کو دیکھتی تھی دوڑ کر آتی تھی اور پیروں میں لوٹتی تھی۔

''میں نے اس کی تصویریں دیکھی ہیں۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگوں کو ان کا درد ہی دوا کر کے زندگی میں بہت آگے لے آتا ہے۔ یہ وہ پتھر ہیں جنہیں دکھ تراش کر ہیرا کر دیتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو میرے پاس کوئی آپشن ہی نہیں۔ تھل واسی سوچ کر بیٹھے ہوں گے، کئی مفروضوں کو گھڑ لیا ہو گا۔ وہاں یہی ہوتا ہے کچھ بھی سوچ لیتے ہیں۔ ان کی لاعلمی ان کی نفرت کو بہت آگے لے جاتی ہے سیرت۔ میں نے کئی بار سکندر کے نمبر پر میسج چھوڑے ہیں مگر موت جیسا سناٹا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بختاور اور سکندر کی

کیسی گزر رہی ہوگی۔ ایک گلٹ کا احساس تو ہے کہ میں نے بھی غلط کیا مگر سب کو سوچنا چاہیے تھا کہ جب لڑکیاں بڑی ہو جائیں تو ان کی آنکھوں کو اچھے سے پڑھ لیا کریں۔ لڑکیاں اپنے سارے سچ اپنی آنکھوں میں جمع کر کے رکھتی ہیں۔'' گھاس کے اس سبز قطعے کی گھاس کہیں کہیں سے جھلس گئی تھی۔ کسی ننھے کیڑے نے کنیزاں کے ننگے پیر پر کاٹ لیا تھا۔ وہ دوسرے پاؤں سے مسل رہی تھی۔

''تم نے زندگی میں اتنا کچھ کیسے سہہ لیا کنیز۔ گھر والوں سے دور یہاں۔ واپس جاؤں گی تو کیا ہوگا۔''

وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔ بے سبب سی۔ ٹھنڈی سی۔

''سامان لے کر ساری رات گھر کے دروازے پر بیٹھی رہوں گی اور میرے لیے دنیا کا ہر دروازہ کھل جائے گا مگر میرے گھر کا دروازہ نہیں کھلے گا۔''

سیرت نے بھوری بلی کو ہاتھوں میں اٹھا لیا تھا۔ چائے کے کپ خالی کر کے وہ سامنے پتھر کے بنچ پر پہلے ہی رکھ چکی تھیں۔ کچھ فاصلے پر دو لڑکیاں بہت سے موتی پھیلائے کوئی جیولری پیس بنانے میں مگن تھیں۔

''کتنی مماثلت ہے ناں ہم دونوں میں..... گھر۔ جو گھر لگتا ہی نہیں۔ بس پوپلی بوا ہی ہیں جن کے لیے دوڑ دوڑ کر جاتی ہوں مگر جانے کب تک؟''

ساری فضا میں افسردگی چھا گئی تھی۔ گل مہر کے جھنڈ پر فاختائیں پتے گرا رہی تھیں۔ لاہور کا آسمان کوؤں سے اٹ گیا تھا۔

''محبت چھوڑ دینا کتنا مشکل ہوتا ہے کنیز؟''

بھوری بلی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے بھاگ گئی تھی۔ کنیزاں نے نمناک آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھا تھا۔

''بہت مشکل ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کوئی آری سے کاٹ رہا ہے اور درد بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ دھیان کو جتنا بھی بھٹکاؤ مگر دل کو محبت کے وچھوڑے کا وہم کھائے جاتا ہے۔''

''تو تم نے پھر اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیونکر کر لیا؟''

پہلی بار تھل واسی کیمیا دان کنیزاں دور بادلوں سے ڈھکے سرمئی آسمان کو دیکھ کر روتی ہوئی ہنس دی تھی۔

''مجھے کسی نے کہا ہے کہ ایک تجربے کی کامیابی سو محبتوں پر بھاری ہوتی ہے۔''

☆.....☆.....☆

پنجاب یونیورسٹی کی اس رات کی صبح زہر آلود تھی۔ جس میں موت جیسا کوئی سناٹا تھا۔ کل ہی تو اس نے سیرت کو بتایا تھا کہ وہ سکندر کو کتنے ہی ٹیکسٹ کر چکی تھی مگر جن کا کوئی بھی جواب نہیں آیا تھا۔ اسی رات کی صبح اسے موبائل فون پر وہ جواب موصول ہوا تھا۔

''کنیزاں۔ اماں گزر گئی ہیں۔''

وہ جواب پڑھ کر لرز گئی تھی۔ وہ سناٹا تھا کہ دل آواز بن گیا تھا۔ سیرت نے ہی اسے سنبھالا تھا۔

''سیرت! چاچی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر سیرت کے گلے لگ کر روئی تھی۔ ''دیکھو سیرت، اتنی سی زندگی بس۔ دیکھو تو شاید آخری وقت میں بھی انہیں مجھ سے دکھ ہی ملا۔ کتنا خوش ہوتی تھیں وہ مجھے اور سمندر کو ساتھ دیکھ کر اور آج دیکھو۔''

سیرت بھی برستی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کنیز کا سامان پیک کرتی رہی تھی۔

ہاسٹل کی زندگی بھی کیا ہوتی ہے۔ کتنے دکھ درد گزر جاتے ہیں۔ گھروں سے دربدری کے ساتھ ساتھ انسان خود بھی بکھر بکھر جاتا ہے۔ وہ کنیزاں فاطمہ کو ریلوے اسٹیشن چھوڑ کر واپس آ گئی تھی۔ جانے تھل والے اس ذہین لڑکی کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والے تھے۔

وہ بس یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی تھی۔ اسی پریشانی میں اسے پوپلی بوا کا خیال آیا تھا تو اس نے کال ملائی تھی اور مقابل پھر سے آیت امتیاز تھی۔

پیچھے جیسے بہت چہل پہل اور شور سنائی دے رہا تھا۔

''کیسی ہو تم؟'' آیت کی آواز میں شہد گھل گیا تھا۔ وہ بالکل بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ پوپلی بوا کیسی ہیں؟''

''بوا بھی ٹھیک ہیں۔'' وہ جیسے اسے بہت محتاط لگی تھی یا اس کا ہی کوئی وہم تھا۔

''کوئی بات ہے کیا؟'' وہ پوچھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

''ناں۔نہیں تو۔ بھلا کیا بات ہوگی؟''

''پوپلی بوا سے تو بات کروادو۔''

پچھلے کئی ہفتوں سے تھیسز میں سر کھپائی کی وجہ سے گھر بات ہی نہیں کر پائی تھی۔ اور آج کنیز کو رخصت کرتے ہوئے اس کا اپنا دل بھی بھر بھر آرہا تھا۔

''وہ پڑوس میں گئی ہیں۔ جیسے ہی آئیں گی تو کال ملادوں گی۔''

آیت فون رکھنے ہی لگی تھی کہ سیرت پیچھے سے ابھرتی ہوئی آوازوں کو سن کر چونک سی گئی تھی۔ وہ آواز، وہ قہقہہ تو ابا کا تھا۔ زمین پیروں تلے سے نکل گئی تھی۔ ابا کب پاکستان آئے تھے؟ اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی؟

آنسو لڑیوں کی صورت میں ٹوٹ ٹوٹ کر گالوں پر بہنے لگے تھے۔

وہ رشتہ جس پر وہ کبھی راضی بھی نہیں ہوئی تھی مگر دل کو پھر بھی خوش گمانیاں تھیں کہ وہ ان کی اولاد تھی۔ ان کا خون تھی۔ بے شک ایک ان چاہی شادی کی ہی سہی مگر خون تو خون ہوتا ہے ناں۔ باپ اور بیٹی کا تعلق۔ جیسے تمکین کیسے باپ کی طبیعت کا س ن کر رات کو ہی سامان باندھ کر نکل کھڑی ہوئی تھی کہ باپ اور بیٹیوں کے رشتے بہت انمول ہوتے ہیں۔ ہائے افسوس صد افسوس کہ سیرت امتیاز کا کوئی مول ہی نہیں تھا۔ ٹکے جتنا بھاؤ بھی نہیں تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے کیل کی طرح گڑ گئی تھی۔

آیت کی آواز آئی تھی۔ ''سیرت تم سن رہی ہو؟''

آیت نے رابطے کی تاروں میں ایک کائناتی دکھ کو پورے آسمان کو لپیٹ میں لیتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ کرلاتی ہوئی کونج جیسی آواز اس کی باپ جائی کی تھی۔

''آیت۔ سچ سچ بتانا۔ خدا کے واسطے سچ سچ۔'' وہ سچ کی بھیک مانگ رہی تھی۔

''کیا پوچھنا چاہتی ہو تم؟''

''کیا۔ کیا ابا آئے ہیں؟''

فون کے اس پار سانسوں کی آواز تیز ہوئی تھی۔ آیت امتیاز اپنی فطرت پر چلتی تھی۔ آج بھی اس نے وہی کیا تھا ہمیشہ کی طرح۔ انتقام۔

''نہیں۔ طاہر کے دوست آئے ہیں۔''

کال کاٹ دی گئی تھی۔ کل برسنے والی بارش سے سب کچھ گیلا ہو گیا تھا۔

وہ گھٹنوں میں سر دیئے اکیلی اس سفید دیواروں والے ہاسٹل کے کمرے میں بیٹھی کانپتی رہی تھی۔ جب کافی دیر بعد گھٹن دل تک پہنچنے لگی تو وہ وحشت سے گھبرا کر کمرے سے نکل کر باہر کی طرف دوڑی تھی۔ سیڑھیاں اترتے دوپٹا گلے میں ڈالتی ہوئی وہ کاریڈور میں سے گزر رہی تھی جب وہ لاڈلی بھوری بلی دور سے دوڑتی ہوئی سیرت کے قدموں میں لوٹنے آ گئی تھی۔

سیرت نے غصے سے اسے ٹھوکر لگائی تھی بلی کی دکھ بھری چیاؤں چیاؤں پر کئی لوگ متوجہ ہوئے تھے۔

وہ سڑکوں پر یونہی ٹہلتی پھرتی رہی تھی۔ تبھی کسی خیال نے ڈنک مارا تو اس نے بھوری آنکھوں والے شخص کو ٹیکسٹ کیا تھا۔

''سرخاب! تم یہیں ہو کیا؟ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

دور دیار کے کئی پیڑ زمین بوس ہو گئے۔ پہاڑوں میں کوئی مردنگ اور کوہستانی ستار بجا رہا تھا۔ مردنگ کی آواز پہاڑوں کا سینہ چیر گئی تھی۔

سرخاب خان نے اپنی شادی کے دن سیرت کا میسج دیکھا تھا۔ گھٹن اس کے بھی دل تک آ گئی تھی مگر وہ ایک مرد تھا اس نے جرأت و بہادری کا ہی مظاہرہ کیا تھا۔ وہ ایک میسج ٹائپ کر رہا تھا۔

ہوائیں وہ زہر میں ڈوبے لفظوں کا بوجھ لاہور جامعہ کی سڑکوں پر لے آئی تھیں۔

''آج میری در نجٹ سے شادی ہے اور میں بہت خوش ہوں۔''

سیرت امتیاز کو ٹھوکر لگی تھی۔ وہ وہیں سڑک پر بیٹھ گئی تھی۔ آس پاس سے گزرنے والوں کے لیے

وہ ایک تماشا تھا۔ تماش بین رک رک کر دیکھتے رہے تھے۔ اسے گیتی آرا یاد آئی تھی۔ پیر کے انگوٹھے سے درد آہستہ آہستہ دل تک آ رہا تھا۔ ہواؤں میں ہی کوئی دم گھونٹو تھا۔ وہ دوبارہ ہاسٹل کی طرف بھاگی تھی۔ وہ پھر سے اسی کاریڈور سے گزر رہی تھی۔ اخبار کے کئی صفحے زمین پر آ رہے تھے۔ بھوری بلی پھر سے ٹھڈے کھانے کے باوجود سیرت کی طرف لپکی تھی۔ سیرت نے پیروں میں ٹوٹتی بلی کو دیکھا تھا۔ بلی نے وہ سرگوشی سن کر ناسمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

''آئی ایم سوری۔''

وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ کوئی گھر نہیں رہا۔ کوئی در نہیں رہا۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ موت جیسا۔ دیوار سے لگ کر وہ بیٹھی تھی اس نے عدن کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ عدن جبار کچن کے اسٹول پر بیٹھی مام کو لزانیہ بناتے ہوئے دیکھ رہی تھی جب اس نے سیرت کی کال ریسیو کی تھی۔

''عدن! میرا دل گھٹ رہا ہے۔ درد مجھے کھائے جا رہا ہے۔''

عدن کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ وہ تو کئی دنوں سے بیمار تھی۔ اب جب شام رات سے ملنے والی تھی تو وہ اکیلی اس وقت کس کرب میں مبتلا تھی۔

''تم۔ تم۔ فکر مت کرو سیرت میں آ رہی ہوں۔''

وہ مام کے سوال کا جواب دیے بغیر باہر گاڑی کی طرف بھاگی تھی۔ اس نے کال نہیں کاٹی تھی۔ سیرت کی مدھم پڑتی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔

''میرے پاس کوئی گھر نہیں ہے۔ میرے پاس کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ میرے لیے فقط زمین رہ گئی ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ درد بڑھتا جا رہا ہے سیرت۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔''

سیرت امتیاز کے دل کی رفتار مدھم ہوتی گئی۔ کے کا دروازہ ہلکا سا کھلا رہ گیا تھا جو ہلکی سی ہوا کے ساتھ کھل سا جاتا تھا۔

وہ گھٹنوں میں سر دیئے دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ درد روکنے کو وہ دیواروں پر ناخنوں سے کھرونچیں

ڈال رہی تھی۔ درد بڑھتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔ کچھ جھلکیاں تھیں۔ کچھ چہرے! آیت کا استہزائیہ سا چہرہ۔ پوپلی بوا کی شفیق آنکھیں! تمکین اور کنیزاں کے شریر چہرے۔ عدن اور گوہر کے چہرے۔

سب دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔

سرخاب خان کو اس نے دیکھا تھا۔ وہیں آرکیالوجی ڈپارٹمنٹ۔ صراحی ٹوٹ گئی تھی۔ زندگی کی صراحی کا وقت پورا ہو گیا تھا۔

دل بند ہونے سے پہلے آخری چہرہ سیرت امتیاز کے ذہن کی سلیٹ پر جو نقش ہوا تھا وہ اس کے باپ کا تھا۔ اور بس۔ یہیں تک۔ تمام۔

دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھ کر جب ہاٹل انتظامیہ کے ساتھ عدن جبار اور فردوس گوہر نے ہاسٹل کے کمرے کے باہر قدم رکھا تھا، دروازہ ہوا کے زور سے پورا کھلا رہ گیا تھا۔ ایک بھوری بلی موت کی واردات کا شکار ہونے والی سیرت کے قدموں میں لوٹ رہی تھی۔

دیوار سے ٹیک لگائے۔ گالوں پر آنسو جم گئے تھے۔ درد نے سیرت امتیاز کو کھا لیا تھا۔

جامعہ پنجاب کے در و دیوار عدن اور فردوس کی چیخوں سے گونج اٹھے تھے۔ زندگی کی ایک کہانی تمام ہو گئی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک لڑکی سیرت امتیاز ہوا کرتی تھی۔

رب شناس لوگ دیوانے نہیں
بس جمال پردہ در سے ضبط ہوا لا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

http://kitaabghar.com

باب پانزدہم

فسوں

یاداں وچھڑے شہر دیاں
پل دو پل تے ٹھہر دیاں
طعنے مارن رکھاں نوں
دھیاں شکر دوپہر دیاں
دل توں کجھ تے ٹھنڈ پوے
گلاں کر دیئے نہر دیاں
کریے کس دے نال اسیس
پاتاں ڈھلدے پہر دیاں

فسوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ یوں سمجھیں تب سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ ہمارے پردے گر جاتے ہیں کہ بس اب سب کچھ اختتام پذیر ہو جائے گا مگر وہیں کوئی صدیوں پرانا بیج کونپل بن کر پھوٹ پڑتا ہے کہ فسوں باقی رہے، مگر افسوس کہ فسوں پھر بھی ٹوٹ جاتا ہے کہ یہ ٹوٹنے والی چیز ہی تو ہے، تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ چاہے کوئی بھی چاہیے!

☆.....☆.....☆

قل خوانی والا گھر تھا۔ دور تک صحن میں چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سارا تھل پرسیر حاصل گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ کھانے کی خوشبو کی طرف بھی متوجہ تھیں۔ اماں اور بختاور سارے انتظام دیکھ رہی

تھیں۔ سکندر بھی اپنے سارے حوصلے جمع کیے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ ابا بھی تنبو کے نیچے آنے والے لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

وہاں ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مصروف تھا اس لیے کوئی بھی سامان اٹھائے تھکی ہاری کنیزاں کی آمد کی خبر نہ پا سکا تھا۔ جس کے چہرے پر وحشت سی اڑ رہی تھی کہ جیسے کسی کندھے سے سر ٹکا کر آنسو بہا کر سکون پا لے۔ مگر وہاں اتنے سارے ہجوم میں کوئی بھی اپنا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جلدی میں سیرت کی چپل پہن آئی تھی۔ وہ انگوٹھے والی چپل اب اس کے پیر کو کاٹنے لگی تھی۔ اتنے گھنٹوں کے سفر نے الگ نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ اوپر سے چچی کی اچانک موت نے اس کے دل پر برا اثر ڈالا تھا۔ وہ کسی بپھرے ہوئے طوفان میں کیکر کی ڈال پر بیٹھے کبوتر کے بچے کی طرح بے یار و مددگار رہ گئی تھی۔

وہاں وہ اور بختاور کھانا تقسیم کر رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے مردانے سے سکندر بھی بختاور سے بات کرنے آجاتا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے کتنے اچھے لگ رہے تھے۔

کنیزاں فاطمہ وہیں بیٹھے بیٹھے آنکھیں جھپکتی رہی تھی۔ آنکھوں سے کھارے پانی کے جھرنے بہہ نکلے تھے۔ کنیزاں فاطمہ کے سوجے ہوئے پیر سے کوئی بچہ گزرا تھا۔ اس کے منہ سے جیسے سسکی نکلی تھی۔ وہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی تب ہی بختاور سے بات ختم کر کے سکندر جیسے ہی مڑا تھا نظر بالکل سامنے اٹھی تھی۔

وہ وہی تھی اتنے ہجوم میں بھی سب الگ تھلگ، اس کے پکے مکان کی واحد کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے۔ وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ سکندر کے دل میں جیسے ایک گرد و باراں اٹھا تھا۔ وہ اتنی قابل رحم لگ رہی تھی کہ اسے اس وقت کوئی بھی دیکھتا تو کوئی بھی بڑے سے بڑا جرم بھی معاف کر دیتا۔ وہ غائب دماغی کے عالم میں وہاں سے نکل گیا تھا۔

بختاور روٹیوں والی چنگیر تھامے سب کے سامنے روٹیاں رکھتے ہوئے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ سجائے سب سے چند گھڑی دو بول لیتی تھی۔

"ارے اسے تو بڑی چاہ تھی بہو گھر لانے کی۔ خیر سے اپنی زندگی میں ہی سکندر کو اپنے گھر کا کر گئی۔"

جواب دیتے دیتے بختاور کی نظر اٹھی تھی وہ جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔

''کنیزاں۔''

وہ ہولے سے چلتے ہوئے اس کے پاس آئی تھی اور پاؤں پسارے بیٹھ گئی تھی۔ کنیزاں نے سر اٹھایا تھا۔ ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی تھیں۔

''بختاور..... میں..... میں!.....''

بختاور نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ لوگ کھانا کھا کر اٹھنے لگے تھے۔ اماں جانے والوں سے الوداعی کلمات لے رہی تھیں۔ تھل واسی کنیزاں کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ بختاور نے اس کا ماتھا چوما تھا۔

''ارے، جھلی نہ ہو تو..... بھلا تیرا کیا قصور بس جتنی عمر کی نقدی تھی خرچ ہو گئی۔''

''میری وجہ سے ہوا سب۔ دیکھو تو میں نے سب کا اتنا دل دکھایا اللہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

بختاور نے اس کے نرم و سپید پاؤں پر چھالے دیکھے تھے۔ مسافر کی تھکن اس کے سارے وجود سے عیاں تھی۔

''بس کر دے کنیزاں۔ جانے کیسے پہنچی ہے تو۔ اٹھ منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لے۔''

وہ سسکیاں لیتی ہوئی بختاور کے ساتھ لگی برآمدے کی طرف آئی تھی۔ اماں کے ہاتھ سے اسٹیل کی ٹرے چھوٹ گئی۔ سامنے ہی وہ قصوروار نمانی کھڑی تھی۔

''ہائے میرے ربا..... کنیزے۔'' وہ اماں سے لپٹ گئی تھی۔ اماں نے دھتکارنا چاہا تھا مگر بختاور کے جڑے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ رک گئی تھیں۔ وہ ننگا سر لے کر کھڑی تھی۔ اماں نے اس پیشانی اور ننگے سر کو اپنی شفقت سے محروم ہی رکھا تھا۔

''اماں مجھے معاف کر دے۔'' وہ بار بار ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ جنہیں اماں نے جھٹک دیا تھا۔

''ارے چھوڑ۔ تو اپنی پڑھائیاں کر۔''

وہ کونے میں دبک کر بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہ شاید بختاور کا کمرا تھا۔ کمرے سے خوشبوئیں اٹھ رہی

تھیں۔ سنگھار میز پر رکھے چوڑی اسٹینڈ پر رنگ برنگی چوڑیاں سجی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ تبھی دروازے سے سکندر اندر آیا تھا۔ پھر سے وہ سامنے بیٹھی تھی۔

''سنو، واپس مت مڑنا۔'' وہ لجاجت بھرا لہجہ، منت کرتا ہوا انداز۔ جانے اس طور رویے سے بات کرنا وہ کب اور کیسے سیکھ گئی تھی۔

''کیسی ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ چاچی کا بہت دکھ ہوا۔''

''صرف چاچی کا؟'' وہ جیسے اسے ماضی یاد دلا گیا تھا۔

''جانتی ہوں یہ وہ قرض ہے جو کبھی ادا نہیں ہوگا، مگر پھر بھی یہی کہوں گی کہ ہو سکے تو مجھے درگزر کرنا۔ کہو گے تو تمہارے اور بختاور کے پیر تک پڑ جاؤں گی۔''

''رہنے دو کنیزاں..... ہم تمہارے جیسے نہیں ہیں۔''

☆.....☆.....☆

ابا نے سکتے کی کیفیت میں اپنی اس اولاد کو دیکھا تھا جو ان کے دل کے بہت قریب تھی۔ وہی اولاد جس کے دیے ہوئے دکھ نے انہیں ایک ہی رات میں بوڑھا کر دیا تھا۔ اماں بختاور کے پاس ہی رک گئی تھیں جبکہ انہوں نے اسے ابا کے ساتھ گھر کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ بختاور نے اماں سے بہت اصرار کیا تھا۔

''اماں! کنیزاں یہیں رک جائے گی ناں۔''

اماں نے سرد نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''یہ تمہارا گھر ہے۔ وہ اس گھر پر کوئی حق نہیں رکھتی۔''

آسمان پر چاند کی روشنی میں وہ ابا کے پیچھے پیچھے بیگ تھامے چلتے ہوئے رات کے ٹیلے عبور کرتی ہوئی اپنے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ راسیت میں وہ دونوں خاموش رہے تھے۔ ابا مویشیوں کو چارا ڈالنے لگے تھے۔ اور وہ ان کچے کمروں میں پھرنے لگی تھی۔ بختاور کی شادی کی وجہ سے اماں نے سارا سامان ہی تقریباً اس کے ساتھ روانہ کر دیا تھا اب بس چند ضرورت کی چیزیں ہی باقی بچی تھیں۔ جو سلیقے

سے لگی ہوئی تھیں۔ بھینسوں کو کافی دیر ہوگئی تھی تو ابا اب آدھی رات کو دودھ نکال کر بالٹیاں اندر رکھ رہے تھے۔ وہ بالکل چپ سے ہو گئے تھے جیسے وہ دونوں کوئی اجنبی تھے۔ وہ کئی بار انہیں متوجہ کرنے کی ناکام کوششیں کر چکی تھی۔ دودھ کڑھنے کی مہک پھیل گئی تھی۔ ابا نے ذرا کی ذرا ادھر نگاہ کی تھی۔ انہیں ایک پل کو مغالطہ ہوا تھا جیسے وہاں بختاور بیٹھی ہو۔ یہ بختاور کی عادت تھی کہ وجود کے گرد ہاتھ باندھے آگے کو گھورتی رہتی تھی اور دودھ ابل پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ اماں کو ٹوکنا پڑتا تھا۔

"سنبھل بختاورے۔ دودھ باہر گرنے لگا ہے۔"

وہ بھی کپاس کے تنکے سے راکھ کرید رہی تھی اور دودھ ابل کر باہر گرنے لگا تھا۔ ابا بے ساختہ بول اٹھے۔

"کنیزاں! سنبھال کے۔"

وہ جیسے چونک اٹھی تھی۔ نواز دی گئی تھی۔ اسے اپنے باپ کے الفاظ زندہ کر گئے تھے۔ زخموں پر جیسے کسی نے پھایا رکھ دیا تھا۔ دودھ سنبھال لیا مگر خود کو وہ مسافرہ سنبھال نہ پائی تھی اور دوڑ کر باپ کے سینے سے آن لگی تھی۔ تھل کے دور تک پھیلے ریت کے ٹیلوں پر ریت چمکنے لگی تھی۔

"ابا! اپنی قسم لے لے۔ میں شرمندہ ہوں۔ میں نے بہت غلط کیا، مجھے معاف کر دے۔ آج تک سکون کی نیند نہیں سو پائی ہوں۔ بچپن کی طرح اب بھی رات کی ماں ڈرانے آجاتی ہے۔"

ابا نے اپنی جوان اولاد کو روتے کرلاتے دیکھا تھا تو دل جیسے پانی پانی ہو گیا۔

"ہائے نی کنیزے۔ بس کر دے۔ تو نے مجھے بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ دیکھتی تو سہی تیرے باپ کو کس کس کے سوالوں کے جواب دینے پڑے۔ دنیا بہت ظالم ہے کبھی نہیں بخشتی۔ اج تک تیرا ابو یا ہوا میں کاٹ رہا ہوں۔"

کنیز فاطمہ نے باپ کے پیر پکڑ لیے تھے جنہیں وہ چھوڑتی ہی نہیں تھی۔

"بس ابا! ایک بار کہہ دے کہ تو نے معاف کیا۔ میں پھر سارے دریا پار کر لوں گی۔"

ابا نے تھک ہار کر بلب کی زرد روشنی میں اس کے سر پر دوپٹا برابر کیا اور پیشانی چوم لی۔

''چل چھوڑ دے.....سب بھول جا۔اللہ تجھے تیری منزل عطا کرے۔''

وہ ایک کامل لمحہ تھا جو امر کر دیتا ہے.....ایک فسوں ٹوٹا تو دوسرا طاری ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وقتِ قیامت تھا کہ گزرتا ہی نہ تھا۔ہاسٹل میں بھاگ دوڑ تھی۔ہر طرف، جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ہاسٹل انتظامیہ سارے معاملات کو سنبھالنے کی تگ و دو میں مشغول تھی۔عدن جبار اور فردوس گوہر کو جیسے کسی زہریلے بچھو نے ڈنک مارا تھا۔وہ دونوں نیلی ہو گئی تھیں۔سیرت امتیاز یوں اچانک چلی گئی تھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر..... یہ راہداریاں، سامان، خواب سب ہی کچھ۔وہ ایمبولینس کے ساتھ یونیورسٹی کے ہیلتھ سینٹر آ گئی تھیں جہاں کے ڈاکٹر نے سیرت کی موت کو کنفرم کر دیا تھا اور موت کی وجہ دل کا دورہ ہی بتایا تھا۔وہ ایک دوسرے کو ساتھ لگائے پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔

وہ سیرت امتیاز جو کیسی خوش باش پھرا کرتی تھی۔جس کے پاس کرنے کو اتنی باتیں ہوتی تھیں۔جس سے ہر ہر بات شیئر کرنے کو جی چاہتا تھا اور ان کی ساری اوٹ پٹانگ گوسپس کو بھی وہ کتنے سکون سے سنا کرتی تھی۔پچھلے دنوں ہی تو اس نے انہیں کہا تھا۔

''پہلے مجھے لگتا تھا کہ شاید میرے ہونے نہ ہونے سے صرف پوپلی بوا کو ہی فرق پڑتا ہے مگر اب مجھے سکون ہے کہ کبھی میں دنیا سے گزر بھی گئی تو کم از کم مجھے پیچھے رونے والے بہت سے لوگ تو ہوں گے۔''

وہ ایسی شہزادی تھی جو نشانیاں چھوڑ کر دنیا میں آئی تھی اور اب انہی کے سہارے واپس لوٹ گئی تھی۔

جب فجر کے سورج کی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی وہیں انہوں نے سیرت کے گھر والوں کو موجود پایا تھا۔سیرت کے ابا اور بہن اس کی ڈیڈ باڈی لینے آئے تھے۔وہ دونوں آیت امتیاز کے پاس آئی تھیں جو اپنی گلابی آنکھیں ٹشو پیپر سے بار بار پونچھ رہی تھی۔

''وہ تمہارا بہت ذکر کرتی تھی کہ تم دونوں کا وقت بہت اچھا گزرا۔تم دونوں کا ایک ہی کمرا ہے جہاں تم دونوں اتفاق سے رہتی ہو۔آدھی رات کو تم دونوں کو بھوک لگ جاتی ہے تو تم دونوں کچن کا رخ کرتی ہو اور تم دونوں کی انہی عادتوں کی وجہ سے پوپلی بوا بہت تنگ ہوتی ہیں۔''

آیت امتیاز کسی کیل کی مانند گڑ گئی تھی۔ وہ تعلق ایسا تو کبھی کبھی نہیں رہا تھا جیسا سیرت امتیاز نے پوٹرے کیا ہوا تھا، دل کو دھکا سا لگا تھا۔ آنسو بند توڑ کر آنکھوں سے باہر آئے تھے۔

فردوس نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے تھے۔

''اس نے کہا تھا کہ جلد آیت کی شادی ہوگی تو وہ ہم سب کو دعوت دے گی۔ اور ہم سب مل کر تمہاری مایوں کو خاص بنائیں گے۔ ہم تو تمہاری شادی کے لیے ڈھولک بھی سیکھنے والے تھے۔''

عدن جبار نے امتیاز صاحب کے سامنے بیٹھ کر جیسے اس کی سفارش کی تھی۔ ''مجھے نہیں معلوم آپ دونوں کا رشتہ کیسا تھا، مگر اس کی آپ سے محبت کی گواہی میں دیتی ہوں۔ وہ ایک فرماں بردار بیٹی تھی مگر آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی..... بہت دیر کر دی۔''

وہ ہاسٹل آ کر سیرت کا سامان باندھنے لگی تھیں۔ کچھ خستہ صفحات والی ادھوری ڈائریاں تھیں۔ چند سادہ سے کپڑوں کے جوڑے تھے۔ اسی سامان میں ایک شیفون کے دوپٹے کے کونے میں سونے کے جھمکے گانٹھ لگے ہوئے ملے تھے۔ وہ شاید اس کی ماں کے تھے جنہیں وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتی تھی۔ آیت نے اس کمرے کے در و دیوار کو دیکھا تھا۔ اس کا بستر، نوٹس، دیوار پر کچھ اقتباسات کی کترنیں، چند پلاسٹک کے ڈبے جن میں دو تین بار پوپلی بوا نے پنجیری بھجوائی تھی۔ سیرت امتیاز کا بیگ کندھے پر ڈالے وہ روتی ہوئی عدن اور فردوس کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھے اپنے باپ تک آئی تھی۔ باپ کی جھولی میں وہ زادِ راہ ڈال دیا گیا جو وہ پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ امتیاز کو لگا جیسے وہ روز قیامت ان کا گریبان پکڑ لے گی۔ وہ تہی دست بیٹھے رہ گئے تھے۔ جوان بیٹی کی موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

عدن جبار اور فردوس گوہر کو بمشکل سیرت کے مردہ وجود سے الگ کیا گیا تھا۔ جامعہ پنجاب کی سرمئی سڑکوں پر روتی ہوئی ان دو لڑکیوں کو سب نے افسردگی سے دیکھا تھا۔ ڈگریاں مکمل ہوتی ہیں۔ دوست بچھڑ جاتے ہیں۔ پھر زندگی میں کبھی کسی نئے موڑ پر ملنے کی خاطر..... مگر جو دوست مر جاتے ہیں تو پھر کبھی ملن نہیں ہوتا..... پیچھے بس خسارہ ہی رہ جاتا ہے..... دور دور تک..... خالی پن.....!

☆.....☆.....☆

یہ اکیسویں صدی تھی۔ زمانہ یا صدی جو بھی ہو دکھ درد کی کیفیات کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔

کنیزاں فاطمہ اور تمکین جمال جب واپس آئیں تو انہیں عدن اور فردوست نے سنبھالا تھا سب ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ یوں لگا جیسے سب خواب ہو، خیال ہو..... سچ اتنا بھیانک کیسے ہوسکتا ہے کہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ وہ دونوں بھی سچ کی ڈسی تھیں۔ وہ ان دونوں سے کتنے لاڈ اٹھواتی تھی۔ چائے اسے ہمیشہ تمکین کے ہاتھ کی پسند تھی۔ اسائمنٹ بنانے میں کنیزاں سے مدد لے لیا کرتی تھی۔ کمرے کی بالکونی میں آدھا لٹک کر سب پر نظر رکھنے سے لے کر آخری بار اسے امرتا پریتم کی کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

تب تمکین نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے آج کل تم سے کچھ صحیح قسم کی وائبز نہیں آرہیں؟''

''یہ اندازہ کیوں کر لگایا تم نے؟''

''امرتا پریتم کو جو تم پڑھ رہی ہو اور چن چن کر ''محبت اور اداس نظمیں'' جو صرف عاشق مزاج لوگ ہی پڑھ سکتے ہیں۔''

تمکین کی اس بات پر وہ کتنا ہنسی تھی۔ ''تو پھر جوہار پڑھ رہا ہوگا اس سے کیسی وائبز آئیں گی؟''

تمکین کو تاؤ آ گیا تھا۔ ''آج کے بعد میری توبہ جو دوسروں کے بارے میں رائے پیش کروں۔''

آج وہ چاروں اس کمرے میں فرش پر بیٹھی تھیں۔ سامنے ہی چائے کے چار کپ رکھے تھے جن پر تہ جم گئی تھی۔ چاروں کو بس ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''دوست مر بھی تو جاتے ہیں، بن بتائے، اچانک۔''

فردوس گوہر نے سسکی لی تھی۔ عدن بھی دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ کنیزاں کی گود میں تمکین نے سر رکھ لیا تھا۔

''ہائے سیرت..... ایک بار تو مل کر جاتیں کہ ہم دونوں سے بغیر دکھ سکھ کے چل دیں۔ یوں بھی کوئی جاتا ہے۔ اب میس پر کون لڑے گا۔ کون کمرے کی تفصیلی صفائی کرے گا۔''

وقفے وقفے سے ہاسٹل کی باقی لڑکیاں بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ یونہی بغیر کسی جان پہچان کے..... چپ چاپ..... جیسے ڈھارس باندھ رہی ہوں۔ انسان، انسانوں سے ایسے تو جڑتے ہیں۔ کسی ٹوٹے ہوئے لمحے میں.....!

☆.....☆.....☆

وقت بہت ظالم ہوتا ہے سب کچھ پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور جو لوگ وقت کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے ان کے ساتھ یہ بے وجہ کا بیر باندھ لیتا ہے۔ ہر واقعے پر دھول مٹی ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

تعلیمی سال اختتام پذیر ہونے کو تھا۔

نوٹس رٹنے میں وقت گزر جاتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی اجنبی سی ہنسی بھی چہرے کا احاطہ کر لیا کرتی تھی۔ وہی سڑکیں تھیں۔ راستے تھے۔ راہداریاں تھیں۔ کوریڈورز تھے جہاں وہ اکٹھے چلا کرتی تھیں مگر اب وہ قافلہ بکھر گیا تھا۔

کنیزاں اور تمکین چھت پر ٹہلتے ہوئے سیرت کی باتیں کیا کرتی تھیں اور چپکے چپکے نیم اندھیرے میں اپنے آنسو صاف کر لیتی تھیں۔ بختاور کو اس نے بتایا تھا تو جیسے وہ بھی جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔

''کنیزاں۔ یہ..... یہ..... کیسے ہو گیا؟''

''یہی تو ہم سوچ رہے ہیں کہ کیسے ہو گیا؟'' وہ سسکی تھی۔

''اسے بہت شوق تھا تمہارے بارے میں پوچھنے کا۔ ہمارا تھل دیکھنے کا۔ تمہارے سندھی ٹانکوں والے تکیے اور کروشیا کے کام کو دیکھنے کا۔ کہتی تھی بختاور کے ہاتھ کا ساگ کھائے گی۔ اماں کے ہاتھ کے بونٹ پلاؤں کے ذکر سے ہی وہ بے صبرے پن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ طے یہی پایا تھا کہ ہم فائنلز کے بعد تھل اکٹھے ہوں گے۔ مگر دیکھو بختاور، ہم نے کیا سوچا؟ اور ہمارے ساتھ کیا ہو گیا؟''

''اللہ بھی اچھے لوگوں کو کتنی جلدی اپنے پاس بلا لیتا ہے ناں کہ، کچھ اور مہلت دے دے۔ مگر یہی اس کے قائدے اور قرینے ہیں۔ ہم نے جن پر بس صبر اور حوصلے سے کام لینا ہوتا ہے۔''

وہ خود چچی کی وفات کے بعد خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ اماں بھی بس چند دن ہی وہاں رہی

تھیں۔اس کے بعد انہوں نے واپسی کی راہ لی تھی۔

سکندر اس کی تنہائی کے خیال سے زیادہ گھر پر ہی رہتا تھا۔ وہ اپنے آڑھت کے کاروبار کو پھیلانے کی کوششوں میں تھا۔ سارا دن کوئی نہ کوئی مہمان آیا ہی رہتا تھا۔ ایسے میں اسے بار بار بختاور سے مخاطب ہونا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جو شروع کے دنوں کی ایک دیوار تھی اب وہ ڈھے گئی تھی۔ وہ دونوں اب چھوٹی چھوٹی باتیں کیا کرتے تھے۔

''سنو، ہم نے سارے صحن کی حالت خراب کردی ہے۔ آخر کرنا کیا چاہتی ہو تم؟''

پچھلے ایک ہفتے سے وہ مسلسل سکندر سے کام کروا رہی تھی یہاں تک کہ وہ زچ ہی آ گیا تھا۔ تب اس نے قریبی شہر سے نت نئے پھولوں کی پنیر منگوا کر لگائی تھی اور اپنے اس شوق کی آبیاری میں وہ آدھا کام سکندر کے سر ڈال چکی تھی۔ ان پودوں کے کھاد پانی کی روزانہ کی بنیادوں پر فراہمی سکندر کے ہی ذمہ تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی شوق تمہارا ہے اور مشقت مجھے کرنی پڑ رہی ہے۔'' وہ دونوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے قریب آ گئے تھے۔ تب ایک شام جب وہ ساگ کی گندلیں توڑ رہی تھی تو اس نے لہجے کو ہر ممکن عام بنا کر سکندر کی طرف سوال پھینکا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

وہ جو قینچی پکڑے پودوں کی کانٹ چھانٹ میں لگا ہوا تھا مصروف سے انداز میں اجازت دے بیٹھا تھا۔

''تمہارے دل میں اب بھی کیا کنیزاں کے لیے کچھ ہے؟''

سفید گلاب کی ایک توانا سی شاخ کٹ گئی تھی۔ وہ جیسے چند لمحوں کے لیے بالکل ہی غائب دماغ سا ہو کر رہ گیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ چولہے میں انگارے ٹٹولتی اس کی شریک حیات کے لیے وہ جواب کتنا ضروری تھا۔

''سب ختم ہو گیا ہے بختاور..... میں نے خود کو نصیب کے فیصلے پر راضی کر لیا ہے۔ ویسے بھی تم جیسی ایک اچھی بیوی کے ہوتے ہوئے مجھے اور کسی کو سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

ساگ مٹی کی ہانڈی میں ابل رہا تھا۔ وہ سفید گلاب کی کٹی ہوئی شاخ کو دیکھ رہی تھی اور شوہر کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بھی سن چکی تھی بختاور نے سر اٹھا کر آسمان کی وسعتوں میں دیکھا تھا۔

"تو پھر طے ہوا کہ جو زندگی میں ملے اس پر راضی ہونا چاہیے۔ پچھتاوے، شکایتیں کبھی بھی کام نہیں آتے۔ مجھے ایک گھر کی خواہش تھی مگر میرے حصے میں اتنا اچھا گھر آئے گا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ تو چلو ایسے ہے تو ایسے ہی سہی۔ نصیب میں جو ہو مل کر ہی رہتا ہے۔ کیا پتا کچھ دن بعد کسی دوپہر میں یہی سوال دوبارہ اپنے شوہر سے کروں اور اس بار وہ سفید گلاب کی شاخ کو محفوظ رکھ کر درست جواب دے ہی دے۔"

☆.....☆.....☆

زندگی میں کبھی ہم یہ سوچ لیتے ہیں کہ ہماری زندگی میں آنے والی مشکلات مسئلے کبھی حل ہی نہیں ہوں گے۔ مگر زندگی کی سب سے خوب صورت یہی بات ہے کہ اس نے آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ بہت کچھ پیچھے چھوڑ کر اور بہت کچھ ہمارے آگے رکھ کر۔ اگر ہم ماضی میں کبھی مصیبتیں برداشت کرتے بھی ہیں تو آنے والا لمحہ جو ہوتا ہے وہ ہمارے لیے کسی انعام کی صورت نمودار ہوتا ہے۔

شاید ماہی باجی نے بھی زندگی میں جو مشکلات اور تکلیفیں دیکھی تھیں ان کے خراج کا وقت آ گیا تھا۔ زندگی نے ان کے سامنے سارے ان کی تکلیفوں کے سد باب اور کفارے رکھ دیے تھے۔ جمال بھائی کی صورت میں۔

شادی کی تیاریوں میں وہ سارے گھر والے پیش پیش تھے۔ نیلم نے ماہی باجی کی شادی کی تیاری میں باجی کے لیے دنیا جہان کی ہر چیز خرید لی تھی۔

ماہی باجی اب بھی اپنے اسکول سے چھٹیاں لینے پر آمادہ نہیں تھیں تو نتاشا نے انہیں خوب رگیدا تھا۔

"ارے باجی! آپ بھی کمال کرتی ہیں کوئی عام بات تو نہیں ہے آپ کی زندگی کا سب سے اچھا وقت شروع ہونے والا ہے آپ کی شادی ہے اور آپ ہیں کہ پھر سے وہی کاپیاں چیک کرنے بیٹھ گئیں۔"

سکون سے ماہی باجی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا اور اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

"جانتی ہوں۔ مجھے سب پتا ہے، یہ لمحہ یہ وقت اس گھر میں کتنے عرصے بعد آیا ہے اور میری وجہ

سے تم لوگوں نے بھی بہت پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا جو انسان ذمہ داریوں سے منہ موڑ لیتا ہے نا تو پھر ساری زندگی اس کا وہ گلٹ نہیں جاتا۔ مجھے معلوم ہے میری زندگی کا نیا سفر شروع ہونے والا ہے لیکن اس کے لیے میں خودغرض ہو کر اپنے ذمے جو میرے کام رہتے ہیں انہیں تو پیچھے نہیں چھوڑ سکتی۔"

"لیکن پھر بھی۔"

"میں جانتی ہوں تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاید سب یہی کہیں۔ لیکن میں کیا کروں مجھ سے ایسے دلہنوں کی طرح ابھی سے مایوں نہیں بیٹھا جاتا اور فارغ رہ کر کرنا ہی کیا ہے.....؟ چلو یہ ہے کہ اسکول کا کام کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"میں تو یہ سوچ کر خوش ہوں کہ آپ گھر کو کس طرح سجائیں گی، سنواریں گی اور جمال بھائی کے لیے مزے مزے کے پکوان بنائیں گی۔ ویسے سنا ہے وہ کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں۔"

نتاشا نے جیسے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا تھا اور وہ جیسے ہنسی تھیں۔

"چلو، جو بھی ہوا اتنا تو پکا ہی لیتی ہوں کہ اس کا دل اور معدہ دونوں خوش رہیں گے۔"

"بس ماہی باجی، آپ کا جواب نہیں۔ بس میرا دل چاہتا ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں زندگی میں آپ کو کبھی کوئی پریشانی نہ ہو۔" نتاشا نے انہیں دعا دی تھی۔

تب ہی اس منظر نامے میں نیلم داخل ہوئی تھی جو محلے کی دکان سے گوٹے کناری کی لیسوں کے بنڈل اٹھا کر پھر رہی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے مجھے ہی سارے فنکشنوں کی فکر پڑی ہوئی ہے اور سارے کام میرے ذمے ہیں۔ نتاشا میڈم کو دیکھو گپیں ہانک رہی ہے، ایک میں ہوں کام کر کر کے دبلی ہو گئی ہوں۔"

"ہاں، تم نے تو جیسے کئی پہاڑ کھودے ہیں ناں!"

"ہاں بھئی۔ میچنگ چیزیں ڈھونڈنا پہاڑ کھودنے سے زیادہ ضروری اور قیمتی ہوتا ہے اور اتنا باہر والا کام ہے اور ایک اماں ہیں اوپر سے۔ ایسے ایسے کام۔ یاد آیا ہر چیز پہ۔ پہلے یہ کہتی تھیں کہ جیسے ہی

ماہی باجی کا رشتہ ہوا ہماری ساری تیاری ہوئی پڑی ہے۔"

اماں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ساری تیاریاں ہو چکی ہیں اور اب پتا چل رہا تھا ہر روز کوئی نہ کوئی چیز نکل آتی تھی۔ نیلم گوٹے کناریاں کنارے پہ کر کے دھم سے وہیں بیٹھ گئی تھیں۔

"نتاشا! اللہ کے واسطے ایک چائے کا کپ بنا دو، میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔"

نتاشا کچن کی طرف چلی گئی تھی اور تب ہی اس کی نظر بھی ماہی باجی کی گود میں پڑے پیپرز پہ پڑی تھی۔

"بس کچھ پیپر رہ گئے تھے سوچا چیک کر کے جمع کرا دوں اس کے بعد تو ایک ہفتہ میں نے چھٹیوں پہ ہونا ہی ہے۔"

"بس بہت ہو گئے کام، اب آپ اپنے آنے والے وقت کو سوچیں اور گزاریں۔"

وہ نیلم کی بات پر مسکرا دی تھیں کہ یہ وہی نیلم تھی جس نے خود زندگی میں کتنی بڑی ٹھوکر کھائی تھی۔ اور آج جیسے اس نے خود اپنے وجود کی مسمار عمارت پھر سے کھڑی کر لی تھی۔

"آپ کی ساس بھی آتی ہی ہوں گی، انہوں نے ویسے بھی آپ کا ناپ لینے آنا ہے۔"

ادھر کچن میں کھڑی نتاشا کے موبائل پر میسج ٹیون بجی تھی اس نے موبائل اٹھا کر سامنے کیا تھا سامنے ہی موی کا نام اسکرین پر جگمگا رہا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"ہاں جی کیا ہو رہا ہے؟"

مسکرا کر جواب ٹائپ کیا تھا۔ "چائے بن رہی ہے۔ پیو گے؟"

"تمہارے ہاتھ سے تو کچھ بھی پینا قبول ہے۔"

"بس رہنے دو۔"

اسی وقت اس کی کال آ گئی تھی اور جب اس کی کال آتی تھی تو لمبی لمبی گفتگو پر شروع ہو جاتا تھا۔

"اگر کسی طرح کی بھی میری مدد کی ضرورت وتو ضرور بتانا۔" وہ جیسے اپنی خدمات پیش کر رہا تھا۔

"نہیں۔ تمنے کہہ دیا یہی کافی ہے۔ ویسے بھی لڑکیوں کی شادیوں میں ایسے کام ہوتے ہیں تو ہم کر ہی رہے ہیں سارے مل کے تو ہو جائے گا۔ میں بہت خوش ہوں کہ ماہی باجی گھر کی ہو جائیں گی۔

تمہیں نہیں پتا گھر بیٹھی ہوئی بیٹیاں ماں باپ پر بوجھ ہوتی ہیں۔" وہ جیسے اداسی کی کیفیت میں بولی تھی۔

"خیر، اس حوالے سے تمہیں تو پریشان ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں کیونکہ ماہی باجی کی شادی ہو رہی ہے پیچھے بس رہ گئی صرف نیلم۔"

"تو میرا کیا ہوگا؟" وہ جیسے شرارتی ہنسی ہنسی تھی۔

"تمہارا تو بندوبست پہلے ہی ہو چکا ہے۔"

"تم بھی جانے کہاں کی کہاں کڑیاں جوڑتے رہتے ہو۔"

وہ بھی دوسری طرف سے زور سے ہنسا تھا جیسے اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ وہ دونوں بات کرتے رہے تھے یہاں تک کہ چائے ابلنا شروع ہو چکی تھی۔

ماہی باجی کا نکاح ہو رہا تھا فی الحال کیونکہ جمال اپنا نیا گھر بنا رہا تھا تو اس کا ارادہ شادی کے بعد نئے گھر شفٹ ہونے کا تھا مگر تب تک وہ نکاح کے بندھن کو لازمی سمجھتا تھا۔ تو دونوں طرف سے رضا مندی کے بعد یہی طے پایا کہ یہ فنکشن تو فی الحال کر لیا جائے..... کچھ ہی عرصے بعد پھر رخصتی کر لی جائے گی۔ ماہی کو ایک دم سے سکون محسوس ہوا تھا۔ انہوں نے کرسی سے ٹیک لگا کر جھولتے ہوئے اس آنگن کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

"لڑکیاں بھی کیا چیز ہوتی ہیں ساری زندگی اپنے ماں باپ کے گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک اور نئے گھر کی منتظر رہتی ہیں جسے وہ اپنا گھر کہہ سکیں۔ ایک ایسا رشتہ جسے دنیا شوہر کا نام دیتی ہے، جس کے سہارے وہ اپنے خون کے رشتے چھوڑ کر جاتی ہیں اور وہی ایک رشتہ ان کے لیے سب رشتوں سے زیادہ عزیز ہو جاتا ہے اور وہ اسی نام سے پہچانی جاتی ہیں۔"

یہ گھر جس میں انہوں نے زندگی کے اپنے اکتیس سال گزارے تھے آج وہ گھر ان کے لیے پرایا ہو جانے والا تھا۔ وہ گھر جہاں انہوں نے اپنی زندگی کا ہر طرح کا وقت دیکھا تھا۔ غربت بھی، تنگی بھی، خواب بھی اور تھوڑی بہت آسانی بھی اور انہوں نے اس گھر کی اینٹ، ہر دیوار کو جوڑنے میں کتنی محنت کی تھی۔ اور اب بھی انہیں یاد آ رہا تھا کہ اب بھی اس گھر کی دیواروں پر لگے ہوئے رنگ ان تینوں

بہنوں نے مل کر پینٹ کیے تھے۔ وہ گھر کی دیواریں ان کی محنت کی گواہ تھیں۔ اور چھوٹے چھوٹے بالکونی اور برآمدے میں رکھے ہوئے گملے جن پر پھول آئے ہوئے تھے وہ بھی ان کی اپنی محنت تھی۔

کبھی کبھی زندگی انسان کو وہیں فٹ کر دیتی ہے جہاں کے لیے وہ بنا ہوتا ہے۔ جیسے مطمئن ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

فردوس گوہر نے اس برقی قمقموں سے سجے ہوئے چھوٹے سے گھر کو دیکھا تھا۔ جہاں ب۔ٹھ کر وہ اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ سب سے ایک طرح سے نکاح کے لیے ہی ایک چھوٹا سا رات کا مہندی کا فنکشن رکھ لیا تھا۔

ماہی باجی مایوں کے زرد جوڑے میں ملبوس صوفے پر براجمان تھیں۔ مہندی کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک کونے میں آرام دہ جگہ پر بیٹھ کر ہولے ہولے تالیاں بجاتی ہوئی اس فنکشن کو انجوائے کر رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اب تک بہت کم شادیوں کے فنکشن اٹینڈ کیے تھے۔ اب بھی وہ بے حد اصرار پر وہاں ایک رات رہنے کے لیے آئی تھی۔ پہلے پہل عجیب محسوس ہوا تھا مگر بعد میں نتاشا کی خوشی کی خاطر وہ آ ہی گئی تھی۔ اور سیرت کی موت کے بعد تو جیسے زندگی پر ایک جمود سا طاری ہو گیا تھا مگر آج اس کے لیے موجود ہونا بے حد ضروری تھا۔

نیلم کئی بار آ کر اس سے کھانے کا پوچھ چکی تھی وہ اسے منع کر چکی تھی۔ بس وہ ان نستے مسکراتے چہروں کو دیکھنا چاہتی تھی قریب رہ کر محسوس کرنا چاہتی تھی کہ اصل خوشی کیا ہوتی ہے؟ زندگی کے رنگ کیا ہوتے ہیں؟ اور وہ اسے محسوس ہو رہے تھے۔

گیندے کے پھولوں کی لڑیوں سے وہ گھر سجایا گیا تھا۔ چنچل لڑکیاں جو کلائیوں میں کھنکتی چوڑیوں کے شور میں چھوٹے چھوٹے قہقہے لگاتے ہوئے کئی راز و نیاز میں مگن تھیں۔ تب ہی ماہی باجی نے اشارے سے فردوس کو اپنی طرف بلا کر ساتھ بٹھا لیا تھا۔ وہ فردوست گوہر کی زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ ماہی باجی جمال بھائی کی ملکیت ہو چکی تھیں۔ جلد ہی وہ اس گھر کو چھوڑ کر نئی زندگی شروع کرنے والی تھیں۔

☆.....☆.....☆

تمکین جمال نے اپنے ماضی کے بخیے کنیزاں کے سامنے ادھیڑے تھے۔

''کنیز فاطمہ! ہم نے خواب بنے تھے مگر وہ دھاگے کچے تھے، سب کچھ ادھڑ گیا ہے سینے کے ہنر میں ہم دونوں اناڑی ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ میرا سانس بند ہو رہا ہے۔ کاش ہم دونوں بھی سیرت امتیاز کی طرح سب چھوڑ چھاڑ کر دل کے مرض کا سہارا لے کر کسی اور طرف نکل جاتے۔''

کھڑکی کھلی ہے مگر ہوائیں بند ہو چکی ہیں۔ تین کمروں کا چھوٹا سا گھر جس کے آنگن میں وہ بینگن اور گاجروں کی کیاریاں ہٹایا کرتی تھی اور لکڑی کی سیڑھی پر بیٹھ کر ریڈیو پاکستان سنتے ہوئے، رسالے پڑھتے ہوئے وقت کو گزارا کرتی تھی۔ تب زندگی کا الگ رنگ تھا اور اب سب کچھ جیسے کسی جادو کی چھڑی سے بدل کر رہ گیا تھا۔

وہ سات سال کی تھی جب اماں کینسر کے موذی مرض سے چل بسیں اور گھر میں پھوپھی لوگوں کی عدالتیں لگنا شروع ہوئی تھیں۔

''جمال دین! لڑکی ذات کے سہارے کیسے زندگی گزر سکے گی، اب دوسری شادی کر لو۔''

اور ابا کا ان پچیس سالوں میں جواب کبھی بھی مثبت نہیں آیا تھا۔

''نہیں آپا۔ تمکین ہی تو میرا سہارا ہے۔''

پھوپھی سختی بھری آنکھوں سے اسے دیکھا کرتی تھیں اور وہ سہم جایا کرتی تھی۔

''عمر میں بے شک ہم سب سے بڑے ہو جمال دین، مگر یوں ہٹ اور ضد کی روش چھوڑو آگے اتنی عمر پڑی ہے آخر کب تک اور کہاں تک گزارو گے بھلا۔ لڑکی ذات پلے میں ہے جو اگلے گھر کی ہو جائے گی پھر سے یہ ویہڑا سنسان اور اکیلا لے کر بیٹھ جاؤ گے انسان کے ساتھ سو قسم کی بیماریاں اور ضرورتیں ہوتی ہیں۔''

ابا جمال ان پچیس سالوں میں ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوتے تھے، پھوپھی جھک مار مار کر اپنے کرائے بھر بھر کر سفر کر کے آتیں اور بے مراد لوٹ جاتی تھیں۔ کہ ان کے بھائی کا دماغ چل چلا گیا ہے کیونکہ ان کے منہ بس ایک ہی جملہ چڑھ گیا تھا۔

''بس آپا، کیا کروں دل نہیں مانتا۔''

آخری بار تو نجمہ پھوپھی اکلوتے بڑے بھائی کے اس جملے سے سخت کبیدہ خاطر ہوئیں کہ جس موڑھے پر بیٹھی تھیں اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

''دل کی ایسی کی تیسی۔''

کہاں تھا ناں وقت کو چابی لگی ہے، رفتار پکڑ لیا کرتا ہے، بھاگے جاتا ہے، اور انسانوں کو لمحوں کے اشراپ دے جاتا ہے۔

تمکین جمال نے زندگی میں اگر کسی شخص سے محبت کی تھی تو ابا جمال دین سے کی تھی۔ وہ مسالوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ان تین کمروں کے گھر سے کبھی بھی لونگ، بادیان، الائچی، اور جاوتری کی خوشبو نہ گئی تھی۔ وہ دونوں باپ بیٹی مل کر مسالے صاف کرتے رہتے اور سل بٹے پر پسائی کرتے رہتے تھے۔ تمکین جمال کا بچپن، لڑکپن ان ہی مسالوں کو پیستے ہوئے ہی گزرا تھا۔ سہیلیاں بنانے کا فن اتنا آسان نہیں تھا کہ وہ ماہر ہو جاتی اور ڈھیروں سہیلیاں بنا کر کلی، شنا پو کھیلتی۔ اسے بس ایک ہی کام آتا تھا دروازے میں کھڑے ہو کر ہر آتے جاتے ہوئے کو ٹکٹکی باندھ کر تکے جانا اور بس۔ یہی زندگی تھی۔

☆.....☆.....☆

عدن جلے پیر کی بلی کی طرح اس رات ٹیرس پر ننگے پاؤں گھومتی رہی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی زندگی کا ایک اہم ترین دن بھول گیا تھا۔ وہ بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ کھا چکی تھی۔ اور مام اس کی اس بے چینی اور اضطراب کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

''تم کچھ ڈسٹرب ہو عدن؟''

''پتا نہیں مام۔ زندگی عجیب ہوتی جا رہی ہے۔''

''تم آج کل کے بچوں کا یہی تو مسئلہ ہے کہ تم لوگوں کے لیے ہی سب عجیب اور کشمکش میں ہوتا جا رہا ہے۔ تم لوگ صرف مسائل کو سوچنے کے مرض میں مبتلا ہو میری جان۔''

''بس مام! میں بہت کوشش کرتی ہوں مگر پھر بھی۔'' مسلسل ادھر سے ادھر ٹہل ٹہل کر وہ اب

کاؤچ پر ڈھیر ہو چکی تھی۔

''کیا مسئلہ ہے جو تم اتنا بے چین دکھائی دیتی ہو؟''

''وہ میری برتھ ڈے بھول گیا ہے مام۔''

''انسان کے ذہن سے نکل جاتا ہے ہر بات فرض کر کے نہیں بیٹھ جایا کرتے۔'' وہ اپنا کافی کا کپ لے کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھیں۔

''آپ کو پتا ہے، آپ بہت مثبت ہو کر اب زندگی کو دیکھتی ہیں۔ وہ مسئلے بھی آپ کی آنکھ سے اوجھل ہو رہے ہیں جو واقعی میں مسئلے ہیں۔ جن کا حل بھی بہت ضروری ہے۔''

''میں ماں ہوں تمہاری۔ تمہاری فطرت، مزاج مجھ سے بڑھ کر کون جانچ پرکھ سکتا ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ تم بھی گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بہت بدل گئی ہو عدن، مگر ابھی بھی تمہیں وقت ملے گا۔ جب انسان کو سب کچھ تیاگ دینے کا حوصلہ آ جاتا ہے تو پھر سب صحیح ہونے لگتا ہے۔ اتنا کسی چیز کے پیچھے دوڑو جتنا دوڑ سکو، ورنہ جو چیز، شخص، تعلق تھکانے لگے تو تم بھی اپنی رفتار سست کر دو۔''

وہ اٹھ کر مام سے لپٹ گئی تھی۔ وہ ہولے سے اس کے بال سہلاتے ہوئے جیسے کہیں اور پہنچ گئی تھیں۔

ہم خود کتنی بڑی جنگوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ بہت سے موقعوں پر لڑ رہے ہوتے ہیں۔ جیت رہے ہوتے ہیں۔ ہار رہے ہوتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

خلیل نے فردوس گوہر کو آخر کار امل جی سے ملوا ہی دیا تھا۔ فردوس گوہر نے پہلی ہی ملاقات میں امل کی آنکھوں میں ایک حزن دیکھا تھا جو ان کی پوری شخصیت پر حاوی ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہت گریس فل پرسنالٹی کی مالک تھیں۔ ہیرے کی انگوٹھیوں سے سجے ہاتھ جنہیں عادتاً وہ گھما رہی تھیں۔

''تم بہت خوب صورت ہو گوہر۔ تمہیں دیکھ کر واقعی کچھ پل کے لیے آنکھیں اٹھنا بھول جاتی ہیں۔ میں اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی اور برانڈز کی چین بنا رہی ہوں اور میری کوشش سے میں معمول سے ہٹ کر کچھ کام کروں۔ کچھ ایسا جو ہر کسی کو چونکا کر رکھ دے۔''

سامنے بیٹھی ہوئی عورت کی آنکھوں میں خواب تھے۔ خوابوں کے شاید کھیت تھے جہاں محنت کا بیج ڈال کر وہ کامیابی کی فصل کاشت کرنے والی تھیں۔ فردوست گوہر کو ان سے مماثلت سی محسوس ہوئی تھی۔

انہوں نے پانچ ملاقاتیں کی تھیں اور ہر بار ہی ملنے کا اچھا تجربہ رہا تھا یہاں تک کہ فردوست کو انہوں نے راضی کر لیا تھا۔

''یہ میری اپنی شناخت کا سوال ہے گوہر!''

وہ اسٹرا گھمانا چھوڑ کر اب ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''کیسی شناخت؟''

وہ دھیرے سے جیسے مسکائی تھیں۔

''ہماری لو میرج تھی اور ہم دونوں یونیورسٹی فیلو بھی رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رشتہ ریت کے گھروندے جیسا ہوتا جا رہا تھا اور پھر آخری بنیاد تب مسمار ہوئی جب اسفند نے دوسری شادی کر لی۔ ایک کامیاب بزنس وومن کے ساتھ۔ جو اس کو ہر جگہ پروٹیکٹ کر سکتی ہے۔ اسے بڑی گیدرنگ میں جانے کا بہت شوق ہے۔ نت نئے لوگوں سے ملنے کا شوق ہے۔ جس شخص کے شوق ایسے ہوں تو پھر وہ یوں ہی ہاتھوں سے نکل جاتا ہے اور میری ہتھیلیوں سے میرا یہ رشتہ بھی نکل گیا ہے۔ ہم ہفتے میں دو بار اکٹھے ڈنر کر لیتے ہیں۔ بچوں کی پیرنٹس میٹنگ میں بھی چلے جاتے ہیں۔ مگر اس سارے عرصے میں اس کے چہرے کی شکنیں مجھے نظر آتی رہتی ہیں۔ میں ایک بہادر عورت ہوں فردوش، مگر ایک چیز مجھے بہت خوف زدہ کر کے رکھ دیتی ہے۔''

وہ ٹشو سے آنکھیں صاف کر رہی تھیں۔ سلک کی ساڑھی میں ملبوس وہ خود اتنی دلنشین شخصیت کی مالک تھیں کہ اس ہوٹل کے انٹرنس سے آنے والا ہر شخص چند ثانیے ٹھٹک کر انہیں ضرور دیکھتا تھا۔

''میرے شوہر کے ماتھے پر میرے ساتھ زبردستی وقت گزارنے کی شکن مجھے ڈرا دیتی ہے کہ اب اس کی زندگی میں بس میں ایک ان چاہی شکن ہوں اور بس۔''

فردوس گوہر نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ فردوس گوہر نے ماڈلنگ کریئر کا آغاز امل جی کے ساتھ

ہی کرنا تھا۔

وہ دونوں چہروں پر مسکراہٹ اوڑھ کر ہوٹل سے باہر آئی تھیں۔ اچانک وہاں جانے کیسے فردوش گوہر کی نظر پارکنگ میں ریشمی پر پڑی تھی۔ جو فردوس کو پہچان کر بہت خلوص اور محبت سے اس کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ وقت کی چادر پر جانے کتنی ہی سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔ ریشمی نہیں جانتی تھی کہ وہ کچھ مدت پہلے والے فردوس نہیں تھی۔ وقت سب کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ وہ بھی بدل گئی تھی۔

آنکھوں پر گلاسز چڑھا کر وہ ریشمی کو نظر انداز کیے اہل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر جا چکی تھی۔ جیسے کوئی اجنبی ہوتا ہے۔ ناواقف ہوتا ہے۔ ریشمی کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر زمین پر گرا تھا۔

کاش فردوس گوہر اس لمحے ریشمی کے چہرے پر اترتا کرب پڑھ سکتی۔

☆.....☆.....☆

''تم سن رہی ہو ناں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ میں نے کبھی وہ چیز استعمال نہیں کی کہ جس کے بارے مجھے شبہ بھی ہو کہ وہ کسی اور نے استعمال کی ہو کبھی۔ یہاں چیز ہوتی کوئی کافی مگ، موبائل فون، آؤٹ فٹ، اسکارف تو میں چھوڑ دیتی کسی لمحے بھی سوچے بغیر مگر فردوس گوہر، یہاں معاملہ کسی چیز کا نہیں ہے، ایک انسان کا ہے۔ جو میرے لیے کتنا ضروری ہے یہ بات صرف میں جانتی ہوں تم نے مجھ سے خلیل کو چھینا ہے۔''

عدن جبار کا گلا رندھ گیا تھا آواز بیٹھ رہی تھی۔ وہ اسے مسلسل چھتیس منٹ سے لتاڑ رہی تھی جو اب میں وہ ہمیشہ کی طرح چپ رہی تھی کہ اسے بس یہی کرنا آتا تھا، خاموشی اور بس۔

فردوس گوہر نے اپنی نم آنکھوں کو اٹھایا تھا۔

''میں ایسے کیسے کر سکتی ہوں عدن، میں تمہارے ساتھ کیسے کر سکتی ہوں؟''

وہ تائید چاہتی تھی مگر کنیز اور تمکین بھی عدن جبار کی طرف کھڑی تھیں۔ اس لمحے فردوس گوہر پر تنہائی کا قریب وارد ہوا تھا جس نے اس کے قدم تک اکھاڑ پھینکے تھے۔

''تم کر چکی ہو یہ۔''

''اپنی آنکھوں پر اعتبار کر رہی ہو عدن؟''

اسٹوڈنٹس نے متوجہ ہونا شروع کر دیا تھا۔ اسکرپٹ تھامے مکالمے پریکٹس کرتی شازمہ رک گئی تھی۔ طلحہ جو کیمرا تھامے لانگ شارٹ لے رہا تھا وہ بھی ٹھٹک گیا تھا۔ وہ بہترین دوستوں کی لڑائی تھی جو اس سے پہلے گزرے سالوں میں سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہی تھیں مگر آج کوئی الگ کہانی تھی۔

''میں نے خود تمہیں دیکھا ہے فردوس۔ تم رو رہی تھیں اور وہ تمہیں چپ کروا رہا تھا میں نے اس وقت اسے کالز کیں مگر میری آنکھوں کے سامنے اس نے کالز کاٹ دیں۔ وہ تمہاری طرف متوجہ تھا۔ وہ میری برتھ ڈے تک بھول گیا۔''

آسمان کا نیلا رنگ ہلکے سرمئی رنگ میں بدلتا رہا۔ لاہور کے موسم کا بھی اعتبار نہیں تھا پل میں اپنا چولا بدل لیتا تھا۔ ہواؤں میں ٹھنڈک در آئی تھی۔

''اپنے دل کی سنو، وہ تمہیں کیا کہتا ہے؟ میں سب کچھ ہو سکتی ہوں عدن، مگر میں اللہ کی قسم سچ کہتی ہوں۔ میں خائن نہیں ہوں۔''

کچھ سچ اتنے مہلک ہوتے ہیں کہ انسان کے جسم اور روح کو مردہ کر دیتے ہیں وہ بھی ایسا ہی سچ تھا سامنے آتا تو بہت کچھ مر جاتا۔ سب سے پہلے فردوس گوہر، پھر دوستی، پھر رشتے اور بس۔

بارش کی پہلی بوند فردوس گوہر کے لمبے سیاہ بالوں میں گم ہوئی۔ وہ اسٹیچو بنی کھڑی رہی۔

''کنیز فاطمہ! تم عدن کو سمجھاؤ، میں ایسی نہیں ہوں۔ میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں خلیل بے شک اچھا لڑکا ہے، اچھا دوست ہے مگر وہ صرف دوست ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ تمکین، تمہیں تو سب خبر ہے ناں تم تو مجھے جانتی ہو ناں۔''

عدن نے زور سے اس کا بازو جھٹکا تھا۔ درد کی ٹیس بازو سے ہوتی ہوئی دل تک پہنچ گئی تھی۔

''تم مان لو کہ تم شروع سے ہی ایسی ہو فردوس۔ تم جیسی لڑکیاں صرف یونیورسٹی میں دوسروں کے منگیتر پھانسنے آتی ہیں جنہیں اپنی فیملی ویلیو نہیں دیتی تو وہ توجہ کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ کچھ بھی۔''

لفظ تیر تھے نشانہ دل تھا، عدن جبار نشانے کی پکی تھی۔ فردوس گوہر شکار ہو گئی تھی۔

وہ ڈپارٹمنٹ سے لڑتے ہوئے باہر یونیورسٹی کے روڈ پر آ گئی تھیں۔ جسے پنجاب یونیورسٹی کا جنت روڈ کہا جاتا تھا مگر آج وہ دوزخ ہو گیا تھا۔ آگ تھی، شعلے تھے فردوس سڑ رہی تھی۔

''میرا یقین کرو عدن۔''

وہ رکی تھی اور اس بار اس نے تھپڑ فردوس کے چہرے پر جڑ دیا تھا۔

آسمان گہرا سیاہ ہو گیا۔ بجلیوں کی کڑکن شروع ہوئی تھی۔ کنیز فاطمہ اور تمکین جامد تھیں، فردوس بے تحاشا رو رہی تھی۔

آس پاس گزرتے اسٹوڈنٹس رکنے لگے تھے، موسم بدلا تھا تو ہاسٹل کی لڑکیاں لڑکے چھتریاں اٹھائے آ گئے تھے۔ انسان بدلا تھا تو کوئی مہربان چھتری نہیں تھی کہ انسان اوڑھ لے۔ زبان کے زہر نے نیلا کر دیا تھا۔

''دوست کیسے ہو سکتی ہو۔ تم نے مجھ سے خلیل کو چھینا ہے فردوس، اللہ کرے تم مر جاؤ۔''

عدن جبار غائب دماغ ہو رہی تھی اسے سب رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں پر یقین کر رہی تھی، آنکھیں فریب دکھاتی ہیں۔ وہ دل کو کنارے کر چکی تھی۔

وہ تینوں آگے آگے تھیں اور فردوس گوہر پیچھے پیچھے یہاں تک کہ وہ مین روڈ پر نکل آئی تھیں۔

''وہیں رک جاؤ فردوس! تم اور میرے پیچھے آئیں تو میں اسی ٹریفک کے آگے جان دے دوں گی۔ میں نفرت کرتی ہوں تم سے، سخت نفرت۔ آخ تھو۔ تم نے مجھ سے کوئی چیز مانگ لی ہوتی مگر خلیل.....!''

عدن جبار کانپ رہی تھی وہ دونوں اسے سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

آسمان کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں اور بارش کی بوچھاڑ نے سب کچھ جل تھل کر کے رکھ دیا تھا۔

فردوس گوہر نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ وہ شکوہ کناں سی نظر۔ بے وقعت ہارے ہوئے قافلوں کی مانند وہ واپس پگلٹی تھی چھاجوں چھاج برستی بارش میں وہ یونیورسٹی کے روڈ ناپتی رہی۔ جامعہ مسجد کے سامنے روش پر ٹہلتی رہی۔ سکون گم ہو گیا تھا جیسے کسی بچے کا گرد میں سکہ گم ہو جایا کرتا ہے۔

ایک گھنٹہ وہ بوٹینیکل گارڈن میں ٹہلتی رہی جہاں کسی بھی طالب علم کا داخلہ ممنوع تھا۔ کسی نے

اسے بتایا تھا اندھیرا چھاتے ہی بوٹینیکل گارڈن میں اونچے درختوں سے چمگادڑیں لٹکتی ہیں وہ سر اٹھا کر دیکھتی رہی۔

شام ہوگئی تھی بیگ میں رکھا موبائل ہلکی ہلکی آواز میں بج رہا تھا۔ وہ پتھروں کی روش پر اکڑوں بیٹھ گئی تھی۔

''پیراسائیٹ۔''

ایک پھیکی سی ہنسی، ارزانی کا گماں.....

ساری زندگی وہ اس وجہ سے خوش تھی کہ اس نے اپنے دوستوں کی صورت حاصل پالیا ہے مگر سب سراب تھا۔

عدن جبار نے اس کے سر پر آسمان گرایا تھا۔ کاش کنیز فاطمہ اور تمکین اس کی مدد کو آجاتیں۔ موبائل کی گھنٹیاں تیز ہوتی گئیں۔ وہ بیگ سے موبائل نکال رہی تھی۔

اسکرین پر ایک نام جگمگا رہا تھا۔

''خلیل کالنگ۔''

بارش تھمنے کے بعد ہواؤں کا شور بڑھ گیا تھا۔ شور بڑھ جائے تو ساری آوازیں نگل جاتا ہے مگر ایک آواز ہر شے پر حاوی تھی۔

''مجھے سخت نفرت ہے تم سے، خائن ہو تم۔'' وہ سسک رہی تھی تڑپ رہی تھی۔ مالی نے اسے روتے دیکھا۔ وہاں کئی لڑکیاں آیا کرتی تھیں کونے میں بیٹھ کر گھنٹوں روتی تھیں مگر وہ ان جیسی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ انتہائی حسین لڑکی تھی جیسے کوئی مکمل نظر آتا ہو، کامل ہو مگر اندر کا کھوٹ صرف اسے ہی پتا ہو کہ دنیا صرف ظاہر دیکھتی ہے۔

وہ کال ریسیو کر چکی تھی آواز کی نمی نے سارے موسم کی نمی کو مات دے دی تھی۔

''خلیل! اس نے مجھے خائن کہا۔ پیراسائیٹ کہا کہ میں دوستوں کی امانتوں میں خیانت کرنے والوں میں سے ہوں۔ کیا میں ایسی ہوں؟''

خلیل کو دھکا لگا تھا وہ کل سے عدن جبار کی مسلسل کالز جنہیں وہ کسی وجہ سے سن نہیں سکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے معاملے میں کتنی پوزیسیو تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں گوہر؟''

پوری دنیا میں ایک وہی ایسا شخص تھا جو اسے گوہر کہہ کر بلایا کرتا تھا اور وہ اس بات پر صدیوں خوش رہ سکتی تھی مگر لمحوں کی خطا نے ہمیشہ صدیوں کے درد دیے ہیں، ہائے۔

''میں ٹھیک ہوں۔ بس میرا دم گھٹ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کسی نے دل کی جگہ پر پاؤں رکھ دیا ہے۔ خلیل، ایک وعدہ کرو کہ تم کبھی اسے سچ نہیں بتاؤ گے میں نہیں چاہتی وہ اپنی بقیہ زندگی کسی گلٹ کے ساتھ گزارے اور رہی میری بات تو ہم جیسے لوگوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ یہ تخلیق کا دکھ ہے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔''

وہ سنبھل گئی تھی کچھ ہی دیر بعد وہ یونیورسٹی کے مین گیٹ کی طرف آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جا رہی تھی سڑک سیدھی تھی اور کناروں کے ساتھ لگے ہار سنگھار کے درخت بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا گوہر، تم پریشان مت ہونا پلیز!''

وہ ہنسی تھی خلیل تھرا گیا تھا۔ سڑکیں بارش میں دھل سی گئی تھیں۔

عجیب وقت کے پھیر میں اسے سیرت امتیاز یاد آئی تھی۔

''پنجاب یونیورسٹی میں تو ہر ہفتے بارشیں ضروری ہیں کہ یہاں کے درختوں کی دھلائی کی ضرورت رہتی ہے۔''

خلیل نے اسے غائب دماغی کی کیفیت میں پایا تھا۔

''تم کہاں ہو؟ میں لینے آجاؤں گا۔ گاڑی ہے کیا تمہارے پاس؟''

وہ ٹھٹکی تھی گاڑی تو تھی اس کے پاس اور ڈپارٹمنٹ کے پارکنگ ایریا میں کھڑی کی تھی۔ سامنے طویل سفر تھا جو کہ وہ طے کر کے آئی تھی، تھکن نے پیروں کے انگوٹھوں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ وہ خاموشی سے مڑ کر دوبارہ واپسی کے سفر کو چل دی تھی۔ گاڑی ڈپارٹمنٹ میں تھی تو پھر وہ کیوں پیدل بھر

رہی تھی؟ ٹھنڈی سانس لے کر فردوس گوہر نے ایک سرگوشی خلیل کی سماعتوں کے گوش گزار کی تھی۔

''سنو میں نے زندگی میں دو لوگوں سے شدید محبت کی ہے۔ خلیل سے، یعنی کہ تم سے اور عدن جبار سے یعنی کہ اس سے جس سے تم محبت کرتے ہو مگر.....''

''مگر کیا؟'' ادھر سانس ادھڑنے لگی تھی۔

''اس سب کے باوجود میں ایک پیرا سائیٹ وں جو ایک کیڑا ہوتا ہے جو دوسروں کی محبت پر زندہ رہتا ہے اور بس۔''

فردوس گوہر نے موبائل پنجاب یونیورسٹی کے زرعی رقبے کی طرف اچھال دیا تھا جہاں دھان کے کھیتوں میں سٹہ لگ چکا تھا۔

''پنجاب یونیورسٹی کے در و دیوار نے شعبہ ابلاغیات کی اس اپسرا کو بالکل مطمئن چہرے کے ساتھ سڑکوں پر سکون سے راستوں پر سفر کرتے دیکھا تھا۔ جیسے سب ختم ہو جانے کے بعد کا اطمینان حاصل کر لیا گیا ہو.....''

☆.....☆.....☆

دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ جانے کون تھا جس کو چین ہی نہیں پڑتا تھا۔ وہی روشن دانوں والا گھر تھا۔ جہاں کبوتر غٹرغوں کرتے تھے۔ جہاں برآمدے میں اگر کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گھر جس کے مکینوں سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی سب ہی کچھ ہی تھے۔ رہا رش برس برس کر تھک چکی تھی۔

چند آوارہ کتے گلیوں میں بھاگ رہے تھے۔ اس علاقے کی شاید بجلی جا چکی تھی۔

فردوس گوہر نے ایک بار پھر وہ دروازہ بجایا تھا۔ اندر سے کچھ قہقہوں کی آوازیں آتی رہیں۔

''ارے بالڑیو..... کوئی دروازے پر ہے جا کر دیکھو۔''

چند بھاگتے دوڑتے قدموں نے کھٹ سے دروازہ کھولا تھا۔ لالٹین تھامے اس نے اندھیرے میں کھڑی فردوس کو غور سے دیکھا تھا اور چیخی تھی۔ کتنی مسرت تھی اس چیخ میں۔

''ریشمی! فردوس آئی ہے۔''

برآمدے میں بیٹھی ریشمی ہولے سے مسکرادی تھی۔

''تم چاہے ہم پر اپنے دروازے بند کردو گوہر، اس گھر کے دروازے تم پر کبھی بند نہیں ہوں گے۔''

وہ اندر داخل ہوگئی تھی۔ لمبے سے دوپٹے سے خود کو ڈھانپے وہ ریشمی کے گلے آن لگی تھی۔

سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ افسردہ۔ مکمل۔ اور ادھورا بھی.....!

شام کی لالی میں ہے ایسا فسوں

جیسے روز حشر ہو اور بست ہو الا

❁ ❁

منشا محسن علی کا ناول لا کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

نایاب جیلانی کا بہت خوبصورت نیا ناول

سلسبیل

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جارہا ہے

نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

سحر ساجد کا بہت خوبصورت نیا ناول

میرا بخت

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جارہا ہے

نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

باب شانزدہم

آخری قسط نمبر 16

اک گھات میں بیٹھی ہوئی شامل اجل
اور ازل کی چھاپ سے ہر فرد ہوا لا
کیا نام تیرا نقش تھا سر روح اور
پھر روں کا میں صاح فرد ہوا لا
خود گم مدار عشق میں ہم ہو گئے
ایسے فنا کہ ہر بقا کا درد ہوا لا

یہ زندگی کی کہانی تھی۔ زندگی جس کے جانے کتنے ہی پس پردہ چہرے ہوتے ہیں۔ خواب ہوتے ہیں جو تعبیر پا بھی لیں تو کہیں کسی خانے سے کسک کا دھواں اٹھتا ہی رہتا ہے۔ یہ کہانی بھی بھی انہی خوابوں کی تھی جو پورے رہ کر بھی کہیں ادھورے ہی رہے۔ وہی ازل کا قصہ ہے۔ حاصل اور لا حاصل۔ دور سے دیکھیں تو آنکھیں چندھا جائیں اور جب پاس ہوں تو آنکھیں ہی رہ جاتی ہیں۔ سب فنا ہے۔ فنا کہوں تو لا..... اور لا کہوں تو ہم۔ یعنی

کہ میں۔ یعنی کہ تم..... اور بس.....!

☆.....☆.....☆

پروفیسر کنیز فاطمہ نے اپنے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی کھڑکیوں کے پار کھڑے درختوں کے جھنڈ پر کچھ سرسبز کونپلوں کو نمودار ہوتا دیکھ لیا تھا۔

''تو پھر زندگی کی ایک اور بہار آنے کو ہے۔ جو شاید اس برس بھی پچھلی کئی بہاروں کی طرح چپ چاپ گزر جائے گی چند بہار کے تہواروں کے بیچ۔''

وہ اب اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ کہاں اس کا کمرا تھا وہ ڈپارٹمنٹ کی پشت کی طرف تھا اور اس کمرے کی دونوں کھڑکیاں پچھلی طرف درختوں کے جھنڈ کی طرف ہی کھلتی تھیں اور وہ اکثر گلہریوں کو ٹونگتے، کودتے پھاندتے دیکھتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی طویل سی آہ نکل جاتی تھی۔ اس کمرے کا ماحول کئی سالوں سے ایسے ہی تھا بس کبھی کبھار کمرے کے دروازے سے اس کے فیورٹ اسٹوڈنٹس کے چہرے نظر آتے تھے جو اس کے شیدائی تھے وہ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی اب تک کی سب سے کم عمر پروفیسر تھی۔ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ کا بھرم رکھے ہوئے وہ کامیاب تصور کی جاتی تھی۔

''مس کنیز! آپ ہمیشہ مسکراتی رہتی ہیں۔''

وہ بورڈ مار کر روک کر کچھ پل کو ٹھٹک سی جاتی تھی۔

''شاید کہ کسی روز یہ نقاب چاک کرے اور پھر دیکھے کہ یہ زخم تو رفو ہونے کے بھی نہیں ہیں۔''

وہ سب اس کے پرستار تھے۔ وہ بولتی تھی تو ان کو ہمہ تن گوش پاتی تھی۔ لڑکیاں بہت بولڈ اور بلنٹ تھیں ایسے موضوعات پر بھی بحث چھیڑ لیتی تھیں جس کا تعلق تعلیم سے تو قطعاً بھی نہیں ہوتا تھا۔

مس ڈیزی نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ آخری دنوں میں ان کے تقریباً سارے تجربات کامیاب رہے تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ والے دن روسٹرم پر کھڑے ہو کر انہوں نے سامنے بیٹھے حاضرین کو دیکھ کر کیا خوب صورت بات کی تھی۔

''اب جب زندگی میں کسی کامیابی، میڈل کی چنداں ضرورت نہیں رہی ہے تو زندگی سب کچھ لے کر منتظر کھڑی ہے مگر اب تو آتش بجھ چکا۔ اب تو ضرورت نہیں رہی۔''

ہجوم سے کسی شرارتی اسٹوڈنٹ نے آواز لگائی تھی۔

''میم ڈیزی! تو کیا آپ اب میڈل لینے سے انکار کر دیں گی؟''

تب وہ اپنی سلک کی ساڑھی کے پلو سے آنسو پوچھتے ہوئے ہنس دی تھیں۔

''میڈل کسے برے لگتے ہیں۔ کارنس پر سجا کر رکھوں گی کہ کم از کم میرے نواسے اپنی نانی سے کامیابی کی کچھ سچی کہانیاں تو سن لیں گے۔''

بس یہی کہہ کر وہ اتنے برس کی اپنی شخصیت کی جھٹک چھوڑ گئی تھیں۔ ایسے ہی تو ہوتا ہے۔ سب کہتے ہیں وقت گزر جاتا ہے۔ مگر سچ یہی ہے کہ انسان گزر جاتے ہیں۔

پروفیسر کنیز فاطمہ بھی گھنٹوں محلول کی بو میں بسی ہوئی لیب میں گھسی رہتی تھی۔ کبھی کبھار موبائل بیپ بیپ کرتا تو سامنے بختاور کے بیٹے ہادی کی وڈیو موجود ہوئی تھی۔

جو پاؤں پاؤں چلنا شروع ہو چکا تھا۔ وہ لگاتار کئی گھنٹوں تک وہ ویڈیوز دیکھتی رہتی تھی۔

''ہادی تو اب بہت بڑا ہو گیا ہے۔ اس بار آؤں گی تو اس کے لیے الیکٹرونک کار لے کر آؤں گی۔''

بختاور نے اس کی بات کے جواب میں جیسے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''رہنے دو کنیزاں۔ پہلے بھی تم نے گھر بھر دیا ہے۔''

''خالہ ہوں میں اور میرا فرض بنتا ہے۔''

اکثر وہ اور بختاور باتیں کرتی رہتی تھیں۔ بختاور کی بھی اپنی مصروفیات تھیں۔ اماں ابا اب بھی زمانے کی باتوں میں تھے۔ وہ بھی کیا کہتے کہ بیٹیوں کی چیزوں کے پیوند زمانہ کبھی رفو ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔

صرف رشتہ ہونا یا نہ ہونا کبھی انسان کی ذات کو سوالیہ نشان بنا دیتا ہے۔ وہ بھی سوال کی صورت مس ڈیزی کی طرف آجاتی تھی۔

''میم! دیکھیں تو میرا ایک انکار مجھے کہاں لے آیا ہے اتنی دور کہ واپسی کے راستے بھی دھندلے ہیں۔''

''کنیز! یہ تمہارا بنایا ہوا پل ہے، اس پر صرف تم ہی قدم رکھ سکتی ہو۔ باقی سب کے لیے اس پر چلنے میں جھول ہے۔ خوف ہے کہ چل پڑے تو گر پڑیں گے۔''

سیاہ لمبے بالوں کی چوٹی کمر سے ڈھلک گئی تھی۔

''اماں ابا اب بھی جیسے اس لمحے کی تلاش میں ہیں کہ کب میں گر پڑوں تو اٹھانے کو کوئی آس پاس نہ ہو اور تب وہ یہ کہہ سکیں کہ دیکھا نافرمانی کی کیا سزا ملی۔ کیا کسی انسان کے رشتے کو ہاں یا ناں کہنا ہی مجھے مکمل یا نامکمل کر سکتا ہے۔ وہ خود شخص اپنی زندگی میں کتنا آگے بڑھ گیا ہے یہ کوئی نہیں دیکھے گا۔ مگر میرے لیے سب وہی پرانا قصہ تازہ ہوتا رہے گا۔''

وہ آہستہ آہستہ جیسے غائب دماغ ہوتی جا رہی تھی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے کھڑکیوں کے پار دیکھتی رہتی تھی۔ کئی چنچل لڑکیاں سوال لے کر آجاتی تھیں۔

''آپ ہماری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟''

تب وہ جیسے کورے کاغذ پر نب چبھو دیتی تھی۔ سیاہی پھیل جاتی تھی۔

''تمہارا رستہ ہوگا تو تمہاری ہی منزل ہوگی مگر اس سفر میں کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ سب تمہیں گلٹ کی موت ماریں گے۔ گلٹ کے کوڑے کی سنسناہٹ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔''

وہ اپنا لیدر بیگ شانوں پر ڈالے جب ٹھنڈی گیلری میں گھوم رہی ہوتی تھی تو بت سی نظریں اس کی طرف اٹھتی تھیں۔ سپید پاؤں جو دو پٹی والی چپل میں مقید ہوتے تھے۔ کالے بالوں کی لمبی چوٹی کمر پر جھول رہی ہوتی تھی۔ وہ سیدھ میں چلتی تھی۔

عدن کبھی کبھار آجاتی تھی تو وہ دونوں سیرت کو یاد کرتی تھیں۔

''وقت نے ہم سے ہمارا ایک قیمتی دوست ٹھگ لیا۔''

''وقت کسی کا وفادار نہیں ہوتا۔ اسے سب چھیننا آتا ہے۔ دوست، رشتے اور غرور۔''

عدن نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھامتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''غرور بھی؟''

''ہاں تمہارے سامنے ہوں میں۔ جو اپنی ذات کا غرور لیے پھرا کرتی تھی کسی پرانے وقت میں اور آج دیکھو تہی دست ہوں ہاتھ خالی ہیں۔''

''پچھتا رہی ہو کیا؟''

''بس اماں کی یاد آتی رہتی ہے۔''

چائے میں آنسو گھل جاتے تھے۔ دروازے سے پریکٹیکل کے طلباء جھانک کر اجازت لیتے تھے۔ اور عدن اس تھل واسی اپسرا کو دیکھے جاتی تھی جو اپنے سامنے بیٹھے طلباء کو دھیان سے سب سمجھا رہی ہوتی تھی۔ کیمیا کے کئی فارمولے جنہیں وہ انگلیوں کی پوروں پر حل کر کے سامنے بیٹھنے والوں کو حیران کر دیا کرتی تھی۔ تو یہ تھا اس کا حاصل جو کہ لاحاصل بنا دیا گیا تھا۔

''میم! آپ کبھی بھی ہمیں چھوڑ کر مت جایئے گا۔''

''نہیں جاؤں گی۔''

عدن اسے دیکھے جاتی تھی۔ جو عدن کا لایا ہوا کیک اپنے اسٹوڈنٹس کو سرو کر رہی ہوتی تھی۔ اس کے ریسرچ آرٹیکل بہت سے مشہور جریدے چھاپ رہے تھے۔ اور بہت سے اسکالرشپ بھی آفر ہو رہے تھے۔

عدن کی طرف وہ متوجہ ہوئی تھی۔

''سوری! تمہیں اتنا انتظار کرنا پڑا۔ بس روز کی یہی روٹین ہے۔''

''کوئی بات نہیں تمہیں یوں مصروف دیکھ کر مجھے اچھا لگتا ہے کہ تم زندگی میں کچھ کر رہی ہو اور تمہارے اسٹوڈنٹس تمہیں آئیڈیل مانتے ہیں۔''

ٹشو سے کیک کا پیس منہ میں رکھتی ہوئی جیسے وہ ہنس پڑی تھی۔

''واقعی انسان بھی ضرورت کے ہر بازار میں الگ الگ بھاؤ کے عوض بکتا ہے۔ یہاں آئیڈیل ہوں اور وہاں کچھ بھی نہیں۔''

وہ دونوں پھر آفیسر کالونی کی طرف نکل آتی تھیں۔ جہاں گل مہر تھے۔ جن کے سائے تلے وہ دکھ سکھ کر لیتی تھیں۔

''خلیل کیسا ہے؟''

''پتا نہیں۔ میں نے رابطہ ختم کر دیا ہے۔'' عدن نے ایک درخت کی ڈال کو توڑا تھا۔

''ہمیں لگتا ہے ہم اگلے انسان کو سزا دے رہے ہوتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا ہم خود جل رہے

ہوتے ہیں۔"

گل مہر کے پھولوں کو ٹٹولتے پرندے اس بات پر سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگتے تھے۔ کیونکہ وہ جان گئے تھے۔"اس کائنات میں انسان سے بڑھ کر کوئی تماش بین نہیں ہوتے۔"

☆.....☆.....☆

تمکین جمال جو تمام عمر بادیان کے پھول کے خوف میں مبتلا رہی تھی، اب اسی کی باسی سے ماری گئی تھی۔ وہ جیسے دل پر ہاتھ رکھے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ ساری زندگی مسالے پیسنے والی کے وجود میں بھی جیسے خون کی جگہ سونف، الائچی اور جائفل کی بساند آتی تھی۔ اسے یہی کہہ کر اس رشتے میں باندھا گیا تھا کہ ارسلان مکرم کا اپنا کاروبار ہے اور وہ یہی سوچ کر ہاں کر بیٹھی تھی کہ اب زندگی میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسے کہانیوں میں ہوتا ہے کہ سب اچھا اچھا ہونے لگتا ہے۔ وہ شادی کے پہلے دن دلہن بنی عطر کی شیشی الٹ کر آئی تھی کہ کہیں کوئی جائفل کی بو کا راز نہ پالے۔ مگر اس برآمدے میں بیٹھی بوڑھیوں نے بچوں کو لتاڑا تھا۔

"آئے ہائے، آج کل کے یہ بچے۔ کسی نے خوشبو کی شیشی پھوڑ ڈالی ہے نتھنوں میں گھسی جاتی ہے مہک۔"

کوئی بھی اس راز کو نہ پا سکا تھا کہ عطر کی منبع تمکین جمال تھی۔

کبھی وہ ابا سے ان کے بیوپار کی شکایت نہیں کر پائی تھی کہ ابا اب تھکن ہونے لگی ہے مسالے پیستے پیستے۔ نیند بھٹک جاتی ہے۔ مذاق اڑایا جاتا ہے۔

"تمکین گرم مسالے والی۔"

وہ یہی سن سن کر بڑی ہوئی تھی۔ ذہن میں کہیں خوف بیٹھ گیا تھا۔

لڑکیاں بھی خوابوں کو دل پر کاڑھ لیتی ہیں کہ زندگی کے اگلے سفر میں ہمراہی کیسا ہوگا۔ کیسی آن بان کا مالک ہوگا۔ وہ بھی آنکھیں میچ کر اک سپنا کاڑھ لیتی تھی۔

"اونچے قد کاٹھ کا ہوگا اور عود کی خوشبو سے مہکتا ہوگا۔"

اصل زندگی تو یہ تھی جہاں حاصل بھی لاحاصل سا نظر آتا تھا۔ وہ بھی دہائی دیتے کنیزاں کی طرف لپکی تھی۔

''دیکھو کنیزاں۔ کیسا تماشا پڑا ہے منہ پر۔ زنا ٹے دار..... میں کیا کروں؟''

لاہور میں پروفیسر کالونی کے ایک چھوٹے سے گھر میں کھولتے پانی میں پتی کھولتی ہوئی کنیزاں فاطمہ نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

''دیکھا، میں نہ کہتی تھی کہ سوچ لینے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ تم نے سوچا تو ملا نہیں، جو ملا ہے اب اس پر سوچ لو۔ راستے بند مت کرو۔ بادیان کے پھولوں کو کسی حبس بھری دوپہر میں تکیے تلے رکھ کر سو جاؤ۔''

تمکین جمال نے اس کے دماغ چل جانے کا سوچ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

''جب سے پڑھانے لگی ہے اس کا تو دماغ چل ول گیا ہے۔''

جلے پیر کی بلی کی طرح کئی چکر کاٹنے کے بعد عدن کی باری آئی تھی تو وہ اس کے سامنے ہچکیوں سمیت روئی تھی۔ عدن نے پیانو روک کر اس کی سسکیاں سنیں اور مطلع صاف ہونے کے بعد فرمایا تھا۔

''تمہیں ارسلان سے محبت ہے؟'' عدن کا سوال جیسے ایک الارم تھا۔ ایسا بجا کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ پائی تھی کہ وہ شخص آہستہ آہستہ حواس قابو میں کرنے لگا تھا جادوگر کہیں کا۔

''ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔''

''تمہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کیا؟''

''یقین ہے۔''

''تو اس کا مطلب ارینج میرج اب ارینج نہیں رہی ہے۔''

عدن اس کے گرد سوچ کی دیوار کھڑی کر گئی تھی۔ وہ کھڑکی میں پھر سے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جہاں سے ارسلان ملازموں کے ساتھ مسالوں کی بوریاں اتروا تا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سفید کڑکڑاتے ہوئے لباس میں ملبوس وہ شخص جیسے بہت جلد دل میں گھر کر گیا تھا۔

وہ اس لمبے برآمدے والے گھر میں پلروں کے ساتھ گھومتی رہی تھی۔ نند نگہت کو بات سے بات نکالنے کی عادت تھی۔

''ابا کے جانے کے بعد بھیا کو کاروبار سنبھالنا پڑ گیا تھا۔ ورنہ بھیا کو تو بالکل بھی پسند نہیں تھا کہ مسالوں کا کاروبار کرتے۔ بہت ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب کوئی چارہ نہ رہا تو دکان پر بیٹھ گئے اور پھر ایسی برکت ہوئی کاروبار میں کہ اب کاروبار ہی بڑھا لیا ہے۔ جدید مسالے پیسنے والی مشینیں لگائی ہوئی ہیں۔ سارے پاکستان کے علاوہ باقی ملکوں میں بھی بھیجتے ہیں۔''

تمکین وہیں سیڑھیوں پر بیٹھی رہ گئی تھی۔ جب رات ہو گئی تو دودھ کا گلاس اسے تھمانے کے بعد سامنے بیٹھ گئی تھی۔

''آپ کو یہ کام اچھا لگتا ہے؟''

''مجھے حلال رزق کمانا اچھا لگتا ہے۔'' وہ دودھ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔

وہ جیسے کسی سناٹے میں آ گئی تھی۔ اتنے سالوں میں یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اصل کیا ہوتا ہے۔ نقل کسے کہتے ہیں۔ اہم کسے کہتے ہیں اور غیر اہم کیا ہوتا ہے۔

رات کو کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول کر وہ تکیے تلے تین بادیان کے پھول رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ چاند بادیان کے پھولوں سے مہکتے ہوئے اس کمرے کو دیکھنے ذرا کھڑکی میں جھانکنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

سیکھا ہے جینا زندگی نے ہجر سے
پھر جیا ایسے کہ ہر ضبط ہوا لا
راہ فرار نہیں ہے تیرے عشق سے
مبتلا ہوں پیار میں کہ نفس ہوا لا
ہے جنوں افلاک میں تیرے حسن سے
اس جنوں کے دم سے لمحہ ابد ہوا لا

فردوس گوہر کو جب لگا کہ اب سب کچھ فنا ہو جائے گا کہ وہ جو ذات کا نقاب ہوتا ہے وہ اتر چکا ہے تو وہیں جیسے اماوس میں کوئی چاند ابھر آیا تھا۔ وہ جیسے وہاں سے جانے لگی تھی۔ سب ٹوٹ گیا تھا کبھی

نہ جڑنے کے لیے۔

امل نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا اور سجی سنوری فردوس گوہر کو جس کی آنکھوں کا آئی شیڈ دور سے چمکتا تھا۔ان آنکھوں کے جھالر پانی پانی تھے۔

"رکو گوہر۔"

وہ کسی اسٹیچو کی طرح فریز ہوئی تھی مگر اب کی بار وہ مڑی نہیں تھی۔

نتاشا نے خود کو زمین میں زندہ دفن ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔موسیٰ نے اپنی اوقات دکھائی تھی۔وہ جو قطب نما تھی جس کا کام رستہ دکھانا تھا وہ خود راہ سے بھٹک گئی تھی۔موسیٰ کے وائس میسج نے اسے زندہ درگور کر دیا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم جیسی لڑکی میری چوائس ہو گی؟ بھول ہے تمہاری۔جتنا تمہیں وقت دے چکا ہوں اسے میری طرف سے خیرات سمجھنا آخر تم ہو ہی کیا لاہور کے ایک تنگ و تاریک محلے کی عام سی لڑکی جو کوئی امیر شکار پھانسنے کو تیار رہتی ہے۔میں تم جیسیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔تمہارے نزدیک آنے کی وجہ صرف فردوس گوہر تھی۔افسوس کہ سمجھ نہیں آ رہا اسے کس نام سے بلاؤں، ویسے تو کئی نام ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے..... پوری ڈکشنری ہے۔" آخر میں آگ لگاتا ہوا قہقہہ تھا۔

نتاشا ابراہیم کو لگا تھا جیسے وہ شخص اس کے اپنے کردار کو چورا ہے پر بدنام کر گیا ہو۔تکلیف نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔چند سال پہلے کا لکڑی اور شیشے کے اس گھر میں ہونے والا عہد آج ٹوٹ گیا تھا۔

"وہ ایک مکمل انسان نہیں ہے۔وہ ایک ایسی شخصیت کی مالک ہے جسے دنیا تیسری جنس کے نام سے جانتی ہے مگر وہ ہمارا خون ہے۔اولاد ہے۔اور خون کو تو اپنایا جاتا ہے کوڑے کے حوالے نہیں کیا جاتا۔بس ہم چاہتے ہیں کہ وہ دنیا میں اپنی ایک پہچان بنا کر سکون سے جی سکے۔تم اسے دنیا کا سامنا کرنا سکھا دو بس۔"

پہلی ملاقات میں ہی فردوس گوہر کے بے پناہ حسن اور آنکھوں میں ہلکورے لیتے خوف نے اسے متاثر کیا تھا۔وہ نتاشا ابراہیم کو دیکھ کر جیتی تھی۔نتاشا ابراہیم اس کی کھڑکی تھی جو دنیا کی طرف،

انسانوں کی طرف کھلتی تھی۔

مگر آج وہ کھڑکی جہنم کی طرف کھل گئی تھی۔جس نے فردوس گوہر کو برباد کر دیا تھا۔

وہ امل کی پکار پر رک گئی تھی۔آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر پیر کے انگوٹھے پر گر رہے تھے۔اتنے سالوں سے سب کچھ سلیٹ کی مانند صاف ہو گیا تھا۔سامنے بس ایک ہی ننگی اور عریاں حقیقت منہ چڑا رہی تھی۔

تیسری جنس۔تیسری جنس۔تالی.....اشارے.....قہقہے.....زنخا.....مخنث.....

بہت سے نام تھے۔بہت سے چہرے تھے.....

رپورٹر دوڑ کر وہیں آ گئے تھے۔کیمرا مین بھاگ رہے تھے۔آڈیو والے آڈیو ٹیسٹ کر رہے تھے۔روشنیوں میں وہ نہا گئی تھی۔

ورجینیا وولف کی کتاب کی ورق گردانی کرتی پروفیسر کنیز فاطمہ کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گئی تھی۔سامنے ٹی وی اسکرین پر وہ فردوست گوہر ہی تھی۔چہرے پر موت تھی۔آنکھوں میں خوف تھی۔رپورٹرز سوالوں پر سوال کر رہے تھے۔

''فردوس گوہر! آپ کی حقیقت دنیا جاننا چاہتی ہے۔کون ہیں آپ؟ آپ کو کب پتا چلا کہ آپ ایک لڑکی نہیں ہیں؟''

وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر خود کو بچا رہی تھی۔اس کے صرف دو ہاتھ تھے۔دنیا کے سو ہاتھ تھے۔وہ تنہا کھڑی تھی۔

عدن جبار ٹریفک کے رش میں پھنسی ہوئی تھی جب اس کے فون پر کنیز کا ٹیکسٹ آیا تھا۔

''عدن! اللہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' سڑک پر گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے۔

تمکین جمال گلدان کے سیاہ پھولوں کو بدل رہی تھی۔جب اس کی توجہ ایک چینل کی بریکنگ نیوز کی طرف مبذول ہوئی تھی۔

''پاکستان کے سب سے بڑے فیشن شو میں امل جی برانڈ کی ماڈل ایک ٹرانس جینڈر نکلی۔ذرائع

کے مطابق امل جی کو خود بھی اس سچ کا علم نہیں تھا۔ تفصیلات کے مطابق امل جی کی کولیکشن کافی عرصے سے زیر بحث تھی اور فیشن لوور اس کلیکشن کے منتظر تھے مگر اب لگتا ہے کہ امل جی برانڈ اب دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو پائے گا۔"

مردہ سیاہ پھول تمکین کے پیروں میں جا پڑے۔ زندگی میں آج پہلی بار تمکین جمال کو علم ہوا تھا کہ جائفل جاوتری سے کہیں زیادہ اپنی بونا قابل برداشت ہوئی ہے۔ آج وہ خود جیسے کسی غلیظ پھوڑے کی مانند بہہ نکلی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھتی گئی تھی۔

ان تینوں کے ذہن کی سلیٹ پر وہ منظر آج بھی تازہ تھا۔

برستا ہوا آسمان۔ ہاتھ جوڑے سچ کی دہائی طلب کرتی ہوئی فردس۔ اور اسے جھٹکتے ہوئے وہ تینوں! کتنے نیلے لفظ تھے جنہوں نے گوہر کی روح کو ڈسا ہوگا۔

"تم دوست نہیں خائن ہو۔ محبتیں چوری کرنے والی۔"

انسان ہمیشہ کسی نہ کسی سچ کے آگے ہمیشہ اندھا ہی رہتا ہے۔ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہوئے۔ مگر یہ سچ کا ترازو جب کام کرتا ہے تو انسان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آتا۔

☆.....☆.....☆

روشنی کے دائروں کو چیرتی ہوئی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ کیمرا مین رپورٹرز سب اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ڈری سہمی فردوس گوہر کے گرد جیسے ساون کی برکھا میں کوئی چھاتا لیے آ گیا تھا۔

وہ ریشمی تھی جو بالڑیوں کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ وہ جھرمٹ ڈلے فردوس کے گرد اکٹھی ہو گئی تھیں۔ فردوس نے ان کو اپنے ہاتھ پکڑتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے کپڑوں کی شکنیں دور کر رہی تھی۔ وہ جوان سب میں سب سے بڑی تھی اس نے اپنے پیر ننگے کر کے اپنے جوتے فردوس کے پیروں میں پہنا دیے تھے۔

ریشمی نے پیلی روشنیوں کے بیچ اسے خود سے لگا لیا تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔

"ریشمی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"پگلی۔ ڈرتی کاہے کو ہے۔ آنکھ اٹھا کر دیکھ۔ تم نے کون سی چوری کی ہے۔"

''یہ مجھے دھکے دیں گے۔ مجھے ماریں گے۔''

''کوئی کچھ نہیں کرے گا جب تم خود ان کو اجازت نہیں دو گی۔ چل سر اٹھا کر دیکھ۔ فوٹو بنوا اچھی سی۔ ہنسی مسکراتی ہوئی اخباروں میں آئے گی ناں فوٹو۔''

فردوس گوہر نے ریشمی کو اس کا دوپٹا ٹھیک کرتے دیکھا تھا۔ زندگی میں کتنے اپنے اکٹھے کیے تھے۔ اور زندگی سارے اپنوں کا ننگ دھڑنگ سامنے لا کر خود تماشا دیکھ رہی تھی۔

امل چلتی ہوئی اس کی طرف آئی تھی۔

''میرے ساتھ چلو اب میں بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ یہ میری شناخت نہیں ہے گوہر، یہ شاید تمہاری ہے کہ تم اس سے پہچانی جاؤ۔''

ریشمی نے اس کے اب دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''یاد رکھنا گوہر۔ ہمارا سچ ہمیں کبھی نہیں گراتا۔ اپنے سچ کے ساتھ چلو گی تو منہ کے بل نہیں گرو گی۔''

وہ امل کے ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی۔ سیڑھیوں کے اسٹیپس پر ریشمی بالڑیوں کے ساتھ اب بھی کھڑی تھی۔

میک اپ روم میں آرٹسٹ نے اس کے اوپر کام شروع کر دیا تھا۔ وہ کسی بت کی طرح بیٹھی تھی۔ روبوٹ جیسے۔ کچھ بھی محسوس یہا تھا۔

جب ساری دنیا جان گئی ہے تو اور کس کا سامنا رہ جاتا ہے کہ جس سے خوف کھایا جائے۔ شیشے میں اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔

ہر نقش تراشا ہوا تھا۔ اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔

وہ امل کا ہاتھ پکڑے ریمپ پر نمودار ہوئی تھی۔ روشنیوں کے دائروں میں راج ہنس جیسی گردن تانے۔ سپاٹ تاثرات اور آنکھوں میں حزن کا سمندر چھپائے دنیا نے فردوس گوہر کی موجودگی کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

بیک گراؤنڈ میوزک کی بیٹ پر وہ امل جی کی شو ٹاپر تھی۔ کیمرے کا ہر کلک اس کے فوٹو جینک

چہرے کا کلوز اپ لے رہا تھا۔ سامنے کرسیوں پر ریشمی بالڑیوں سمیت تالیاں بجائے جاتی تھی۔

فردوس گوہر نے سلور ہیل کی نوک پر خود کو بہت اونچا پایا تھا۔ وہ اپنے سچ سمیت اکیلی کھڑی تھی۔ پورے اعتماد اور غرور کے ساتھ!

ہال میں سب کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ سیڑھیوں کی آخری قطار میں دیوار سے ٹیک لگائے نتاشا ابراہیم بھرے پرے ہجوم میں تنہا کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ شو تاریخ کا سب سے زیادہ ٹوئسٹ والا اور کامیاب شو تھا۔ بہت سے ادارے ہیومن رائٹس پہ جو کام کر رہے تھے وہ امل اور فردوس کی مدد کو آ گئے تھے۔

وہ روسٹرم پر کھڑی تھی۔ مائیک کو درست کرتی ہوئی۔ کچھ دیر بعد ہال اس کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ آج میرا دن ہے۔ چاہے ذلت ہو یا شہرت ہو۔ ایک وقت پر ایک ہی چیز سے واسطہ پڑے تو ٹھیک رہتا ہے انسان اس فیز سے نکل آتا ہے مگر میری بدقسمتی کہ میرا واسطہ ایک ہی وقت میں دونوں سے پڑا ہے۔ اور مجھے یہ دونوں راس نہیں ہیں۔ اس وقت مجھے اس اربوں کی آبادی رکھنے والی دنیا میں کسی کی پروا نہیں ہے۔ میں سچ کہتی ہوں کسی کی بھی نہیں۔ میں صرف اپنی ماں سے ملنے کو بے تاب ہوں کہ وہ کیا سوچتی ہو گی کہیں اس کا دل تکلیف میں نہ ہو۔ یہ ریمپ، یہ روشنیاں، یہ چکا چوند ایسے ہی نہیں مل جاتی۔ یہ سب سے پہلے آپ سے آپ کا سچ اگلواتی ہے۔ اس پر تماشا لگتا ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے آج میرا لگا ہے کل کسی اور کا لگے گا۔ لگتا رہے گا مگر مجھے معلوم ہے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے یہ دنیا بہت بڑی ہے اتنی بڑی کہ انسان گم ہو جائے۔ کبھی نہ ملنے کے لیے۔ ہمیشہ کے لیے مگر مجھے یہ سارے چہرے یاد رہیں گے۔ جن سے میں نے محبت کی۔ اور وہ جن سے میں چاہ کر نفرت بھی نہیں کر سکی..... کیونکہ نفرت میرا سچ نہیں ہے۔ آپ سب اپنے سچ سمیت سلامت رہیں.....''

اور پھر سب نے اسے وہاں سے الٹے پاؤں گم ہوتا ہوا پایا۔ بھیڑ میں۔ روشنیوں کے بیچ سے۔ جیسے وہ کہیں نہیں تھی..... جیسے وہ ہر جگہ تھی.....!

☆.....☆.....☆

جب پری چہروں پہ چھائی ہو فنا
تب فریب زندگی کا حسن ہوا لا
ہر شے جہان رنگ و گل کی خاص کر
کن کی مستی گونج میں ہر سمت ہوا لا

چیت کا موسم تھا اور دور تک ریت کے ٹیلوں پر چنے کے سرسبز کھیت دور دور تک دکھائی دیتے تھے۔ ہوائیں مشکبار تھیں اور موسم گرما کی بھی آمد آمد ہی تھی۔ اماں یونہی بے خیالی میں پھسکڑے مار کر بیٹھی ہوئی گاؤں کی عورتوں کو کوسے جاتی تھیں۔

"سنا ہے، کنیزاں شہر میں وڈی استانی بن گئی ہے۔"

وہ تب بھی چپ ہی رہی تھیں کہ کب سے بس وہ سنے ہی جاتی تھیں۔

"ارے بھئی، ایسی تعلیم کس کام جو ماں باپ کے فیصلوں سے ہی نافرمان کر دے۔"

ابا چوپال میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کہیں سے ذکر نکل ہی آتا تھا اور وہ جانتے تھے کہ باتوں باتوں میں انہی کو ہی سنایا جا رہا ہوگا۔

دنیا ایک جیسی ہے۔ لوگ بھی۔ باتیں بھی۔ باتوں کے نشتر بھالے بھی۔ درد بھی۔

بختاور سکندر کے ساتھ اکثر آ جاتی تھی اور ہادی کو دیکھ کر جیسے اماں ابا جی اٹھتے تھے۔ بختاور سارے صحن کو جھاڑو لگا کر چمکا دیتی تھی۔ کھگل اور ٹاہلی کے پتروں کو سمیٹ کر رکھتی۔ گھڑونچی پر برتن ٹانگتی۔ چولہے کی لپائی بھی کر جاتی تھی۔

"بس کر دے بختاور۔ کن کاموں میں لگی رہتی ہے؟" سکندر جیسے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہتا۔

"گھر میں بھی ہم باپ بیٹا کاموں کی نذر ہو جاتے ہیں۔"

"بس اماں! ان کی تو کبھی مجھ سے شکایتیں ہی ختم نہیں ہوں گی۔"

ابا مسکراتے ہوئے ہادی کو آسمان کی طرف اچھالتے اور ان تینوں کو بحث میں الجھا ہوا دیکھتے۔

"بس شروع ہو گئے یہ لوگ پھر سے۔"

چیت کی ہوا چلی تھی تو دھریک سے کئی جامنی پھول نیچے آ گرے تھے۔ اماں نے پھولوں کا گچھا اٹھا لیا تھا۔ یہی چیت کا موسم تو ہوتا تھا جب دھریک پھول دیتی تھی تو کنیزاں اس کے نیچے کھڑے ہو کر گہری سانسیں لیا کرتی تھی۔ کئی پھول بختاور اور اماں کے بالوں میں بھی ٹانک دیتی تھی۔

''میرا دل کرتا ہے دھریک کے پھولوں کی خوشبو کو کسی شیشے کی بوتل میں بند کر لوں۔''

''تمہارے سارے شوق ہی نرالے ہوتے ہیں۔''

''بھلا پھول بھی کسی کو برے لگ سکتے ہیں۔''

''خوشبو کو قید کرنے کی بات کرتی ہو تم۔''

''محسوس کرنے اور قید کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں قید خود بھی پسند نہیں کرتی اور کسی کو قید میں رکھنا بھی نہیں چاہتی۔''

بختاور کو اس بار کے موسم بہار میں وہ کھٹ سے یاد آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ قید میں رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔ تب ہی وہ اپنی شیشے کی بوتل توڑ کر نکل بھاگی تھی اور اپنے پیچھے خلا چھوڑ گئی تھی جو کہ بھرتا ہی نہیں تھا۔

''اماں! کنیزاں کو واپس بلا لیں۔'' بختاور نے جیسے منت کرتے ہوئے ماں کے گھٹنے پکڑے تھے۔

''کس منہ سے واپس آئے گی؟ تو اپنی چار دیواری میں رہتی ہے بختاور ے۔ ہم دونوں سے پوچھ جو چاروں پاسے سے ننگے ہو کے بیٹھے ہیں۔ کوئی بھی بات کر کے چلا جاتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے، سانس رندھ جاتی ہے۔''

اماں منہ میں دوپٹہ لے کر رونے لگی تھیں۔ ابا ہادی کو گود میں لیے بیٹھے کبھی کبھار ان دونوں کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔ سکندر چارپائیوں کی ادوائن کس رہا تھا۔

یونہی ابا کی نظر بختاور کے چہرے سے ہوتی ہوئی سکندر پر رکی اور پھر گود میں بیٹھے ہادی پر۔ جو بھی تھا ہر کوئی اپنی جگہ پر درست ہو گیا تھا۔ اگر کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ ایک ہی مثلث میں تھی۔ ابا، اماں اور کنیزاں.....!

ایک ہوک اٹھی تھی جس نے انہیں پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ آنکھیں جھرنا تھیں، بہے جاتی تھیں۔

دور جامعہ پنجاب کے کیمیا کے ڈپارٹمنٹ میں ری ایکشن کے فارمولوں پر بات کرتی ہوئی کنیزاں کو ایک دم چپ لگ گئی تھی۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔

''ایکسکیوزمی۔ آئی ہیوٹو گو۔''

اپنا لیدر بیگ اٹھاتی وہ باہر کوریڈور کی طرف گئی تھی۔ گزرتے ہوئے اسٹوڈنٹس کے سلام کے جواب تک دینے کا وقت بھی نہیں تھا۔ بہت سارے گلٹ اندر کہیں لوتھڑا بن رہے تھے۔

''ظلم کا ساتھ دینے والا بھی تو ظالم ہوتا ہے ناں عدن۔ مجھے اب خود سے شرم آتی ہے۔ تم سے بھی۔ ہم نے کیا کیا۔ فردوس گوہر کو ہم نے تمہاری عینک سے دیکھا۔ تم پہ اعتبار کیا۔ اب اسے ڈھونڈو کہ اس کے پاؤں پڑ سکیں۔''

مگر وہ کہیں گم ہو گئی تھی۔ وہ ڈھونڈتی رہ گئیں۔ کہیں سے کوئی سراغ ملے کوئی نونشانی ہو کہ وہ اس اپسرا کو کھوج لیں۔ مگر سارے رستے مسدود۔

اب کی بار خوشیاں اور سکون شیشے کی بوتل میں بند ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

''تمہارا اور تمہارے باپ کا ایک ہی مسئلہ ہے کہ بہت جلد باز ہونے کے ساتھ ساتھ درست فیصلہ لینے کی اہلیت سے بھی محروم ہو۔''

مام کسی پروفیشنل شیف کی طرح کٹنگ بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے سلاد کا ڈھیر کاٹ رہی تھیں۔ سبزیوں کا ڈھیر پڑا تھا جسے وہ نفاست سے مختلف شیپس میں کاٹ رہی تھیں۔

''مجھے خلیل پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔'' وہ ندامت اور پچھتاوے کے احساس تلے دبی ہوئی تھی۔

مام نے حیرت سے مڑ کر اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھا تھا۔

''عدن! تم ایسی کب سے ہو گئیں اتنی خودغرض۔''

ڈھیلے ڈھالے لانگ کرتے میں ملبوس وہ کچن کرسی پر جھول رہی تھی۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''تم ابھی بھی اپنا اور خلیل کا سوچ رہی ہو۔ صرف دو انسانوں کا۔ تم نے اس تیسرے انسان کی بات ہی نہیں کی جس کے دل کو تم دکھا چکی ہو۔ مجھے تم حیرت میں ڈال چکی ہو۔'' وہ اپنا ہاتھ روک چکی تھیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو آئینہ دکھایا تھا۔

''فردوس گوہر جس سے مل کر مجھے ہمیشہ اچھا لگا ہے وہ ایک پوزیٹو لڑکی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اس طرح اپنی کمی کے ساتھ زندگی جی رہا ہو۔ وہ تم لوگوں کی دوستی اور ساتھ کی محتاج تھی۔ اور تم کیا کہہ رہی ہو کہ اسے ہی زندہ درگور کر دیا۔ دوست دوستوں کے لیے قبر نہیں کھودتے۔ اب بھی تم خلیل اور اعتبار کا رونا رو رہی ہو تو تف ہے تم پر۔''

انہوں نے ہمیشہ اپنے شوہر کے منہ پر سچ دے مارا تھا آج انہوں نے اپنی بیٹی کے ساتھ بھی یہی کہا تھا۔

عدن جبار کو کسی نے چٹکیوں سے اٹھا کر حقیقت کے گدلے دلدل میں پھینکا تھا اور اسے اب پہلی بار وہ یاد آئی تھی۔ جس کے چہرے پر اس نے تھپڑ مارا تھا۔

جو بار بار ہاتھ جوڑ کر اپنا سچ سنانے کی بھیک مانگتی رہی تھی۔

انسان کو حقیقت کبھی کبھی نوچ لیتی ہے اور سارے خدوخال بگڑ جاتے ہیں۔ گو بھی پتے صاف کرتی ہوئی مام نے اسے واپس پلٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ عدن جبار نے اپنے اندر گلٹ زندہ ہوتا ہوا پایا تھا۔

''میں خائن نہیں ہوں عدن۔ میں پیرا سائیٹ نہیں ہوں۔''

فردوس گوہر نے کتنی بار کہا تھا۔ مام سچ کہتی تھیں کہ وہ لڑکی کتنی بہادر تھی جو معاشرے میں اپنی ایسی شناخت کے ساتھ زندہ بھی۔ جو مسلسل زندگی کی جنگ لڑ رہا ہو۔

تو.....!

خلیل اسی شام عدن جبار کے سامنے آیا تھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ کسی بت کی مانند بیٹھا رہ گیا تھا۔

''وہ ڈیڈ کی پیشنٹ تھی، ہماری جان پہچان ہوگئی تھی۔ پھر میں اسے تمہارے توسط سے ملا اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ فردوس کا سچ کیا تھا۔ وہ ڈپریشن کی مریضہ تھی۔

اسے دورے پڑتے تھے۔ میں نے اس کی فائل ہسٹری پڑھ لی تھی۔ پھر ہم ملنے لگے کیونکہ اسے ایک سامع کی ضرورت تھی۔ بس یہی ہمارا تعلق تھا عدن۔ اتنا سا کہ وہ سناتی تھی اور میں سن لیتا تھا۔'' خلیل نے عدن کے سامنے ساری کہانی بیان کر ڈالی تھی۔

وہ آئینوں میں اپنا شکستہ عکس دیکھنے کا دن تھا۔ اور ہر شیشے میں وہ خود ٹوٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر کنیز فاطمہ کی طرف آئی تھی۔ جہاں اس نے سرخاب خان کو موجود پایا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھار ادھر آنکلتا تھا۔

ہر انسان کے پاس اپنے اپنے گلٹ ہوتے ہیں۔ پھر سب گلٹی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ سانجھے ہو جاتے ہیں۔

سرخاب خان سرخ آنکھیں لیے ہمیشہ ایک جملہ دہرایا کرتا تھا۔

''میں نے سیرت کو بہت دکھ دیا۔''

''انسان بس سبب بن جاتے ہیں۔ بہت سی چیزوں کا۔ اگر تم اس کی موت کے لیے خود کو قصور وار سمجھتے ہو تو غلط سمجھتے ہو۔ موت کا قصور صرف موت بذات خود ہوتی ہے۔''

وہ سیرت کی ڈائری سامنے رکھ دیتا تھا۔ عدن اس کی آنکھوں میں سیرت امتیاز کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔

وہ تم سے بہت متاثر تھی اسے تمہارے چہرے کے نقوش ازبر تھے۔ وہ لڑکی جب پہلی بار ملی تھی تو اس نے ہم سب کو پہلی نظر کی محبت پر ایک لطیفہ سنایا تھا اور ہم سب خوب ہنسے تھے قہقہے مار مار کر۔ بعد میں وہ اسی لطیفے کا شکار ہوگئی۔''

عدن نے آنکھوں کے پانی کو اندر دھکیلا تھا۔ سیرت کی یاد بھی پانچواں موسم تھی۔ ادھر تنگ گلیوں کے رستوں سے ہوتا ہوا سرخاب خان قبرستان جا پہنچتا تھا۔ جہاں پوپلی بوا سفید گلابوں کے ساتھ بیٹھی

ہوتی تھیں۔

''اسے سفید گلاب بہت پسند تھے۔ سارے جگ سے نرالی اور وکھری۔''

امتیاز صاحب بھی دن میں کئی چکر لگا لیتے تھے۔ جانے کتنی چٹھیاں اور سندیسے ہوا برد ہو گئے تھے۔ پتا نہیں باپ بیٹی کے درمیان کیا کیا حائل رہا تھا۔ پوپلی بوا سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔

سیرت بھی کبھی قبرستان چلی آتی تو بس کھڑے کھڑے قبر کی مٹی کو دیکھے جاتی کہ اب کوئی لڑائی جھگڑے نہیں ہونے والے تھے۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا بہت کچھ سمیت.....!

وہیں اس نے سرخاب خان کو پایا تھا۔

''کون ہو تم؟'' وہ ٹھٹکی تھی۔ چونک گئی تھی۔ سامنے کھڑا وہ رف حلیے والا شخص کوئی خاص لگتا تھا۔

وہ سفید گلابوں کا بکے بھربھری مٹی پر رکھ کر مڑا تھا۔ جاتے جاتے پلٹا اور اداسی سے ہنسا تھا۔

''ایک دوست کچا پکا سا۔ جسے سیرت امتیاز نے لمحوں کے حوالے کر دیا۔''

سارا قبرستان رابیل کے پھولوں سے مہکتا رہا۔ وہ گھر واپس پلٹتا تھا تو درنجف اس کے وجود کی تھکن بھانپ لیتی تھی۔

''کوئی بات نہیں وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تم کیسے اتنا مثبت سوچ لیتی ہو؟''

''جب سوچنا ہی ہے تو پھر اچھا سوچنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

آدھی رات کو وہ بخار سے پھنک رہا ہوتا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتے ہوئے اپنے مجازی خدا کو دیکھے جاتی تھی۔

''درنجف..... تمہارے دیار کے کتنے پیڑ باقی ہیں؟''

''میں نے اب گنتی کرنے چھوڑ دیے ہیں خان۔''

''آؤ دوبارہ شروع کرتے ہیں۔''

وہ ہولے سے مسکرا دیتی تھی۔ درنجف پہاڑوں کی سمجھ دار دوشیزہ تھی۔

''خان..... میں تم سے راضی ہوں۔ مجھے خوش رکھنے کی زبردستی کوشش مت کرو۔ اپنے دل کو اس وقت اپنے ہاتھ میں رکھو۔ کسی طمع کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا دکھ ہے اس کو خود پر سے گزرنے دو۔ بس اتنا کرو کہ مجھے ساتھ رکھو۔''

☆.....☆.....☆

شہر عجائبات کی ہر شے عجب
گمشدہ ہے روح اور ہر جسم ہوا لا
اختتام زندگی کی شرط تھی
تمام ہو ہر عشق اور ہر انس ہوا لا
رب شناس لوگ دیوانے نہیں
بس جمال پردہ ور سے ضبط ہوا لا
شام کی لالی میں ہے ایسا فسوں
جیسے روز حشر ہو اور بست ہوا لا

نتاشا نے اسے دیوانہ وار اس بڑھتے ہوئے ہجوم میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر وہ جیسے کہیں اچانک ہی گم ہوگئی تھی۔ نتاشا کو لوگوں کی بھیڑ میں کئی دھکے لگے تھے۔ یہاں تک کہ پیر تک کچلے گئے تھے مگر یہ تو کوئی تکلیف ہی نہیں تھی جو فردوس گوہر نے برداشت کی ہوگی۔ اسے دل کا روگ بھول گیا تھا۔ یہ بھی کہ موسیٰ نے فریب جال پھینکا تھا اسے تو بس بار بار وہی یاد آتی تھی جو زندگی کی ہر مشکل میں اس کے ساتھ آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

''کیوں پریشان ہوتی ہو نتاشا، دنیا کے مسئلے میں دنیا میں ہی ختم ہو جائیں گے۔ وقت پر کوئی سیکھتا ہے نیلم بھی سدھر جائے گی۔''

نیلم کی طرف سے ملنے والی ہر پریشانی کو وہ چن لیتی تھی اب آ کر راز کھلا تھا کہ ہم جو دنیا کے سامنے خیر بانٹتے ہوئے نظر آتے ہیں ہمارے اپنے کھوا ندر شر کے ڈیرے ہوتے ہیں۔

وہ میلے کی گونج جیسی گھر آئی تھی۔ اندرون لاہور کی تنگ گلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ وہ کچی پکی تنگ گلیاں، دروازوں پر بیٹھی ہوئیں عورتیں، سبزیوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں، پان کی پیک سے بھری سڑکیں وہ غائب دماغی سے چل رہی تھی۔

گھر پہنچتے ہی اس کے ڈھیلے حال کو نیلم نے نوٹ کیا تھا۔

''کیا ہوا نتاشا؟''

''سب ختم ہوگ مجھ سے۔''

باجی کڑھی کا بیسن کھولتے ہوئے کچن سے ویسے ہی باہر آ گئی تھیں۔

''کیا ختم ہوگیا نتاشا؟''

وہ بس نیلم کی گود میں سر رکھے لیٹ گئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہنے لگے تھے۔

''اتنے عرصے میں اس نے کبھی بھی میرے لیے کوئی بے یقینی نہیں دکھائی ہمیشہ ہی میرا اعتبار کیا۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنا قطب نما کہتی رہی۔ مگر میں نے اسے سیدھا رستہ ہی نہیں دکھایا بلکہ اس کی منزل ہی کم کر دی۔ میری وجہ سے فردوس گوہر بھٹک گئی۔''

وہ دونوں اس کی باتیں سن کر سناٹے میں آ گئیں۔ وہ صرف اتنا جاننا چاہتی تھیں کہ ہوا کیا تھا۔ ہونے کو جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا تھا۔ سارا سوشل میڈیا فردوس گوہر کی تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔

نتاشا ابراہیم کو وہ ٹوٹی بکھری گوہر یاد آئی تھی۔ جو اپنے دوستوں کی بے رخی کا نوحہ لے کر آئی تھی۔

''نتاشا۔ انہوں نے مجھے مارا۔ مجھے اتنے لوگوں میں ذلیل کیا اور میرے سر ایک ایسا الزام منڈھا جو میرے لیے کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے الزام تو مکمل انسانوں کے سر جاتے ہیں۔ مجھ آدھی ادھوری میں اتنی سکت نہیں۔ میں خیانت کرنے والے کہاں سے لگتی ہوں؟ دنیا پھر سے بری لگنے لگی ہے۔ اعتبار کو پھر سے موت آنے لگی ہے۔''

بہت وقت لگا تھا اسے سنبھلنے میں۔ مام نے بتایا تھا کہ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے اور چیخنے لگتی تھی۔ امل کے ملنے سے وہ بہت زیادہ خوش تھی۔

''دیکھنا نتاشا، میری اپنی ایک شناخت ہوگی۔ لوگ مجھے سنیں گے۔ مجھے ویلیو دیں گے۔ اور پھر میں اس مقام پر پہنچ کر اپنے جیسوں کی مدد کر سکوں گی کہ زندگی ہر چیز سے بڑی ہوتی ہے کسی بھی صدمے اور نقصان سے۔ ہر چیز سے۔''

اب زندگی کے لیے شاید نظریہ بدل گیا تھا۔ سر سے آسمان ہی اڑ گیا تھا خلاؤں کے دبیز سناٹے تھے۔

وقت کے ہاتھ میں صرف گزرنا تھا۔ اور وقت گزر گیا تھا۔ ہر چیز پر ریت ڈالے۔ تمام گلٹ سمیت..... تمام خساروں سمیت۔ بس ایک تلاش تھی کہ ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔

شہرِ لاہور میں وہ تینوں بس ایک انسان کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ وہ تینوں کنیز، عدن اور نتاشا۔ جسے ڈھونڈتی تھیں وہ روپوش ہوگئی تھی۔ دھند میں گم.....!

☆.....☆.....☆

تمکین جمال نے عدن جبار کو کال کی تھی۔ بادل چاروں طرف سے پورے آسمان کو لپیٹ میں لے چکے تھے۔

''ہم نے اس کے ساتھ بہت برا کیا عدن۔''

''مجھے اب احساس ہو رہا ہے میں نے سب سے زیادہ تکلیف دی اسے۔'' عدن کے کمرے کی کھڑکیوں کے پار بادلوں نے رنگ بدلا تھا۔ گھور سیاہ۔

''تم اور کنیز اس کے گھر گئی تھیں کیا؟''

''ہاں ہم دونوں گئی تھیں ملازموں نے کہا کہ وہ اب یہاں نہیں رہتی۔ اس کی فیملی کا کوئی اور فرد بھی نہیں ملا۔''

''انسان چڑیا کی طرح تنکا تنکا کر کے عزت بناتا ہے اور لمحوں میں سب ختم ہو جاتا ہے۔ شاید اس چیز کا منظرِ عام پر آنا اس کی فیملی کے لیے بھی بہت بڑا دھچکا تھا جانے کیسے سنبھلے ہوں گے۔''

عدن نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔

تمکین ارسلان کے ساتھ جمال ابا کی طرف آ گئی تھی۔ نیم کی نمکولیوں کی چڑیاں ٹونگتی تھیں۔ وہ

اپنے شوہر کو ابا سے کسی دوست کی طرح گپ شپ لگاتے دیکھتی رہی تھی۔

"ہم لڑکیاں خوابوں کو ہی حقیقت کیوں سمجھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ حقیقتیں بھی تو ہر بار تلخ نہیں ہوتیں۔"

ایک لمحے میں وہ شخص اس کے دل کے سب سے اونچے مقام پر تھا۔

"بات یہ نہیں ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم کیسے کرتے ہیں۔ رشتوں اور کاروبار میں صرف حلال دیکھا جاتا ہے۔ حلال سے بڑھ کر کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ کبھی نہیں ہوتا۔ رہی بات دل کی تو دنیا کے کئی رنگ چڑھ جاتے ہیں۔ بہکاوے میں آجاتا ہے۔"

وہ فصیلوں کو جھاڑ کر جالے اتارتی رہی تھی۔ وہی گھر جہاں زندگی گزری تھی۔ شادی کے بعد سب پرایا پرایا لگنے لگا تھا۔

ایک بھوری مکڑی پر تمکین کا آنسو گرا تھا اور وہ سہم کر دیوار کے کونے میں کھسک گئی تھی۔

"یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں ابا، کہ آپ نے ہمیشہ مجھے حلال کھلایا۔ حلال کمایا۔ بھلا الائچی کے کھیت، بادیان کے پھول، اور جائفل بھی نفرت کے لائق ہوتے ہیں؟ نہیں کبھی بھی نہیں۔"

کامیابیاں، میڈل، جیت، فتح دنیا کے ہر پیمانے پر حلال بھاری ہوتا ہے.....!

تمکین جمال نے وہ راز پالیا تھا.....!

☆.....☆.....☆

پروفیسر کنیزاں فاطمہ نے پنجاب یونیورسٹی کے کیمیا ڈپارٹمنٹ میں ابھرتے ہوئے شاعر علیم ارحم کی شاعری کی کتاب مکمل کر کے کنارے پر رکھی تھی۔

"سچ ہی تو کہا ہے شاعر نے کہ زندگی بے ثباتیوں کی علامت ہے۔ ایک مسلسل جنگ سے جوجھنا پڑتی ہے اور ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ مال غنیمت میں ہمارے پاس صرف ہم ہی بچتے ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے۔ پیوند زدہ..... جزو کو کل سمجھنے والے۔ سب فنا ہے۔ یہ دیواریں، یہ راستے، یہ تعلق سب ختم ہو جائیں گے ہم سب سمیت۔"

علیم ارحم کی شاعری کی کتاب کے سرورق پر تتلیوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیتا تھا جن کے پنکھ جھڑ

چکے تھے۔ وہ بھی انسانوں جیسی ہوگئی تھیں۔ پیوندزدہ.....!

☆.....☆.....☆

ہر طرف چیت کا موسم ہے، پنجاب یونیورسٹی کی شاہراؤں پر نئے چہرے ہیں نئے خوابوں سمیت۔ کچنار کے درختوں پر پھول کھل چکے ہیں۔

وہی سرمئی سڑکیں ہیں جو قہقہوں سے گونجتی ہیں۔ کئی رنگ برنگے آنچل اٹکھیلیاں کرتے گزر جاتے ہیں۔ ہاسٹل روڈ کی رونقیں ویسے کی ویسی ہی برقرار ہیں۔

بس ایک تبدیلی ہوئی ہے کہ کردار بدل گئے ہیں۔

کوئی چہرہ سیرت امتیاز کا چہرہ نہیں۔

کسی شرارت کے پیچھے تمکین جمال کا ہاتھ نہیں۔

کسی خوب صورت ہنسی میں فردوس گوہر نہیں۔

ناز و انداز کے روپ میں کوئی روپ عدن جبار کا نہیں۔

بس ایک پروفیسر کنیز فاطمہ ہے جو آج ہی کی دوپہر ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوگئی تھی۔ یونہی لیب میں پڑے سارے محلولوں سے کھٹی لسی کی مہک آنے لگی تھی۔ گاگروں میں چھلکتا ہوا چھاچھ..... لیب کی دیواریں کھگل اور شرینہہ کی چوٹیاں بن گئی ہیں۔

وہ ٹھٹک گئی تھی۔ آس پاس تھل زندہ ہوگیا تھا۔

بس یہی انقلاب ہوتا ہے اچانک ہی زندگی کے کسی لمحے پر قابض ہوجاتا ہے۔ تھل واسی کنیزاں بھی اسی انقلاب کی زد میں آگئی تھی۔

اسٹوڈنٹس نے اپنے فیورٹ پروفیسر کو کوریڈورز سے دیوانہ وار بھاگتے دیکھا تھا۔ چہرے پر ہنسی تھی اور وہ اپنے بال کانوں کے پیچھے اڑستی جاتی تھی۔

تمکین جمال نے چاولوں میں لونگ شامل کرتے ہوئے کنیزاں کا فون سنا تھا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا تمکین۔ سب بکھیڑے ہیں۔ سب سراب۔ زندگی میں اصل چیز تو فیصلے

ہوتے ہیں۔ ذات کا مقید ہونا ہے کہ بس ایک ایسی چھتری تان لو کہ سب جمع ہو جائیں۔ تم دیکھنا تمکین میں اپنے تھل کو کیا سے کیا بنا دوں گی۔"

دور دھریک کے نیچے بیٹھے ہوئے اماں سرسوں کے تیل کو بوتلوں میں بند کرتے چونک گئی تھیں۔

دروازے کے بیچوں بیچ ہنستی مسکراتی اپنے سامان سمیت کھڑی وہ کنیزاں فاطمہ تھی۔

ابا کھل بنولے کے ڈھیر جدا کرتے پتھر ہو گئے۔ یہ چہرہ تو وہی چہرہ تھا۔ یہ رنگ بھی وہی رنگ تھا۔

کنیزاں فاطمہ کے پورے وجود سے تھل ابل رہا تھا۔

وہ آگے بڑھ کر اماں کے گلے لگ چکی تھی۔ اماں کچھ بھی نہیں کر سکی تھیں اتنا کہ بس دل سے لگا لیا۔

"بھاڑ میں جائے دنیا۔ زمانے والے۔ کنیزاں نے کون سے قتل کیے ہیں۔ دنیا تو کہتی رہتی ہے۔"

ماں تھیں اور جان گئی تھیں کہ سامنے والی بھی جنگ لڑ کر آئی ہے۔ ابا نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اور بس مسکرا دیے تھے۔

"جہاں کا بیج ہو وہیں پھلتا پھولتا ہے۔"

☆.....☆.....☆

کیمرے روشنیوں کی چکا چوند میں فردوس گوہر نے اپنے کیمرے کو کنفرم کرنے کے بعد بولنا شروع کیا تھا۔

"ہم زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ بس صرف جیتنا چاہتے ہیں۔ چیزوں سے، رشتوں سے اور ہاں دوستوں سے بھی (آنکھ سے آنسو جھٹکتی ہے) مگر انسان کسی بھی ایک فیز سے گزر کر دوسرے تک نہیں پہنچ پاتا۔ ہم گزرے وقت کو بہت کوسنے دیتے ہیں۔ ملامت کرتے ہیں۔ مگر سچ کہوں تو کچھ بھی بے سبب نہیں ہوتا۔ یوں ہی ہونا ہوتا ہے۔ آج میں ایک کامیاب فیشن ماڈل، بیوٹیشن اور سوشل ورکر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہوں۔ بہت سے تمغے۔ بہت سی فتوزحات۔ دیکھنے والوں کو یہ زندگی بہت چارمنگ لگتی ہے۔ مگر ہر کسی کے پاس اپنے سچ ہوتے ہیں۔ کچھ جھوٹ بھی ہوتے ہیں۔ مجھے کسی نے کہا تھا کہ سچ کبھی تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ انہوں نے سچ کہا تھا۔ غلطی میری ہی تھی کہ

میں نے اپنے سچ کو خوف کے پردے میں چھپایا۔اس میں کسی کا قصور نہیں۔"

ٹشو باکس سے ٹشو کھینچ کر آنکھوں کے جھرنے صاف کرتی ہوئی گوہر کو کئی نظریں دیکھتی تھیں۔ ٹکٹکی باندھ کر۔آنکھیں جوڑ کر۔

"زندگی میں سب سے زیادہ کس چیز کی کمی محسوس کرتی ہیں؟" اینکر نے وہ اہم سوال پوچھا تھا۔ انٹرویو ختم ہونے والا تھا اور یہ آخری سوال تھا پھر سیٹ تاریکی میں ڈوب جانا تھا۔

وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"صرف دوستوں کی۔" وہ حزن وملال کی شاعری جیسا لہجہ فضا کو سوگوار بنا گیا تھا۔

"کسی خاص کے لیے کوئی پیغام؟"

وہ اب اپنا دوپٹا سمیٹ کر ہیل کی نوک پر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ماسٹر شاٹ میں وہ اینکر کے ساتھ کھڑی تھی۔

"میں تم سب کو معاف کرتی ہوں۔میں تم سب کو یاد کرتی ہوں۔"

اینکر چونک گئی تھی۔ہر دیکھنے والا ٹھٹک گیا تھا۔

"آپ کن کی بات کر رہی ہیں؟"

"کچھ راز ہمارے پاس امانت ہوتے ہیں۔اور امانتوں میں خیانت میں نے کبھی نہیں کی۔"

یہ کہہ کر وہ خوشبوؤں میں بھیگی اپسرا اسکرین سے آؤٹ ہوگئی تھی۔

اسے ادھوری بات کر کے پورے مطالب سمجھانا آ گیا تھا۔بس واپسی پر کوئی فردوس گوہر کی آنکھوں کے آنسو کوئی نہیں دیکھ سکا تھا۔

عدن جبار کی موبائل اسکرین تاریکی میں ڈوب گئی تھی مگر پہلی بار تاریکی بری نہیں لگی تھی۔تو یہ طے تھا کہ وہ زندگی میں بہت آگے جا چکی تھی اور یہ بھی کہ جلد وہ اسے کھوج نکالیں گی۔اور دوستوں کے پیر پڑ کر بھی منایا جاتا ہے۔گھٹنے تک ٹیک دیئے جاتے ہیں۔اور معاف بھی کر دیا جاتا ہے۔ایک آنسو گرتا ہے آنکھ کے چھپر سے اور بس.....!

تھل کے اونچے ٹیلے پر کنیزاں فاطمہ تختہ سیاہ لگائے اپنے طالب علموں کی قطاریں ٹھیک کروا رہی تھی۔ چنے کے کھیت ٹیلوں کی گہرائی میں تھے اور اس کا کمرا جماعت ٹیلوں کی چوٹیاں تھیں۔

اس نے اپنا پہلا سبق سنانا شروع کر دیا تھا۔

اونٹوں کی ٹلیاں گونج رہی تھیں۔

کچھ بھی کچھ نہیں ہوتا۔ زندگی، مقصد اور دوست سب کچھ ہوتے ہیں۔

یہی کہانی تھی جو مجھے آپ سب کو سنانی تھی۔

سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اندر ایک چیز ہمیشہ رہ جاتی ہے۔ ''لا'' نفی کا کلمہ..... نہیں۔

انسان سب کچھ دسترس میں لینے کو بھاگتا ہے مگر ملتا وہی ہے جو اوپر والا فیصلے کرتا ہے۔!

❁ ❁

ختم شد

نایاب جیلانی کا بہت خوبصورت نیا ناول

سلسبیل

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

صوفیہ بٹ کا بہت خوبصورت نیا ناول

احد

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com